مالک رام
ذکرِ غالب
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

ذکرِ غالب

مالک رام

(پوری نظرثانی اور اضافے کے ساتھ)

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

دیباچہ طبع اوّل

ارباب نظر کے ایک چھوٹے سے حلقے میں تو غالب اپنی زندگی ہی میں مقبول ہو چکے تھے، لیکن جسے قبولِ عام کہتے ہیں، وہ ان کو ایک مدت تک حاصل نہیں ہوا۔ ان کے کلام کی صحیح قدر لوگوں کو اس وقت معلوم ہوئی، جب مولانا حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری لکھ کر اپنے ہم عصروں کے مذاقِ شعر کو نتھارا اور "یادگارِ غالب" لکھ کر یہ ثابت کیا کہ اس نتھرے ہوئے مذاق کی تسکین غالب کے کلام سے بہ خوبی ہو سکتی ہے۔ انگریزی دانوں میں غالب کا چرچا زیادہ تر عبدالرحمٰن بجنوری کے مقدمے اور دیوانِ غالب کے برلن ایڈیشن اور چغتائی ایڈیشن کی بدولت ہوا۔ پچھلی چوتھائی صدی میں اقبال کی شہرت اور مقبولیت نے پچھلے شاعروں کے نقش کو اگر مٹایا نہیں، تو مدھم ضرور کر دیا، لیکن غالب کا نقش اتنا گہرا اور روشن تھا کہ اس کی آب و تاب میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔

غالب کی عظمت کی ایک بڑی نشانی یہ بھی ہے کہ جتنی اچھی اور اونچے درجے کی کتابیں ان کی زندگی اور شاعری پر لکھی گئیں، اتنی کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئیں۔ حالی کی "یادگارِ غالب" سے جو سلسلہ شروع ہوا تھا، وہ برابر جاری رہا۔ اس کی وہ کڑیاں جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ غلام رسول مہر صاحب کی "غالب"، محمد اکرام صاحب کی معرکے کی تصنیف "غالب نامہ" اور

مالک رام کی "ذکرِ غالب" ہیں۔ جس کا نیا ایڈیشن مکتبہ جامعہ لمیٹڈ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ یہ اس تمام تحقیقات کا نچوڑ ہے جو اب تک غالب کی سیرت کے متعلق ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں مالک رام صاحب نے نئے ماخذوں کو کھنگال کر نئی معلومات فراہم کی ہیں، جو کہیں اور نہیں ملتیں۔ پہلے ایڈیشن بھی اس لحاظ سے کچھ کم امتیاز نہیں رکھتے تھے اور موجودہ ایڈیشن میں تو ایسے مفید اضافے ہوئے ہیں کہ اہلِ ذوق کی نظر میں کتاب کی قدر و قیمت اور بڑھ گئی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس پُر آشوب زمانے میں بھی جو علم و ادب کی کساد بازاری کا دور ہے، ذکرِ غالب ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دلی

(ڈاکٹر) سید عابد حسین

عرضِ مؤلّف

میری یہ کتاب محض حسنِ اتفاق سے عالمِ وجود میں آگئی۔ ۱۹۳۶ء میں مجھے "سبدِ چین" دیکھنے کا شوق چرّایا۔ حال آں کہ مطبوعہ چیز تھی، پوری کوشش کے باوجود کہیں سے دستیاب نہ ہوئی۔ بارے کئی اصحاب کے ساتھ مہینوں کی خط و کتابت کے بعد بالآخر مجھے کتابخانۂ حبیب گنج میں اس کا سراغ ملا۔ میرے شوق کو دیکھتے ہوئے نواب صدر یار جنگ مرحوم نے اس کی نقل مہیّا کر دی۔ چونکہ اس کا نسخہ اتنا نادر تھا، مجھے خیال ہوا کہ اسے شائع کر دینا چاہیے۔ میں نے اس کا ذکر حامد علی خان مرحوم، جنرل منیجر مکتبۂ جامعہ سے کیا۔ وہ فوراً اس پر تیار ہو گئے۔ غرض میں نے اسے صاف کر کے، اور ساتھ میرزا کے کچھ اور منتشر کلام کا اضافہ کر کے مسوّدہ ان کے حوالے کر دیا۔ چند دن بعد وہ آئے، اور کہا کہ لے دے کے ۸۰ صفحات ہوئے ہیں۔ یہ کتاب بہت پتلی ہے؛ آپ اس پر ایک مبسوط دیباچہ لکھ دیجیے کہ ضخامت کچھ تو زیادہ ہو جائے۔ میں اس کے لیے تیّار نہیں تھا۔ بہر حال کچھ حیص بیص کے بعد میں نے ہامی بھر لی۔
یہ ۱۹۳۷۔۱۹۳۸ء کے جاڑوں کی بات ہے۔ ان دنوں مکتبۂ جامعہ کا دفتر قرول باغ (دلّی) میں تھا۔ میں دن بھر دفتر میں رہتا، شام کو واپس آتا، اور شب کے کھانے کے بعد یہ دیباچہ لکھتا۔ اگلی صبح میرے دفتر جانے سے پہلے حامد علی خان صاحب بلاناغہ آتے اور یہ مسوّدہ مجھ سے لے جاتے۔

میں اس خیال میں رہا کہ وہ مضمون لینے اس لیے آجاتے ہیں کہ کہیں میں سہل انگاری سے کام نہ لینے لگوں۔ قصہ کوتاہ، یوں پانچ پانچ، چار چار صفحے روزانہ لکھے گئے، اور کوئی مہینے بھر میں مضمون مکمل ہوا۔

آخری قسط لے جانے کے دو چار دن بعد مرحوم آئے اور کہا کہ بھائی، مزید غور کرنے پر آخر یہی طے ہوا ہے کہ "سبد چین" الگ سے چھاپی جائے اور آپ کا دیباچہ مستقل کتاب کی شکل میں الگ۔ اب بتائیے، اس کا نام کیا رکھا جائے؟ اتفاق سے "ذکرِ میر" سامنے میز پر رکھی تھی۔ میں نے اسے دیکھ کر معاً جواب دیا: ذکرِ غالب۔ حامد علی خان صاحب نے بھی اس نام پر صاد کر دیا۔

اب میں نے ان سے مسوّدہ طلب کیا، تاکہ اس پر نظر ثانی کر سکوں۔ کہنے لگے: اس کی تو کتابت بھی ہو چکی ہے۔ پورا مضمون ۱۰۲ صفحے میں آیا ہے۔ اب اسے کیا دیکھیے گا! ان شاء اللہ چند دن میں چھپی ہوئی کتاب پیش کر دوں گا۔ یوں اس کتاب کا پہلا ایڈیشن اوائلِ اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔

یہ میری پہلی کتاب تھی۔ ان ۳۷ برس میں رطب و یابس، بہت کچھ لکھا اور شائع کیا ہے، لیکن خدا شاہد ہے کہ جو خوشی اس مختصر کتاب کے دیکھنے سے ہوئی تھی، وہ پھر نصیب نہ ہوئی۔

کوئی سوانح نگار بھی اپنے موضوع سے دلچسپی اور ہمدردی، بلکہ محبت سے بری نہیں ہوتا۔ یہ بشریت کا تقاضا ہے، اور اسی لیے اس پر اعتراض بھی نہیں ہو سکتا۔ اعتراض کی بات جب ہو گی، اگر اس میں مبالغے اور غلو کا پہلو پیدا ہو جائے۔ اس وقت مصنّف کو صاحبِ سوانح کا ہر قول پسندیدہ اور اس کا ہر فعل قابلِ تعریف نظر آتا ہے، جس سے وہ بسا اوقات سیاہ کو سفید ثابت کرنے کے درپے ہو جاتا ہے۔ الحمد للہ کہ میرزا کے یہ

حالات لکھتے وقت میں افراط و تفریط، دونوں سے مجتنب رہا ہوں۔ میں نے حالات کے مطالعے سے بیشتر کوئی نظریہ قائم ہی نہیں کیا، جسے بعد کو، واقعات کو توڑ مروڑ کر، صحیح ثابت کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ میں نے حالات پوری دیانت داری سے جوں کے توں بیان کر دیے ہیں۔ بسا اوقات میں نے دانستہ ان سے خود کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے بھی گریز کیا ہے، اور اسے قاری کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔ اگر شاذ و نادر کہیں کسی خیال کی تردید کی ہے، تو وہ بھی اس لیے کہ واقعتاً میرے نزدیک وہ نکتۂ نگاہ درست نہیں تھا۔

جیسا کہ عرض کیا، میں نے یہ مضمون "سبدِ چین" کے دیباچے کے طور پر لکھا تھا۔ اسی لیے اس میں میرزا کی زندگی اور تصنیفات کے بیان پر اکتفا کی، اور کلام پر نقد و تبصرہ سے اجتناب کیا۔ ایک تو اس لیے کہ حالی سے لے کر ہمارے زمانے تک کے متعدد شارحین اور ناقدین میرزا کے کلام کا جائزہ لے چکے تھے۔ دوسرے، اس مضمون کو دیباچے کی حدود سے تجاوز کر کے کسی بحث مباحثے یا مناقشے کا میدان نہیں بنانا چاہتا تھا۔ یہی اصول بعد کے ایڈیشنوں میں بھی میرے سامنے رہا ہے۔ حال آں کہ اس میں وقتاً فوقتاً جو اضافے ہوئے ہیں، اس سے کتاب کی ضخامت چوگنی ہو گئی، لیکن کتاب سوانح و سیرت کے دائرے سے باہر نہیں گئی۔

اگرچہ حالات کے جمع کرنے اور انھیں مناسب طریقے اور ترتیب سے پیش کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی گئی، لیکن کسی انسانی کام کے بارے میں بھی حرفِ آخر ہونے کا دعویٰ کون کر سکتا ہے! لہٰذا اس تمام احتیاط کے باوجود، یہ کتاب بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

میں نے آج تک اس کے ساتھ کوئی مقدمہ وغیرہ نہیں لکھا تھا۔ اس نئے ایڈیشن کے لیے میں نے بوجوہ مناسب خیال کیا کہ اس کے آغاز کی

داستان بیان کر دوں، تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ کیسے وجود میں آئی۔ یہ اس کتاب کا پانچواں ایڈیشن ہے۔ اردو میں کسی کتاب کا اتنی مرتبہ چھپ جانا، اس کی مقبولیت کی دلیل قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ میرے سفرِ تصنیف و تالیف کا نقطۂ آغاز تھا۔ معلوم نہیں، مشیئتِ خداوندی میں اس کی تکمیل کس شکل میں مقدّر ہے۔ اس اثنا میں خدا نے، محض اپنے فضل و کرم سے، شہرت بھی عطا فرمائی اور ہر طرح کی عزّت بھی ——— اور دونوں میرے استحقاق سے زیادہ۔ اس کے لیے میرا سر بارگاہِ ایزدی میں جھکتا ہے۔ میں نے آج تک جو کچھ بھی لکھا، بفضلہٖ اس میں کسی قسم کی نفسانیت کا دخل نہیں رہا۔ جن اصحاب نے اس کی تحسین و تعریف کی ہے، ان کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے۔

نئی دلّی

یکم دسمبر ۱۹۷۵ء — مالک رام

فہرست

دوسرا باب : تصنیفات (۱۴۳-۱۸۸)

(الف) فارسی

(ب) اردو

(ج) قاطع برہان کا مباحثہ

(د) لطائفِ غیبی کا مصنّف

تیسرا باب : عادات و اخلاق (۱۸۹ - ۲۵۶)

قطعہ

غالب! از خاکِ پاکِ تورانیم
لاجرم در نسب فرہ مندیم

ترک زادیم و در نژاد ہمی
بسترگانِ قوم پیوندیم

ایبکیم، از جماعۂ اتراک
در تمامی، ز ماہ دہ چندیم

فنِ آبائے ما، کشاورزیست
مرزبان زادۂ سمرقندیم

ور ز معنی سخن گزاردۂ
خود چہ گوییم، تا چہ و چندیم

فیضِ حق را کمینہ شاگردیم
عقلِ کل را بہینہ فرزندیم

ہم بتابش، ببرق ہم نفسیم
ہم بہ بخشش، بہ ابر مانندیم

بتلاشیکہ ہست، فیروزیم
بمعاشیکہ نیست، خرسندیم

ہمہ بر خویشتن، ہمی گرییم
ہمہ بر روزگار، می خندیم

پہلا باب
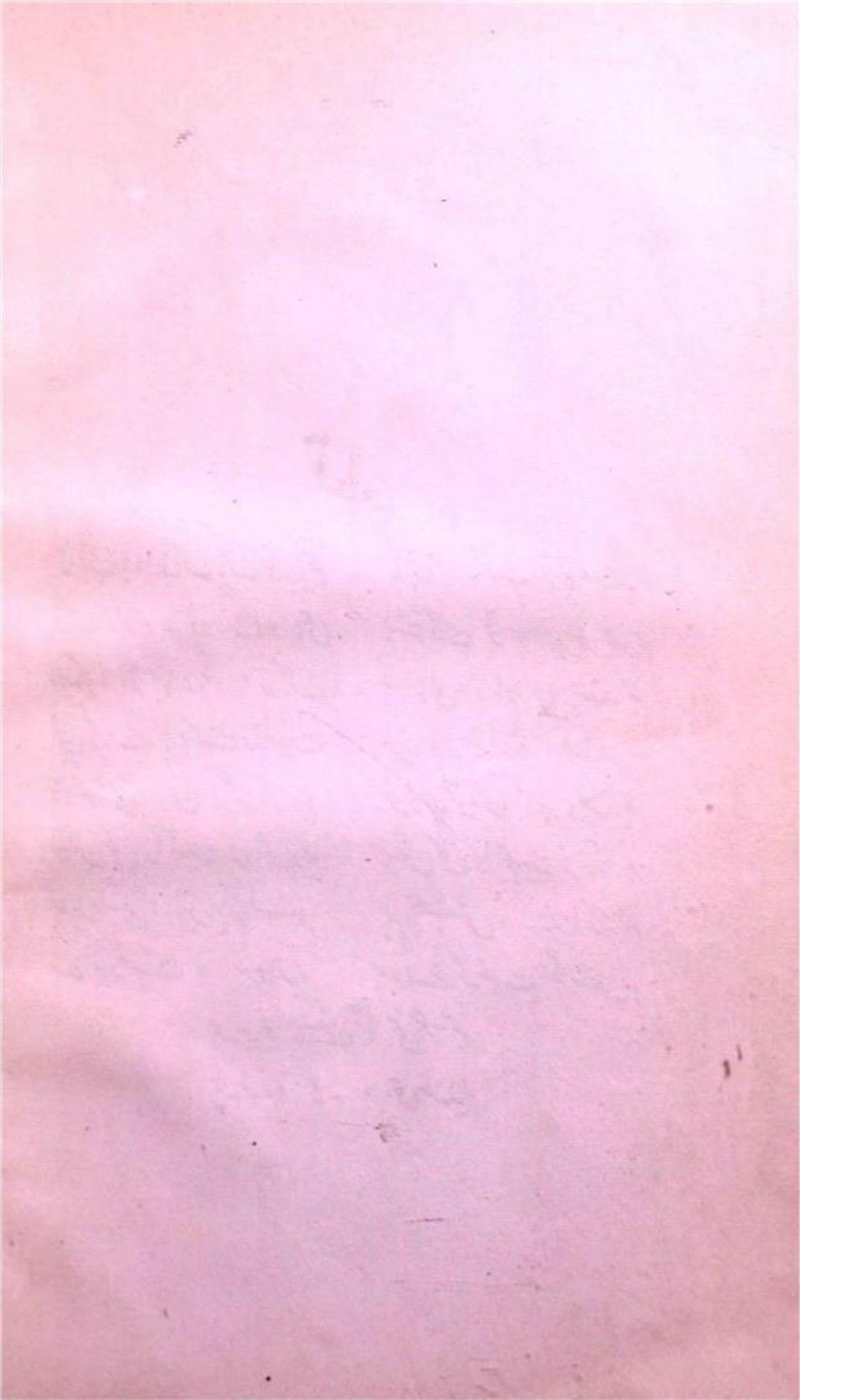
سوانح حیات

آبا و اجداد۔

میرزا غالب نے کسی جگہ لکھا ہے کہ میرا سلسلۂ نسب تور ابنِ فریدون سے ملتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے یہاں ان کے خاندان کا مختصر تذکرہ بیجا نہیں ہوگا۔

دنیا کے اور ملکوں کی طرح ایران کی پرانی تاریخ بھی دیو مالائی قصّوں سے بھری پڑی ہے اور تاریخی اعتبار سے قابلِ توجہ نہیں۔ یہاں کا پہلا خاندانِ شاہی جس کے بعض افراد، کم از کم اس کے آخری زمانے میں، غالباً تاریخی شخصیتیں ہیں، گلشائی کہلاتا ہے۔ یہ خاندان چار گروہوں پر مشتمل ہے: اوّل: پیشدادی؛ دوم: کیانی؛ سوم: اشکانی؛ اور چہارم: ساسانی۔ ساسانی گروہ کا آخری بادشاہ یزدگرد ثالث تھا، جسے سعد بن ابی وقاص نے خلیفۂ ثانی حضرت عمر کے عہد میں قادسیہ کے مقام پر شکستِ فاش دی (یکم جون، ۶۳۷ء)، جس سے دار الخلافہ المداین مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ اس کے بعد بھی اگرچہ یزدگرد نے مقابلے کی کوشش کی اور دو تین جھڑپیں بھی ہوئیں، لیکن نہاوند کی لڑائی (۶۴۱ء) نے عملی طور پر جنگ کا خاتمہ کر دیا۔ یزدگرد اس کے بعد بھی دس گیارہ برس تک ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ لیکن ایران میں دُرفشِ کاویانی ہمیشہ کے لیے سرنگوں ہو گیا۔ اور یہ "ملکِ کیان" بھی اسلامی سلطنت کا ایک حصّہ بن گیا۔ یہی گروہِ اوّل یعنی پیشدادی میرزا غالب کے آبا و اجداد ہیں۔

پیشدادی خاندان کا بانی کیومرس کہا جاتا ہے۔ ایرانی اسے "وخشور" یعنی نبی مانتے ہیں۔ جشنِ سدہ سب سے پہلے اسی نے منایا۔ بعض مؤرخوں کا دعویٰ ہے

کہ دنیا میں آیینِ جہانبانی کا بانی کیومرس تھا اور شہر بسانے کی رسم بھی اسی نے ڈالی۔ دماوند اور استخر اور بلخ تینوں شہر اس کی یادگار بتائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس کا پوتا ہوشنگ بن سیامک تخت پر بیٹھا۔ ایرانی اسے بھی دخشورِ عہد کہتے ہیں۔ کتاب "جاودان خرد" بھی، جس کا مامون الرشید عباسی کے عہد میں حسن بن سہل نے عربی میں ترجمہ کیا تھا، ہوشنگ ہی سے منسوب کی جاتی ہے۔ یہ بادشاہ اتنا صاحبِ عدل اور رعایا پرور تھا کہ رعایا نے اسے "پیش داد" یعنی عادلِ اوّل کے خطاب سے نامزد کیا۔ اسی سے خاندان کا نام پیشدادی پڑ گیا۔ فردوسی کہتا ہے کہ سب سے پہلے آگ اسی کے عہد میں دریافت ہوئی، جو دو پتھروں کی اچانک رگڑ سے پیدا ہوئی تھی۔ لکھتا ہے:-

جہاندار پیشِ جہان آفریں — نیایش ہمی کرد و خواند آفریں
کہ اُو را فروغِ چنیں ہدیہ داد — ہمیں آتش آں گاہ قبلہ نہاد
بگفتا، فروغیست ایں ایزدی — پرستیدہ باید، اگر بخردی

گویا اس نے نورِ خداوندی کو خاص نعمت خیال کیا، اس پر خدا کا شکر ادا کیا اور اپنی رعایا کو بھی شکر بجا لانے کی ہدایت کی۔ ایران میں آتش پرستی یہیں سے شروع ہوئی۔ ایرانیوں کا دعویٰ ہے کہ سُوس اور بابل دونوں شہر بھی ہوشنگ نے تعمیر کیے اگرچہ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ بابل کی بنیاد ضحاک کے زمانے میں پڑی۔

ہوشنگ کا جانشیں تہمورس تھا اور اس کے بعد جمشید تخت نشین ہوا۔ جشنِ نوروز کی ابتدا اسی کے زمانے میں ہوئی، اور ایک روایت کے مطابق شرابِ انگوری بھی اسی کی ایجاد ہے۔ جامِ جم کو تو ہمارے شاعروں نے حیاتِ جاودانی بخش دی ہے۔ جمشید کے آخری ایام میں ایک شخص ضحاک نے بغاوت کی اور جمشید کو آرے سے چیر کر ہلاک کر دیا، مگر خود اتنا ظالم اور شقی تھا کہ خلقِ خدا اس سے جلد ہی تنگ آ گئی۔ آخر کار لوگوں نے اسے تخت سے اتار دیا اور اس کی جگہ جمشید کے

پوتے فریدون بن آبتین کو اپنا حکمران تسلیم کر لیا۔ ممکن نہیں کہ فریدوں کا نام آئے، اور اس کے ساتھ کاوہ آہنگر اور درفش کاویانی ذہن میں نہ آئیں۔ اگرچہ ایران میں آتش پرستی ہوشنگ کے زمانے سے ہو رہی تھی، مگر سب سے پہلا آتش کدہ فریدون ہی کے عہد میں تعمیر ہوا۔ یہی فریدون میرزا غالب کا جدّ اعلیٰ ہے۔

فریدون کے تین بیٹے تھے: ایرج، تہمورس کی نواسی ارنواز یا ایران دخت کے بطن سے، اور تور اور سلم دو بھائی ضحاک کی بیٹی سے۔ اس نے سلطنت تینوں بھائیوں میں تقسیم کر دی، پایۂ تخت کا مرکزی علاقہ سب سے بڑے بیٹے ایرج کے حصے میں آیا؛ مشرقی اضلاع تور کو، اور مغربی سلم کو۔ تور اور سلم اس تقسیم سے ناخوش تھے۔ رشک و حسد نے اپنا کام کیا اور دونوں بھائیوں نے سازش کر کے ایرج کو قتل کر دیا۔ مگر دل کی مراد پھر بھی بر نہ آئی۔ فریدون نے اپنے بعد تخت نشینی کے لیے ایرج کے بیٹے منوچہر کو نامزد کیا، جو اپنے والد کی وفات سے چھ ماہ بعد پیدا ہوا تھا۔ منوچہر نے حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں لیتے ہی اپنے باپ کے قاتلوں سے انتقام لینے کی ٹھانی۔ تور اور سلم کے لیے سرزمین ایران اپنی تمام وسعت اور فراخی کے باوجود تنگ ہو گئی۔ اب یہاں رہنا گویا جان سے ہاتھ دھونا تھا۔ اس لیے ان لوگوں نے کہیں اور چل کر قسمت آزمائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ تلوار ہاتھ میں تھی اور نصیبا یاور، لڑتے بھڑتے یہ جماعت ترکستان پہنچی اور یہاں ایک نئی سلطنت توران کی داغ بیل ڈالنے میں کامیاب ہو گئی۔ تور کی نسل سے ایک نوجوان افراسیاب* نے منوچہر کو شکست دی، مگر پھر صلح و صفائی ہو گئی اور یہ طے پایا کہ دریائے آمو ان دونوں حکومتوں میں حدِ فاصل رہے۔ منوچہر کی زندگی تک تو فریقین نے اس معاہدے کی پابندی کی، لیکن جب اس کے بعد اس کا بیٹا نوذر تخت نشین ہوا، تو افراسیاب نے پھر ایران پر حملہ کر دیا اور اب کی تخت پر قابض ہو گیا۔ اگر شاہنامہ کی روایت تسلیم کی جائے تو مشہور پہلوان رستم اسی عہد میں ہوا ہے۔ دس بارہ برس بعد ایرانیوں نے دوبارہ بغاوت کی اور اب کی انھوں نے تورانیوں کو

---

* افراسیاب بن پشنگ بن زادشم بن تور بن فریدون

ہمیشہ کے لیے ایران سے نکال دیا۔ لیکن دونوں خاندانوں میں جنگ کا سلسلہ اس کے بعد بھی مدّت تک جاری رہا۔[1]

بہرحال دیومالائی پیشدادیوں کا اسی پر خاتمہ ہوگیا اور ان کے بعد کیانی خاندان کا دور دورہ شروع ہوا، جن کی کم از کم نیم تاریخی حیثیت مسلمہ ہے۔ انھیں کے بعد ہخامنشی بادشاہ ہوئے، جن میں خورسِ اعظم کی عظیم الشّان ہستی بھی ہے۔ بعض مفسّرینِ قرآن کے نزدیک ذو القرنین سے یہی بادشاہ مراد ہے۔

تورانیوں پر بھی کئی انقلاب آئے۔ زمانے نے بارہا ان کی بساط الٹی اور ہر بار انھوں نے اسے اپنی ہمّت و استقلال سے از سرِ نو بچھایا۔ آخری بار افراسیاب کی نسل سے ترکانِ ایبک نے خراسان، عراق، پارس، آذربائیگان میں بویہ اور غزنویہ کے کھنڈروں پر ایک نئی سلطنت کی بنیاد رکھی اور سلاجقہ کے نام سے مشہور ہوئے۔[2]

خاندانِ سلجوق کا بانی صحیح معنوں میں طغرل بیگ (۱۰۳۷ء — ۱۰۶۳ء) تھا۔ یہ اس سلجوق کا پوتا ہے، جس کے نام پر اس خاندان کا نام سلجوقی پڑا۔ طغرل کے بعد الپ ارسلان (۱۰۶۳ء — ۱۰۷۲ء) اور ملک شاہ (۱۰۷۲ء — ۱۰۹۲ء) حکمران ہوئے، جن کا نام تاریخِ ایران میں شہرتِ دوام کا مالک ہے۔ اسی دور میں نظام الملک طوسی اور عمر خیّام آسمانِ سیاست و علم و ادب کے وہ درخشندہ ستارے ہوئے، جن کی ذات پر ایران رہتی دنیا تک ناز کریگا۔ فرقۂ باطنیہ کا بانی حسن بن صباح بھی ان کا ہمعصر تھا۔ ملک شاہ کی وفات پر پہلے اس کا بڑا بیٹا محمود (۱۰۹۲ء - ۱۰۹۴ء) اور پھر دوسرا برکیارق

۱۔ یہ تمام حالات شاہنامۂ فردوسی اور نامۂ خسرواں (میرزا جلال الدین) اور تاریخ ایران از سر پرسی سائکز (انگریزی) سے ماخوذ ہیں۔

۲۔ بعض مؤرخوں کو سلجوقیوں کے تورانیوں کی نسل سے ہونے میں کلام ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب طغرل نے عباسی خلیفہ القائم کی صاحبزادی سے نکاح کی درخواست کی، تو اپنے آپ کو عباسیوں کا ہم کفو ثابت کرنے کے لیئے یہ نسب نامہ گڑھ لیا، ورنہ یوں اس میں کوئی صداقت نہیں۔

(۱۰۹۴ء۔ ۱۱۰۴ء) تخت پر بیٹھے۔ غالب اسی برکیارق کی نسل سے ہیں![1]

آلِ سلجوق نے تقریباً تین صدی تک (۱۰۳۷ء۔ ۱۳۰۰ء) دادِ دہش سے حکومت کی۔ آخر خوارزمیوں کے ہاتھوں سلجوقیوں کا شیرازہ بھی بکھرا، اور اب کے ایسی بُری طرح بکھرا کہ پھر اس جماعت کو اطمینان سے ایک مرکز میں بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ یہ لوگ ماوراء النہر میں پراگندہ ہو گئے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے رہزنی اور غارت گری کا پیشہ اختیار کیا اور کچھ نے سپہگری کا۔ اس آخری گروہ میں خاندانِ شاہی کے ایک نام لیوا تُرسم خان بھی تھے، انھوں نے سمرقند میں اقامت اختیار کی[2]۔ یہی تُرسم خاں میرزا غالب کے جدِّ اعلیٰ ہیں۔

غالب کے دادا کا نام قوقان بیگ خان تھا[3]۔ وہ اپنے باپ سے ناراض ہو کر[4] محمد شاہ کے عہد[5] میں سمرقند سے ہندستان چلے آئے۔ وہ صرف ترکی بولتے اور ہندستانی

۱۔ احوالِ غالب، ۲۷ ۲۔ درفشِ کاویانی، ۴۵ ۳۔ احوالِ غالب، ۲۷

۴۔ کلیاتِ نثر (غالب) ۱۵۴ (خط بنام مولوی سراج الدین احمد)

۵۔ میرزا نے کئی مقامات پر لکھا ہے کہ میرے دادا شاہ عالم کے عہد میں ہندستان آئے۔ اس سے متعلق مولانا غلام رسول مہر فرماتے ہیں کہ شاہ عالم کی پادشاہی کا زمانہ ۱۷۵۹ء سے شروع ہوتا ہے اور چونکہ میر منّو جن کے پاس میرزا قوقان بیگ خان لاہور میں ملازم رہے، ۱۷۵۰ء میں وفات پا چکے تھے، اس لیے ثابت ہوا کہ وہ شاہ عالم نہیں، بلکہ اس سے پہلے محمد شاہ کے عہد میں یہاں آئے۔ (غالب ۱۳) یہ استدلال ٹھیک ہے اور یہ درست ہے کہ اس وقت تختِ دہلی پر شاہ عالم نہیں، بلکہ محمد شاہ متمکّن تھا، لیکن میرے خیال میں میرزا کی بھی یہ مراد نہیں کہ یہ شاہ عالم کی پادشاہی کا زمانہ تھا۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا کے دادا اور لوہارو خاندان کے اسلاف (یعنی قاسم جان، عالم جان، اور عارف جان) ۱۷۵۰ء کے لگ بھگ ایک ساتھ ہندستان آئے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب شاہ عالم اپنی شاہزادگی کے ایام میں جب کہ اس کا نام عالی گوہر تھا، ممالکِ شرقیہ میں مصروفِ جنگ و قتال تھا۔ میرزا قوقان بیگ خان بھی میر منّو کی

(بقیہ حاشیہ دیکھیے ص ۲۲)

برائے نام جانتے تھے[1]۔ وہ پہلے لاہور میں نواب معین الملک (عرف میر منو) کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ پھر نواب معین الملک کی وفات پر لاہور سے دلّی پہنچے اور نواب ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خان کی سرکار سے وابستہ ہو گئے[2]۔ نواب ذوالفقار الدولہ ہی کے توسّل سے وہ شاہ عالم کی سرکار میں پچاس گھوڑے اور نقارہ و نشان سے ملازم ہوئے۔ ایک سیر حاصل پرگنہ پہاسو جو بعد کو انگریزوں نے بیگم سمرو کو دے دیا تھا، ان کی ذات اور رسالے کی تنخواہ کے لیے مقرر ہوا[3]، اور یوں ان کی آرام سے بسر ہونے لگی۔

لیکن حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ سلطنتِ مغلیہ کی قوت روز بروز رُو بتنزّل تھی۔ دُور دست علاقے ہاتھ سے نکلتے جا رہے تھے، اور یہاں کی حالت غیر یقینی اور مخدوش ہو گئی تھی۔ غالباً انھی ایام میں میرزا قوقان بیگ خان مغلیہ حکومت کی ملازمت ترک کر کے مہاراجہ جے پور کی سرکار سے وابستہ ہو گئے اور پھر انھوں نے دلّی سے منتقل ہو کر مستقل سکونت بھی آگرے میں اختیار کر لی[4]۔

توقان بیگ خان کی اولاد میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ میرزا غالب منشی نبی بخش حقیر کو ایک خط میں لکھتے ہیں[5]:

بھائی صاحب! میں بھی تمہارا ہمدرد ہو گیا، یعنی منگل کے دن ۱۸ ربیع الاوّل

۱۔ درفشِ کاویانی: ۴۵ ۲۔ کلیاتِ نثر: ۱۴۵ (بنام مولوی سراج الدین احمد)

۳۔ اردوئے معلّٰی: ۲۹ (بنام حبیب اللہ خان ذکا)؛ احوالِ غالب: ۲۷

۴۔ انتخابِ یادگار (۲): ۴۴ ۵۔ خطوطِ غالب: ۱۳۵-۱۳۶؛ نیز باغِ دودر: ۱۴۶

(بقیہ حاشیہ ص ۲۱)

وفات کے بعد (شرف الدولہ) قاسم جان کی معیت میں دلّی پہنچے اور یہاں سے ممالکِ شرقیہ میں جا کے شاہزادہ عالی گوہر سے مل گئے۔ اسی بات کو میرزا ان کے یہاں شاہ عالم کے زمانے میں آنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ وہ شاہ عالم کے زمانۂ شاہزادگی میں ان کے ساتھ مل کر لڑتے رہے۔

کو شام کے وقت وہ پھوپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا،
اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی، مرگئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا
نو آدمی مرے: تین پھوپھیاں، اور تین چچا، اور ایک باپ، اور ایک دادی،
اور ایک دادا یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی
زندہ ہیں اور اس کے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج یک بار مر گئے۔

اس سے ظاہر ہے کہ میرزا کے والد چار بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ تین بہنوں کی تصدیق اس سرکاری شقّے[1] سے بھی ہوتی ہے، جو میرزا کے چچا نصر اللہ بیگ خان کی وفات کے بعد، جون ۱۸۰۶ء کو پانچ ہزار روپیہ سالانہ پنشن کی تقسیم کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس میں دوسرے حصہ داروں کے ساتھ پندرہ سو روپیہ میرزا نصر اللہ بیگ خان کی والدہ اور تین بہنوں کے لیے مقرّر ہوئے تھے۔ ہمیں ان میں سے صرف دو صاحبزادوں کے نام معلوم ہیں: میرزا عبد اللہ بیگ خان اور میرزا نصر اللہ بیگ خان۔ یہی میرزا عبد اللہ بیگ خاں میرزا غالب کے والد بزرگوار ہیں۔

والدین اور ننھیال

میرزا عبد اللہ بیگ کی ولادت دلّی میں ہوئی[2]۔ بظاہر جب تک ان کے والد میرزا قوقان بیگ خان زندہ تھے، انھیں روزگار کی فکر نہیں ہوئی۔ مگر جب ان کا انتقال ہو گیا اور سلطنتِ مغلیہ میں بھی طوائف الملوکی کا بازار گرم ہوا، تو انھیں اپنی معاش کی فکر دامنگیر ہوئی۔ میرزا غالب لکھتے ہیں[3]:

> (دادا کے) انتقال کے بعد جو طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم تھا، وہ علاقہ (یعنی جاگیر پرگنۂ پہاسو) نہ رہا۔ باپ میرا عبد اللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدرآباد جا کر نواب نظام

۱۔ دیکھیے، آگے ص ۳۲۔ ۳۳
۲۔ کلیاتِ نثر ص ۱۵ (بنام مولوی سراج الدین احمد)، دُرفش کاویانی ص ۱۳۱
۳۔ اردوئے معلیٰ ۲۷۶ (بنام حبیب اللہ خان ذکا)، نیز دیکھیے احوالِ غالب ۲۷۔

علی خان کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجا بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ اور وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔

میرزا عبد اللہ بیگ خان کی شادی آگرے میں خواجہ میرزا غلام حسین خان کمیدان کی صاحبزادی عزت النساء بیگم سے ہوئی۔[1] وہ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں اور خانگی معاملات میں بذاتِ خود خاص دلچسپی لیتی تھیں۔ میرے خیال میں وہ ۱۸۴۰ء تک زندہ تھیں۔[2]

خواجہ غلام حسین خان کمیدان سرکار میرٹھ کے ایک فوجی افسر اور آگرے کے عمائد میں سے تھے۔ آگرے میں ان کی کافی جائداد تھی، جس کا ذکر خود غالب نے بھی ایک خط میں کیا ہے۔ منشی شیونرائن کو لکھتے ہیں:[3]

> ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ جو اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اس کے ایک "کھٹیا والی حویلی" اور سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس کے آگے بڑھ کر ایک کٹرہ کہ وہ "گڈریوں والا" مشہور تھا؛ اور ایک کٹرہ کہ وہ "کشمیرن والا" کہلاتا تھا۔ اس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا۔ اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔

۱۔ یہ اطلاع غالب کے ایک فارسی خط پر مبنی ہے، جو پہلے کتابخانہ حبیب گنج میں تھا، اور اب آزاد لائبریری، علی گڑھ میں ہے۔ خط کی تاریخ بظاہر ۱۸۰۴ء معلوم ہوتی ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ ۱۸۴۰ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس سے متعلق دیکھیے مضمون: "ایک فارسی خط کی تاریخ" (مشمولۂ نسانۂ غالب)۔ ۲۔ ایضاً

۳ اردوے معلی، ۴۲۶؛ خطوط غالب (۱) ۲۲۳

یہ بڑی حویلی جس کے صدر دروازے کی بارہ دری پر میرزا کی نشست رہتی تھی، اب بھی پیپل منڈی، آگرے میں موجود ہے۔ اسی کا نام کالا (؟ کلاں) محل ہے! یہ نہایت عالی شان عمارت ہے۔ یہ کسی زمانے میں راجہ گج سنگھ کی حویلی کہلاتی تھی۔ راجہ گج سنگھ جودھپور کے راجہ سورج سنگھ کے بیٹے تھے اور عہدِ جہانگیری میں اسی مکان میں رہتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ میرزا کی پیدائش اسی مکان میں ہوئی ہو گی، کیونکہ خواجہ غلام حسین خان کا اصلی سکونتی مکان یہی تھا۔ آج کل (۱۹۷۵ء) یہ عمارت ایک ہندو سیٹھ کی ملکیت ہے اور اس میں لڑکیوں کا مدرسہ (اندر بھان گرلز ہائی اسکول) ہے۔ اس کے علاوہ جس جاداد کے نام اس خط میں آئے ہیں، اس میں سے بھی بہت سی اب تک اسی طرح موجود ہے، جیسی غالب کے بچپن کے زمانے میں تھی۔[۱]

میرزا عبداللہ بیگ خان اپنی سسرال میں "میرزا دولھا" کے عُرف سے مشہور تھے۔ ان کی حیثیت خانہ داماد کی تھی اور ان کی بیوی آخر تک اپنے میکے ہی میں رہیں۔ یوں بھی میرزا عبداللہ بیگ خان کا اپنا کوئی مستقل ٹھکانا تو تھا نہیں، جہاں وہ جاتیں۔ جیسا کہ ذکر ہوا، ان کی وفات راؤ راجا بختاور سنگھ والیِ الور کی ملازمت میں ہوئی۔ مولانا حالی لکھتے ہیں:[۲]

> راجہ بختاور سنگھ نے ابھی ان کو کوئی خاطر خواہ نوکری نہیں دی تھی کہ اتفاق سے انھیں دنوں ایک گڑھی کے زمیندار راج سے پھر گئے۔ جو فوج اس گڑھی پر سرکوبی کے لیے بھیجی گئی، اس کے ساتھ میرزا عبداللہ بیگ خان کو بھی بھیجا گیا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی ان کے گولی لگی اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا؛ اور راج گڑھ میں دفن ہوئے۔ راجہ بختاور سنگھ رئیسِ الور نے دو گاؤں میر جاحمل اور کسی قدر روزینہ میرزا مرحوم کے دونوں لڑکوں کی پرورش کے واسطے مقرر کر دیا، جو ایک مدّت تک جاری رہا۔

۱۔ "گڈریوں والا کٹرہ" آج کل "گدڑی منصور خان" کے نام سے مشہور ہے۔ کشمیری بازار کا علاقہ "کشمیرن والا کٹرہ" کی جگہ ہے۔

۲۔ یادگارِ غالب: ۲۳

یہ حادثہ ۱۸۰۲ء میں پیش آیا۔[1] میرزا نے ۱۸۶۰ء میں ایک قصیدہ راجا شیو دھیان سنگھ والیِ الور کی خدمت میں پیش کیا تھا،[2] اس میں اپنے حقوق جتانے کے لیے ایک شعر میں اسی واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

کافی بود مشاہدہ، شاہد ضرور نیست درخاکِ راج گرھ پدرم را بود مزار

ولادت

میرزا ۸ رجب ۱۲۱۲ھ[3] (۲۷۔ دسمبر ۱۷۹۷ء) کو بدھ کے دن سورج نکلنے سے چار گھڑی پہلے آگرے میں پیدا ہوئے۔[4] ان کا پورا نام اسد اللہ بیگ خان تھا، اگرچہ وہ مشہور صرف اسد اللہ خان کے نام سے ہوئے۔[5]

۱۔ کلیاتِ نثر: ۱۵۴ ۲۔ قصیدہ نمبر (۵۸)، کلیاتِ غالب (فارسی)

۳۔ اردوے معلّیٰ: ۲۹۵؛ خطوطِ غالب (۱): ۳۴۷؛ احوالِ غالب، بلاک مقابل ص ۲۴

۴۔ کلیاتِ نثر: ۵، ۱۵۴؛ درفشِ کاویانی: ۱۳۱؛ احوالِ غالب: ۲۷

۵۔ یعنی جس رات کو پیدا ہوئے، اس سے بعد بدھ وار اور یہ تاریخ تھی۔ میرزا کے کلیاتِ نظم فارسی (طبع دوم) میں ان کا زائچہ بھی شامل ہے۔ اس کے عنوان میں نواب نیّر رخشاں نے ولادت سے متعلق لکھا ہے: "روزِ یکشنبہ ہشتم رجب ۱۲۱۴ ہجری مطابق آغاز ۱۷۹۸ء رو دادہ"۔ اس تحریر میں کئی غلطیاں ہیں۔ ہجری تاریخ اور مہینا ٹھیک ہے، البتہ سال میں کاتب کی مہربانی سے ۱۲۱۲ کی جگہ ۱۲۱۴ لکھا گیا ہے۔ یہ ہجری تاریخ جو یقیناً میرزا نے انھیں بتائی ہوگی، درست ہے اور اس کی تائید دوسری جگہ سے بھی ہوتی ہے۔ باقی سب باتیں نیّر رخشاں نے اضافہ کیں، اور بدقسمتی سے سب غلط ہیں۔ دن یکشنبہ نہیں، بلکہ چہار شنبہ تھا؛ عیسوی سال ۱۷۹۷ چاہیے، اور وہ بھی اواخر۔ غالب نے اپنے جو حالات تذکرۂ مظہر العجائب کے لیے لکھے تھے (احوالِ غالب، بلاک محولہ فوق) وہاں نیّر رخشاں ہی کا تتبع کرتے ہوئے کسی نے حاشیے میں یومِ ولادت یکشنبہ لکھ دیا ہے۔ ادھر بعض اصحاب نے زائچے کی بنا پر سالِ ولادت ۱۲۱۱ھ یا ۱۲۱۳ھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، یہ ٹھیک نہیں۔ (اس سلسلے میں دیکھیے، فسانۂ غالب، مضمون "تاریخِ ولادت")

ان کے والد کا عرف "میرزا دولھا" تھا، ان کا "میرزا نوشہ" ہوا۔ ان سے بڑی ایک بہن تھی جن کا نام یا عُرف چھوٹی خانم تھا؛ اور ایک بھائی یوسف علی بیگ خان

ے اس نام سے مجھے شبہہ ہوتا ہے کہ میرزا غالب کی والدہ عزت النساء بیگم اپنے میکے میں "بڑی خانم" کے عُرف سے مشہور تھیں۔

چھوٹی خانم کی شادی حضرت اُسر خیوش بدخشی کی اولاد میں قبیلہ برلاس کے ایک شخص میرزا جیون بیگ کے صاحبزادے میرزا اکبر بیگ سے ہوئی ۔ غزلیات وحشی (رفیع الدین بیگ خلف میرزا عاشور بیگ) کے دیباچہ نگار میرزا حیرت دہلوی (ص ۳) کو غلط فہمی ہوئی جو انھوں نے لکھا ہے کہ میرزا جیون بیگ کے صاحبزادے میرزا اکبر بیگ سے غالب کی پھوپھی کا نکاح ہوا تھا؛ دراصل یہ حقیقی بہن تھیں۔ ہاں، میرزا غالب کی ایک پھوپھی کی شادی اسی قبیلے کے ایک دوسرے شخص مبارک علی بیگ سے ہوئی تھی، جن کی بیٹی موتی بیگم کا نکاح میرزا اکبر علی بیگ سے ہوا، جو زمانۂ غدر میں آگرے کے کوتوال تھے۔ ان کی اولاد مدتوں آگرے میں رہی۔ اب یہ خاندان نقلِ مکان کر کے پاکستان چلا گیا ہے۔

یہ میرزا جیون بیگ بھی میرزا غالب کے دادا کے ساتھ بدخشاں سے ہندستان آئے تھے؛ اور دونوں خاندانوں میں پہلے سے دوستانہ بلکہ رشتہ داری کے تعلقات تھے۔ میرزا اکبر بیگ اور چھوٹی خانم کی اولاد میں تین صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہوئی۔ صاحبزادوں کے نام میرزا عاشور بیگ، میرزا جواد علی بیگ (عرف میرزا مغل بیگ) اور میرزا عباس بیگ تھے، اور صاحبزادی کا نام امانی خانم تھا۔ غالب کے اردو خطوں میں ان تینوں بھانجوں کا ذکر آیا ہے۔ میرزا عاشور بیگ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اپنے ۱۹ سالہ بیٹے میرزا احمد بیگ کے ساتھ شہید ہوئے (اردوئے معلّیٰ : ۲۵۵) میرزا مغل بیگ الور میں ملازم تھے اور ۱۸۵۰ء کی مقامی شورش میں دیوان امتوجان کے ساتھ یہ بھی

(باقی ص ۲۸ پر)

تھے۔ یہ ان سے دو برس چھوٹے تھے۔ بچپن میں میرزا غالب نے والدہ کے [۵]

---

۵ یہ یوسف علی خان نام غالب نے اپنی مقدمے کی درخواست میں لکھا ہے (دیکھیے انڈیا آفس، بنگال، پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ نمبر ۴۔ (۵۴۴۲۹)

بقیہ ص ۲۷ وہاں سے نکالے گئے تھے (اردوے معلیٰ: ۱۶۹)۔ ان کی قبر مہندیوں میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے مزار کی جنوبی دیوار کے قریب ہے۔ میرزا عباس بیگ مدتوں سرکارِ انگریزی میں ملازم رہے۔ ۱۸۵۷ء میں یہ بلگرام میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور اس کے بعد تبدیل ہو کر فرخ آباد آ گئے (عودِ ہندی: ۲) اور پھر ایک عرصے تک لکھنؤ میں رہے۔ بخلاف اپنے آبائی خاندان کے شیعی تھے۔ ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں وفات پائی۔ امانی خانم کی شادی نواب الٰہی بخش خان معروف کے صاحبزادے علی بخش خان سے ہوئی تھی، جن کے صاحبزادے غلام فخرالدین سے غالب کے چھوٹے بھائی میرزا یوسف کی صاحبزادی عزیزالنساء بیگم منسوب تھیں۔

میرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی مرحوم نے ایک مضمون خواجہ بدرالدین خان عُرف خواجہ امان مترجمِ بوستانِ خیال سے متعلق سہ ماہی رسالہ اردو (اپریل ۱۹۲۱ء) میں لکھا تھا؛ یہ ان کے مجموعۂ مضامین کے چوتھے حصے میں بھی شامل ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ خواجہ امان اور میرزا غالب کے اجداد کا سلسلہ ایک ہی ہے۔ اس لیے تمہید میں انھوں نے میرزا غالب کے خاندان کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے واقعات اور سنین کی اتنی فاش غلطیاں کی ہیں کہ اس مختصر تحریر میں ان کا شمار کرانا بھی مشکل ہے۔ جہاں تک خواجہ امان کا تعلق ہے، یہ بہترین مضمون ہے اور کیوں نہ ہوتا! لکھنے والے میرزا فرحت اور خواجہ امان ان کے نانا؛ ان سے بہتر اس موضوع پر کون لکھ سکتا تھا! ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ غالب کی ہمشیر چھوٹی خانم کے شوہر میرزا اکبر بیگ جناب میرزا فرحت اللہ بیگ کے پردادا میرزا افضل بیگ کے بھائی تھے۔ میرزا افضل بیگ بہت بااثر شخص تھے۔ وہ بہادر شاہ ظفر کے والد اکبر شاہ ثانی کی طرف سے کلکتے میں انگریزوں کے ہاں سفیر تھے۔ غالب کے فارسی خطوں میں میرزا افضل بیگ کا اکثر ذکر آیا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ پنشن کے مقدمے میں اپنی ناکامیوں اور مشکلوں کے لیے انھیں بھی ذمہ دار گردانتے تھے۔ (متفرقاتِ غالب ۸۶، ۱۰)

علاوہ اپنی ممانی کا بھی دودھ پیا تھا۔[1]

چچا کی سرپرستی

میرزا عبداللہ بیگ خان کی وفات کے بعد اُن کے بچوں کی دیکھ بھال کا بیڑہ ان کے چھوٹے بھائی میرزا نصراللہ بیگ خان نے اٹھایا۔ ان کی شادی فخرالدولہ دلاورالملک، نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ، والیِ لوہارو کی ہمشیرہ سے ہوئی[2]، لیکن کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی کہ بیوی کی وفات ہو گئی۔ اب بڑے بھائی کی وفات کے بعد انھوں نے ان کے بچوں کو ایسے ناز و نعم سے پالا، جیسے یہ ان کی اپنی حقیقی اولاد ہو۔

میرزا نصراللہ بیگ خان انگریزی عملداری سے پہلے مرہٹوں کی طرف سے فرانسیسی جرنیل پیرون (Perron) کی ماتحتی میں اکبرآباد کے حاکم تھے۔ ۱۸۰۳ء میں جب لارڈ لیک نے اس علاقے پر چڑھائی کی، تو میرزا نصراللہ بیگ نے ہتھیار ڈال دیے اور لڑائی بھڑائی کے بغیر شہر حوالے کر دیا[3]۔ اس کا خوشگوار اثر پڑا اور ممکن ہے کہ پہلے سے کچھ سمجھوتا بھی ہو گیا ہو بلکہ میرا گمان تو یہ ہے کہ میرزا نصراللہ بیگ خان کے مقابلے کے بغیر قلعہ سپرد کر دینے میں بھی نواب احمد بخش خان کے مشورے اور ایما کا دخل رہا ہوگا؛ نواب ان کے سالے تو تھے ہی، اور ان کا انگریزوں کے ہاں اچھا رسوخ تھا۔ انھوں نے کئی معرکوں میں لارڈ لیک کی نمایاں خدمات سرانجام دی تھیں اور لارڈ لیک ان کو بہت مانتے

۱۔ اردوئے معلیٰ: ۲۲۳ (بنام انورالدولہ شفق)؛ خطوطِ غالب (۱): ۲۰۰

۲۔ متفرقاتِ غالب: ۷؛ احوالِ غالب: ۳۲؛ یادگارِ غالب: ۲۳

۳۔ احوالِ غالب: ۷۔ نیز دیکھیے، دستاویز فارن ڈپارٹمنٹ (متفرق) نمبر ۲۰۸: ۱۳۰ (موجودہ نیشنل آرکائیوز یعنی قومی دفتر خانۂ ہند، نئی دلّی) (آیندہ بھی جہاں کہیں حوالے کی یہ شکل ہو، اس سے یہی مراد ہے کہ یہ دستاویز قومی دفتر خانۂ ہند نئی دلّی میں موجود ہے) نیز دیکھیے انڈیا آفس لائبریری (لنڈن) مجموعہ ۵۲۴۲۹ جلد ۱۲۴۴ ۱۸۰۱۷: (آیندہ اس دستاویز کے حوالے کی صورت یہ ہوگی: (انڈیا آفس: ...)

تھے؛ نئے مفتوحہ علاقے کا انتظام بھی لارڈ لیک ہی کے ہاتھ میں تھا۔ اس لیے یقین ہے کہ نواب احمد بخش خان نے بھی سفارش کی ہوگی۔ غرض انگریزی انتظام میں اکبرآباد کا صوبہ کمشنری میں تبدیل ہوگیا اور کمشنر ایک انگریز مسٹر ویلیرز (Villiers) مقرر ہوا۔ لارڈ لیک نے نصراللہ بیگ خان کی خدمات کے اعتراف میں انھیں انگریزی فوج میں چار سو سوار کا رسالدار بنا دیا اور سترہ سو روپیہ مشاہرہ مقرر ہوا[1]۔ اس کے بعد میرزا صاحب موصوف نے خود سونک اور سونسا، لاکھ سوا لاکھ سالانہ آمدنی کے دو زرخیز اور سیر حاصل پرگنے، جو بھرت پور کے نواح میں تھے، ریاست ہلکر کے سپاہیوں سے چھین لیے اور ان پر قبضہ جما لیا۔ جرنیل لیک کو جب یہ حال معلوم ہوا تو انھوں نے ۲۱ ستمبر ۱۸۰۵ء کے پروانے کی رُو سے یہ دونوں پرگنے بھی ان کو حینِ حیات مقرّری جاگیر میں دے دیے[2]۔

مگر افسوس، کہ اس جاہ و مرتبت سے لطف اندوز ہونا ان کی قسمت میں نہیں تھا۔ اس واقعے پر مشکل سے دس گیارہ مہینے گذرے ہونگے، کہ بڑے بھائی کی وفات سے کم و بیش پانچ سال بعد وہ ۱۸۰۶ء میں ایک دن سیر کرتے میں اچانک ہاتھی سے گر گئے۔ ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی، اور چوٹیں بھی آئیں۔ اسی حالت میں چند دن بعد ان کا انتقال ہوگیا[3]۔ اور یوں میرزا غالب اور ان کے بھائی میرزا یوسف ایک بار پھر یتیم اور تنہا رہ گئے۔ میرزا غالب کی عمر اس وقت صرف آٹھ برس اور چند ماہ کی تھی۔

۱۔ انڈیا آفس: ۱۸

۲۔ ایضاً نیز احوالِ غالب: ۲۷، ۲۸؛ اردوئے معلیٰ: ۲۶؛ مکاتیبِ غالب: ۸ (متن، دستاویز محولہ فوق میں ہے کہ ان دونوں پرگنوں کی جمع معافی ۱۵۸۰۰ روپیہ تھی۔ یعنی ان کے لیے میرزا نصراللہ بیگ خان کو یہ رقم سالانہ سرکارِ انگریزی کو ادا کرنا پڑتی تھی۔

۳۔ احوالِ غالب: ۲۸۔ تفصیل انڈیا آفس: ۲۰ میں ہے۔

پنشن

نواب احمد بخش خان کو میرزا نصر اللہ بیگ خان کی جوانا مرگی کا انسوس ہونا ہی چاہیے تھا۔ انھیں ان چھوٹے چھوٹے بچوں پر خاص طور پر رحم آیا، جو چچا کی وفات کے بعد اب بالکل بیکس ہو کر رہ گئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے لارڈ لیک سے سفارش کی؛ اور وہاں سے پنشن کا انتظام ہو گیا۔

نواب احمد بخش خان کو اپنی خدمات کے انعام میں سرکار انگریزی کی طرف سے میوات میں فیروز پور جھرکہ اور مضافات ہوڈل (تحصیل فیروز پور جھرکہ) میں نگینہ اور پونا ہانا وغیرہ کی جاگیر بطور استمرار عطا ہوئی تھی۔ مزید چونکہ وہ ریاست الور کے وکیل تھے، اس لیے مہاراجا بختاور سنگھ والیِ الور نے اپنی طرف سے انھیں لوہارو کا پرگنہ دے دیا تھا، جو اس سے پہلے الور ہی کا ایک حصہ تھا۔ فیروز پور جھرکا کی استمراری جاگیر سے متعلق یہ طے پایا تھا کہ اس کے لیے نواب احمد بخش خان سرکارِ انگریزی کو پچیس ہزار روپیہ سالانہ ادا کرتے رہینگے۔

میرزا نصر اللہ بیگ خان کی وفات پر ان کی حینِ حیات جاگیر، سونک اور سونا انگریزوں نے واپس لے لی اور رسالہ بھی توڑ دیا۔ البتہ ان میں سے پچاس سواروں کے ایک دستے سے متعلق یہ طے پایا کہ نواب احمد بخش خان اسے برقرار رکھینگے؛ سرکارِ انگریزی کو جب ضرورت ہوگی، وہ ان سے مدد طلب کر لیگی۔ اس دستے کے اخراجات اور میرزا نصر اللہ بیگ خان کے پسماندگان کی پنشن کے لیے ۴ مئی ۱۸۰۶ء کو یہ حکم صادر ہوا کہ نواب احمد بخش خان اپنی جاگیر کے لیے جو پچیس ہزار روپیہ سالانہ دیتے ہیں، وہ اس شرط پر معاف کیے جاتے ہیں کہ آیندہ ان میں سے پندرہ ہزار وہ اس دستے کی غور و پرداخت پر خرچ کریں، اور باقی دس ہزار میرزا مرحوم کے خاندان کو بطور پنشن ادا کریں[1]۔

۱- فارن (متفرق) نمبر ۲۰۸: ۲۹-۳۸۔ میرزا نصر اللہ بیگ خان کے پسماندگان سے متعلق دیکھیے، ص ۳۶-۳۸

نہ معلوم کیسے، اس فیصلے کے ایک ہی مہینہ بعد، ۷ جون ۱۸۰۶ء کو نواب احمد بخش خان نے لارڈ لیک سے ایک خط حاصل کر لیا، جس میں یہ درج تھا کہ میرزا نصر اللہ بیگ کے متعلقین کو پانچ ہزار روپیہ سالانہ حسبِ ذیل تفصیل سے ادا کیا جائے!

(۱) خواجہ حاجی[۲]: دو ہزار روپیہ سالانہ

(۲) میرزا نصر اللہ بیگ خان کی والدہ اور تین بہنیں: ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ۔

(۳) میرزا نوشہ اور میرزا یوسف برادر زادگانِ میرزا نصر اللہ بیگ خان مرحوم ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ[۳]۔

گویا پہلے تو دس ہزار سالانہ کے ہوئے پانچ ہزار، اور پھر اس تقسیم کی رُو سے ان پانچ ہزار میں سے بھی صرف ساڑھے سات سو میرزا غالب کو ملے اور ساڑھے سات سو ان کے بھائی میرزا یوسف کو۔

الور کا وظیفہ

مولانا حالی کے بیان کے مطابق[۴] میرزا عبد اللہ بیگ خان کی وفات کے بعد راجا

۱۔ میں نے اوپر لکھا ہے کہ میرزا غالب کی ہمشیرہ ان سے بڑی تھیں۔ میں نے یہ استدلال اسی حکم سے کیا ہے، چونکہ اس جگہ پنشن کے حصہ داروں میں چھوٹی خانم کا کوئی ذکر نہیں، اس لیے میرا خیال ہے کہ اس سے قبل ان کی شادی ہو چکی تھی۔ اگر وہ میرزا غالب سے دو برس بھی بڑی ہوں، جو بعید از قیاس نہیں، تو ۱۸۰۶ء میں ان کی عمر گیارہ برس کی ہوگی، اور اس عمر میں شادی ہو جانا غیر ممکن نہیں۔ خود میرزا غالب کی جب شادی ہوئی ہے، تو ان کی بیوی کی عمر صرف گیارہ برس کی تھی اور ان کی اپنی تیرہ کی۔

۲۔ خواجہ حاجی کا ذکر آیندہ صفحات میں آئیگا۔ کہ یہ کون بزرگوار تھے۔ یہاں صرف اتنا لکھ دینا کافی ہوگا کہ یہ ان پچاس سواروں کے افسر تھے، جو چار سو کا بقیہ تھے اور نواب احمد بخش خان کی تحویل میں دیے گئے تھے۔

۳۔ فارن (پولٹیکل) ۲۸۔ اگست ۱۸۳۷ء (۹۳-۹۵)

۴۔ یادگارِ غالب: ۲۳

بختاور سنگھ والیِ الور نے "دو گاؤں سیر حاصل اور کسی قدر روزینہ" میرزا مرحوم کے دونوں لڑکوں کی پرورش کے واسطے مقرر کر دیا تھا۔ خود میرزا نے لکھا ہے! کہ "ایک گاؤں جس کا تالڑا نام ہے، مجھ کو برائے دوام ملا"۔[1]

یہ نہیں کھلتا کہ یہ وظیفہ کب اور کیونکر بند ہوا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ میرزا غالب نے بعد کو اس کے دوبارہ اجرا کی کوشش کی تھی۔ پنج آہنگ میں ان کا ایک خط میرزا اسفندیار بیگ خان دیوانِ الور کے نام ہے[2]، جو انھوں نے ۱۸۵۰ء میں ان کی دیوانی کے زمانے میں لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے "گوشہ و توشۂ دیرینہ" کی بحالی کا مطالبہ کیا ہے۔ بہر حال اس میں شبہہ نہیں کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے اور ۱۸۵۰ء تک ان کا گزارا انھی ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ پر رہا، جو انھیں انگریزی حکومت کے خزانے سے ملا کیے۔

تعلیم

میرزا غالب کی ابتدائی تعلیم سے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ البتہ چونکہ ہمیں معلوم ہے کہ والد اور چچا کی وفات کے بعد ان کا قیام اپنے ننھیال میں رہا۔ اور یہ اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے، اس لیے بجا طور پر امید کی جا سکتی ہے کہ انھوں نے اپنی حیثیت کے مطابق ان کی تعلیم و تربیت کا مناسب انتظام کیا ہو گا۔

مولوی محمد معظم

اس زمانے میں مولوی محمد معظم کی ذاتِ گرامی آگرے میں مرجع خاص و عام تھی۔ میرزا غالب نے بھی ابتدائی فارسی تعلیم انھیں سے حاصل کی۔[3] مولانا حالی

۱۔ مکتوباتِ آزاد: ۲۳۵

۲۔ کلیاتِ نثر (غالب): ۲۲۰

۳۔ عیار الشعرا قلمی از خوب چند ذکا (مخطوطہ انڈیا آفس لنڈن)، نیز یادگارِ غالب: ۲۵

نے ایک دلچسپ واقعہ اس زمانے کا لکھا ہے کہ ایک دن میرزا غالب نے ایک فارسی غزل میں "یعنی چہ" کے معنوں میں "کہ چہ" ردیف لکھی اور اپنے استاد کو دکھائی۔ مولوی معظم نے ردیف کو مہمل کہہ دیا، مگر جب تھوڑے دن بعد میرزا نے ظہوری کے کلام سے اس کی سند پیش کی، تو وہ اپنے ہونہار شاگرد کی خداداد ذہانت اور جدّت کے قائل ہو گئے[1]۔

ملّا عبدالصّمد

یہ واقع ہے کہ میرزا غالب کو فارسی زبان سے قدرتی لگاؤ تھا، مگر اس ذوق کو چمکایا ملّا عبدالصمد ایرانی نے۔ جیسا کہ میرزا نے خود لکھا ہے، ملّا عبدالصّمد ایران کے ایک امیرزادۂ جلیل القدر تھے۔ وہ یزد کے رہنے والے اور نسلاً زردشتی تھے۔ وہ آبائی مذہب چھوڑ کر اسلام پر ایمان لے آئے تھے۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے ان کا نام ہرمزد تھا۔ وہ ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۰ — ۱۸۱۱ء) میں سیر و سیاحت کرتے ہندستان آئے اور اکبرآباد میں وارد ہوئے[2]۔ میرزا غالب کی عمر اس وقت یہی چودہ برس کی ہوگی۔ میرزا نے انھیں دو برس تک اپنے یہاں ٹھہرایا اور ان سے تعلیم حاصل کی[3]۔ ملا عبدالصّمد کی مادری زبان فارسی تھی اور اسلام قبول کرنے سے پہلے

۱۔ یادگارِ غالب: ۱۲۱۔ ظہوری کے دیوان میں دو غزلیں ایسی ہیں، جن کی ردیف ہی 'کہ چہ' ہے۔ ان کے مطلعے ہیں:

نہ کوے بادشہے گنجہا بجاے کہ چہ — بخیر بستہ جبین سرازگداے کہ چہ

ہم تو کیں ورزد کینہ دار کہ چہ — ہم تو غم خوار و غم گسار کہ چہ

۲۔ نواب علائی لکھتے ہیں: "عبدالصمد تاجر تھا۔ تجارت کے لیے آگرے کو اس نے امیدگاہ بنایا تھا۔" (نگار رام پور، فروری ۱۹۶۳ء)۔

۳۔ لطائف غیبی: ۳۵؛ درفش کاویانی: ۱۳۔ ۱۴

وہ زردشتی مذہب کے پیرو تھے۔ چونکہ زردشتیوں کا تمام مذہبی سرمایہ قدیم پارسی زبان میں ہے، اس لیے ان کا فارسی زبان کا فاضل ہونا چنداں تعجب کا مقام نہیں۔ اس کے علاوہ وہ عربی کے بھی عالم تھے اور انھوں نے مدتوں علمائے عرب و بغداد کی خدمت میں رہ کر علوم عربیہ حاصل کیے تھے[1]۔ ان کا پارسی مذہب ترک کر کے اسلام قبول کرنا بھی اسی پر دال ہے۔ بس گو یہ سچ ہے کہ میرزا کی فارسی دانی کا سنگِ بنیاد مولوی محمد معظم کے ہاتھوں رکھا گیا تھا، لیکن اس عمارت کی تکمیل ملا عبدالصمد کے چابک دست اور ماہر ہاتھوں سے ایسے شاندار طریقے پر ہوئی کہ وہ آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ ملا عبدالصمد نے ہندستان سے واپس جانے کے بعد بھی میرزا غالب سے خط و کتابت جاری رکھی[2]۔ مولانا حالی نے بھی لکھا ہے[3]:

> نواب مصطفٰے خان مرحوم کہتے تھے کہ ملا کے ایک خط میں جو اس نے مرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا، یہ فقرہ لکھا تھا: "اے عزیز! چہ کسی کہ با ایں ہمہ آزادیہا گاہ گاہ بخاطر می گذری۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا عبدالصمد کو اپنے شاگرد سے واقعی محبت تھی۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے ایسے ہونہار شاگرد کی تعلیم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا ہو گا۔ خود میرزا نے بھی اپنی کتابوں میں جہاں کہیں ان کا ذکر کیا ہے، وہاں نہایت ادب کے ساتھ، محبت بھرے الفاظ میں ان کی تعلیم و تربیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ قاطع برہان کا معرکہ اس امر کی بیّن شہادت ہے کہ میرزا نے ملا عبدالصمد کی تعلیم سے کس حد تک استفادہ کیا تھا۔ وہ نہ صرف خالص پارسی زبان اور

۱۔ تیغ تیز: ۱۳-۱۴؛ لطائفِ غیبی: ۳۵

۲۔ درفشِ کاویانی: ۱۸

۳۔ یادگار غالب، ۲۷

اس کی صرف و نحو بلکہ پارسی مذہب اور اس کے متعلقات پر بھی بہت حد تک حاوی ہو گئے تھے![1]

بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے دستور کے مطابق ان کی بسم اللہ بھی قرآن خوانی سے ہوئی تھی[2]۔ اور گمانِ غالب ہے کہ انھوں نے قرآنِ ناظرہ ختم کر لیا ہو گا۔ ان کے فارسی خطوں میں کہیں کہیں قرآنی آیات کے جو حوالے ملتے ہیں وہ اسی دور کی یادگار ہیں، ورنہ یوں ان کی عربی سے واقفیت بہت معمولی تھی اور مکتب میں انھوں نے صرف شرح مایۃ عامل تک پڑھا تھا[3]۔ وہ عربی میں آخر تک غلطیاں کرتے رہے[4]۔

میاں نظیر اکبر آبادی

بعض مصنّفین نے لکھا ہے کہ میرزا نظیر اکبر آبادی کے بھی شاگرد تھے۔ میرزا کے

۱۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے (مکاتیب غالب: ۴، ۱ (حواشی) میں اور اپنے مضمون "میرزا غالب کی تعلیم تحقیق و اجتہاد کے دوراہے پر" مطبوعہ رسالہ فاران (کراچی) ستمبر ۱۹۴۹ء میں اور جناب قاضی عبدالودود نے مضمون "غالب کا ایک فرضی استاد: عبدالصّمد" (علیگڑھ میگزین غالب نمبر ۱۹۴۹ء نیز احوالِ غالب) میں لکھا ہے کہ عبدالصّمد کوئی حقیقی شخصیت نہیں، بلکہ غالب کا زائیدۂ فکر ہے۔ مجھے اس نظریے سے اختلاف ہے (دیکھیے میرا مضمون "ملّا عبدالصّمد: استادِ غالب" مشمولۂ فسانۂ غالب)

۲۔ اس سلسلے میں، انھوں نے جو کچھ حقیر کو لکھا ہے، وہ بھی نظر میں رہے۔ دیکھیے خطوطِ غالب: ۲۱

۳۔ رسالہ ہندستانی الٰہ آباد (جنوری ۱۹۳۴ء)

خط بنام ڈاکٹر مولوی ضیاء الدین خاں؛ نیز علی گڑھ میگزین (غالب نمبر) بلاک

۴۔ ان کے عربی دعاء الصباح کے منظوم ترجمے سے ان کی عربی واقفیت سے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے۔ انھوں نے یہاں صرف فارسی نثر کا ترجمہ نظم میں کر دیا ہے اور نثری ترجمہ کسی اور کا ہے۔

بچپن کے زمانے میں آگرے میں نظیر کا مکتب ضرور تھا، لیکن میرے خیال میں روایت اور درایت دونوں پہلوؤں سے اُن کی نظیر کی شاگردی ثابت نہیں ہوتی۔
روایت کو لیا جائے، تو میرزا کا ایک ہمعصر تذکرہ نگار خوب چند ذکا (ف ۱۸۴۶ء) ہے، جس نے اپنے استاد شاہ نصیر کے کہنے پر تذکرہ "عیار الشعراء" مرتب کیا تھا۔ اس میں میرزا غالب کے حالات میں اس نے ان کی تعلیم سے متعلق صرف اتنا لکھا ہے: "شاگردِ مولوی محمد معظم"۔ اگر وہ نظیر کے بھی شاگرد ہوتے، تو یقیناً ذکا ان کا ذکر بھی کرتا۔

اب درایت کو لیجیے:
نظیر کی شاگردی کا ذکر سب سے پہلے حکیم غلام قطب الدین باطن نے اپنے تذکرے "گلستانِ بیخزاں المعروف بہ نغمۂ عندلیب" میں کیا اور ان کی نقل میں اوّل مولانا حسرت موہانی نے[1] اور پھر دبے لفظوں میں شیخ محمد اکرام نے غالب کو نظیر کا شاگرد قرار دیا۔ مگر جن حالات میں "گلستانِ بیخزاں" تالیف ہوا تھا، انھیں دیکھتے ہوئے یہ روایت حد درجہ مشکوک ہو جاتی ہے۔
۱۸۳۵ء میں نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ نے اپنا مشہور تذکرہ "گلشنِ بیخار" شائع کیا۔ اس میں، جہاں مومن، آزردہ، غالب اور دوسرے ہمعصر شاعروں کی بہت تعریف کی تھی، وہیں نظیر اکبر آبادی کا ذکر کچھ ایسے انداز سے کیا کہ نظیر کے دوستوں اور شاگردوں کو بہت ناگوار گزرا۔ نظیر خود تو فوت ہو چکے تھے، لیکن ان کے جوان سال صاحبزادے گلزار علی اسیر آگرے میں موجود تھے۔ انھوں نے باطن سے کہا کہ گلشنِ بیخار کا جواب لکھو۔ باطن پہلے نظیر سے اصلاح لیتے رہے تھے، اور ان کی وفات کے بعد اب اسیر سے مشورہ کرتے تھے۔ گویا استاد بھی اور

۱- شرح دیوانِ غالب (حسرت موہانی) دیباچہ۔
۲- حیاتِ غالب: ۲۰۔

استادزادہ بھی! انھوں نے سرِ تسلیم خم کیا اور یہ تذکرہ مرتب ہوا۔ اس میں انھوں نے تمام ان دہلوی شعرا کی دل کھول کر مخالفت کی، جن کی گلشنِ بیخار میں تعریف کی گئی تھی۔ مومن اور صاحب کے تعلق کا ذکر کیا؛ شیفتہ اور رجو کے لگاؤ کی داستان بیان کی؛ اور غالب کو نظیر کا شاگرد لکھ دیا۔ مقصود یہ تھا کہ شیفتہ جس نظیر کو سوقیت کا مظہر بتا رہے ہیں، وہ تو غالب کا استاد ہے۔ باپ کی تعریف کرنا اور دادا کو گالی دینا، یہ کہاں کا شیوۂ عقلمندی ہے! خود باطن کے الفاظ غمازی کر رہے ہیں کہ یہ دعویٰ محض شیفتہ کی مخالفت اور ان کے نظیر کے کلام پر اعتراض کے جواب میں وضع کیا گیا ہے، ورنہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

> غالب و اسد تخلص۔ اسد اللہ خان نام ملقب بمرزا نوشہ۔ آپ دو تخلص کرتے ہیں۔ کچھ تو سبب ہے کہ دو تخلص کرنے پر دل دھرتے ہیں۔۔۔
> ۔۔۔۔۔ اوستادانِ باشعور کے مثل خلیفہ معظم جو بڑے معظم و مکرم اور ہادی الشعرا (یعنی نظیر اکبر آبادی) جو بے نظیرِ روزگار تھے، جن سے تعلیم پائی۔ ایامِ صبا سے یہ برکت انفاس بتبرکہ اون استادوں کے برتبہ علم پہنچے۔ تب اون کی فکرِ رسا نے یہ صورت دکھائی۔ کیوں نہ خوشگو ہوں، جن کے ایسے استاد دو ہوں۔۔۔۔۔۔ چونکہ وہ اوستاد مر گئے، یہ جدّ دہلی (آگرہ) سے اودھر ہو گئے۔ اب خواہ شاگردی سے انکار کریں، یا شاید اقرار کریں۔

ذرا تیور ملاحظہ ہوں! آخر دو تخلص کرنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے اور اس پر اعتراض کیوں ہو؟ لیکن پہلے تو یہی غلط ہے کہ غالب ان کی وفات کے بعد دلّی آئے۔ مولوی محمد معظم کی تاریخِ وفات تحقیق نہیں ہو سکی، لیکن نظیر نے یقیناً ۱۸۳۰ء

ے گلستانِ بیخزاں: ۱۷۱

یں رحلت کی۔ غالب اس سے بہت پہلے ۱۸۱۲۔۱۸۱۳ء کے لگ بھگ دلی چلے آتے تھے۔ پھر آخری الفاظ "اب خواہ شاگردی سے انکار کریں یا شاید اقرار کریں" خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ یہ باطن کے دل کا چور ہے، جو ان سے چھپ نہ ہو سکا۔ صاف ظاہر ہے کہ انھیں خود اپنے کہے کا یقین نہیں۔ اگر نظیر کی شاگردی مسلّم تھی، تو غالب انکار کیوں کرنے لگے تھے!

لیکن اصولاً نظیر کی شاگردی پر کوئی اعتراض بھی نہیں۔ جیسا کہ مولانا حالی نے لکھا ہے[1]:

> اگر بالفرض بچپن میں غالب نے نظیر کے مکتب میں تعلیم پائی ہو تو کوئی تعجب بھی نہیں۔ اس سے نظیر کی عزّت زیادہ ہوتی ہے، اور میرزا کی عزّت کم نہیں ہوتی۔

لیکن ان سب استادوں سے زیادہ جس چیز نے غالب پر اثر کیا، وہ ان کا ماحول تھا۔ میرزا کا بچپن آگرے کے جس محلّے میں گزرا، یہ گلاب خانہ کہلاتا ہے۔ اس زمانے میں گویا یہ فارسی زبان کا مرکز تھا۔ مثنوی مولانا روم کے شارح ملّا ولی محمد اسی محلّے میں رہتے تھے۔ مولوی شمس الضحیٰ اور مولوی بدر الدجیٰ دونوں انھیں کے بیٹے تھے۔ میر اعظم علی اعظم، مدرّس مدرسۂ اکبرآباد انھیں کے نواسے ہوتے تھے۔ اعظم نے سکندر نامۂ نظامی کا ترجمہ کیا تھا؛ خود بھی ایک مثنوی اکسیرِ اعظم فارسی میں لکھی۔ اعظم غالب کے بچپن کے دوست تھے[2]۔ اسی محلّے میں مولوی محمد معظم کے علاوہ مولوی محمد کامل کا بھی مکتب تھا۔

میرزا کے نانا خواجہ غلام حسین خان اسی محلّے میں مقیم تھے اور وہ یہاں کے سربرآوردہ لوگوں میں سے تھے۔ قریب بہ یقین ہے کہ اس زمانے کے دستور

۱۔ زندگانیٔ بے نظیر (پروفیسر شہباز): ۱۹۹

۲۔ پنج آہنگ میں ایک خط ان کے نام موجود ہے۔ دیکھیے کلیاتِ نثر (غالب): ۱۰۲-۱۰۴

کے مطابق یہ اہلِ علم وفن ان کے مکان پر اکثر اور باقاعدہ جمع ہوتے ہوں ۔ میرزا کی حسّاس طبیعت پر ان مجلسوں کا جو اثر ہوا ہوگا ، اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے ۔

غرض کہ یہ ماحول سراسر علمی تھا اور ایک ذہین اور طبّاع اور تیز فہم آدمی اس سے جو کچھ حاصل کرسکتا تھا وہ غالب کے حصّے میں بھی آیا ۔ انھوں نے ان اصحاب کی صحبت سے جو استفادہ کیا اور اس پر اپنی محنت سے جو اضافہ کیا ، اس کا ثبوت ان کے اردو اور فارسی کلام سے ملتا ہے ، جس میں ہیئت ، نجوم ، منطق ، فلسفہ ، طب ، موسیقی ، تصوّف ، مذہب وغیرہ علوم کی اصطلاحیں کثرت سے استعمال ہوئی ہیں ۔ ناممکن ہے کہ یہ سب کچھ انھوں نے اس چھوٹی سی عمر میں مولوی محمد معظّم کے مکتب میں حاصل کرلیا ہو ۔ ماننا پڑیگا کہ یہ لازماً ان کے اپنے ذاتی مطالعے اور ریاض ، اور ملّا عبدالصمد کی تعلیم کا نتیجہ تھا ۔

شاعری کی ابتدا

ابھی وہ مولوی محمد معظّم کے مکتب میں پڑھتے تھے ، اور ان کی عمر دس گیارہ برس سے زیادہ نہیں تھی کہ انھوں نے شعر کہنا شروع کیا ۔ اگرچہ اس زمانے کی ایک فارسی غزل کا بھی پتہ چلتا ہے[1] ، مگر شروع میں ان کی توجہ زیادہ تر اردو ہی کی طرف رہی اور وہ بھی بیدل ، اسیر اور شوکت کے رنگ میں ۔ ۱۹ ۔ ۲۰ برس کی عمر تک تقریباً دو ہزار شعر کا ایک دیوان تیار ہو گیا ۔ اگر یہی روش رہتی تو ان کی ادبی موت میں کسے شبہہ ہوسکتا تھا ، لیکن غنیمت ہے کہ ان کی خداداد صلاحیّت نے ان کی رہنمائی کی ۔ انھوں نے یہ راہ ترک کردی اور اس دیوان کو بھی نظری کردیا ۔ اس طرح گویا انھوں نے میر تقی میرؔ کی پیشگوئی[2] پوری کردی کہ

---

۱ ۔ یادگارِ غالب : ۱۲۱ (دیکھیے اوپر : ۳۴)

۲ ۔ یادگارِ غالب : ۱۲۳

"اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا" اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا، تو لاجواب شاعر بن جائیگا، ورنہ مہمل بکنے لگیگا"۔ یہ کامل استاد ان کی اپنی طبع سلیم تھی، یا بعض مخلص سخن فہم دوستوں کا مشورہ، ورنہ شاعری میں وہ صحیح معنوں میں تلمیذ الرحمٰن تھے اور کسی کی شاگردی کا بارِ احسان ان کے سر پر نہیں[1]۔

مولانا حالی کا بیان[2] ہے کہ معتمد الدولہ نواب حسام الدین حیدر خان نامی (شاگردِ میر مستحسن خلیق و میر تقی میر) نے غالب کی غزل میر کو دکھائی، تو انھوں نے مندرجہ بالا رائے ظاہر کی۔ یہاں غور کے قابل بات یہ ہے کہ میر کی وفات ۲۰ستمبر ۱۸۱۰ء (۲۰۔ شعبان ۱۲۲۵ھ) کو ہوئی تھی[3]۔ اور یہ معلوم ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری دو تین برس میں لکھنؤ سے باہر کہیں نہیں گئے۔ پس ظاہر ہے کہ نواب حسام الدین حیدر خان نے لکھنؤ ہی میں انھیں غالب کی کوئی غزل دکھائی ہوگی، جس پر انھوں نے اس رائے کا اظہار کیا۔ میر کی وفات کے وقت غالب کی عمر تیرہ برس سے کم کی تھی۔ انھوں نے دس گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تھا، دوسرے لفظوں میں اس وقت ان کی شاعری کی عمر یہی دو ڈھائی سال کی رہی ہوگی۔ اتنی کم عمر کے ایک لڑکے کا کلام، ایک شہر سے دوسرے شہر لے جانا، بجائے خود حیرتناک بات ہے، اور پھر اسے شاعری کے مرکز لکھنؤ میں لے جاکر خدائے سخن میر کے سامنے رائے کے لیے پیش کر دینا، تو اس سے بھی زیادہ حیرتناک بات ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، اس نہایت ابتدائی زمانے میں بھی ایسے اربابِ نظر کی کمی نہیں تھی، جو میرزا کے کلام کو استعجاب اور وقعت کی نگاہ سے

۱۔ کلیاتِ نثر: ۱۵۵ (بنام مولوی سراج الدین احمد)

۲۔ یادگارِ غالب: ۱۲۳ (حاشیہ)

۳۔ اردو، جنوری ۱۹۲۸ء: ۷

دیکھتے اور اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ بطور تحفہ لے جانے کے قابل سمجھتے تھے۔*

* مولانا غلام رسول مہر نے اپنے مضمون "میرزا غالب اور میر تقی میر" (ماہِ نو کراچی، فروری ۱۹۴۹ء) میں اس روایت کی صحت سے انکار کیا ہے۔ ان کے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ (۱) اس کم عمری میں میرزا کا کلام آگرے سے لکھنؤ پہنچا کیسے؟ اور اسے وہاں کون لے گیا؟ اور اس کی ضرورت ہی کیوں محسوس ہوئی؟ اور (۲) میر اپنی عمر کے آخری دو تین برس مختل الحواس رہے اور چونکہ ان کے یہ ایام بہت "وارفتگیِ حواس اور ہجومِ امراض" میں گزرے، اس لیے وہ کوئی ایسی رائے ظاہر کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ یہ استدلال حد درجہ کمزور ہے۔ اوّلاً یہ کس نے کہا کہ کلام آگرے سے گیا تھا! میرزا کے تعلقات نواب احمد بخش خان کے خاندان سے معلوم ہی ہیں۔ وہ سات برس کی عمر سے یہاں آتے جاتے رہے اور ان ایام میں وہ لازماً نواب صاحب ہی کے یہاں ٹھہرتے ہونگے۔ نواب صاحب کے چھوٹے بھائی الٰہی بخش خان معروف بہت اچھے شاعر تھے۔ نا ممکن ہے کہ انھوں نے میرزا کا یہ ابتدائی کلام نہ سنا ہو۔ نواب حسام الدین حیدر خان نامی اور معروف کے "گہرے دوستانہ تعلقات" خود مہر صاحب کو تسلیم ہیں؛ اور ان سے بڑھ کر مولانا محمد حسین آزاد نے دونوں کی باہم محبت اور عشق سے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کے لیے آبِ حیات (ص ۵۵۸ - ۵۵۹) دیکھی جاسکتی ہے۔ نامی نے میرزا کا کلام یہیں، دلّی میں خود میرزا سے لیا یا معروف سے، اور اس کی "ندرت و غرابت" کے پیشِ نظر اسے لے جا کے لکھنؤ میں اپنے استاد میر کو دکھایا کہ دیکھیے حضرت ایک بارہ تیرہ برس کا لڑکا ایسے شعر کہتا ہے!

پھر میر لاکھ پریشان حال اور وارفتہ اور بیمار رہے ہوں، لیکن اتنے بھی نہیں کہ وہ شعر سننے اور ان سے متعلق مختصر طور پر اپنی رائے تک کے اظہار کے قابل نہ رہے ہوں۔ وہ کوئی مفصل تنقیدی مضمون تو لکھ نہیں رہے تھے کہ انھیں خیالات مجتمع کر کے کافی وقت تک یکسوئی اور اطمینان سے ایک جگہ بیٹھنے کی ضرورت ہوتی۔ انھوں نے نامی سے کچھ شعر سنے اور ایک آدھ فقرے میں اپنی رائے ظاہر کردی۔ میرے نزدیک تو اس فقرے پر بھی میر کی مخصوص چھاپ لگی ہوئی ہے۔

شادی اور دلّی میں آمد

خاندانِ لوہارو سے غالب کے تعلقات کی طرف سرسری اشارہ پہلے سے بھی ہو چکا ہے، مگر ۱۲۲۵ھ میں ان تعلقات کی استواری کی ایک اور تقریب پیدا ہوئی۔ اس سال ۷ رجب (۹ اگست ۱۸۱۰ء) کو پورے تیرہ برس کی عمر میں غالب کی شادی نواب احمد بخش خان کے چھوٹے بھائی الٰہی بخش خان معروف کی گیارہ سالہ صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہو گئی[1]۔ اگرچہ ان کا دلّی میں آنا جانا سات برس کی عمر سے تھا، مگر شادی کے دو تین سال بعد انھوں نے یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی، جسے وہ ایک جگہ یوں تعبیر کرتے ہیں[2]:

> ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکمِ دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی (یعنی بیوی) میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔

دوسری جگہ بھی نواب علاؤ الدین احمد خاں ہی کو لکھتے ہیں[3]:

> اے میری جان، یہ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم شعبان

۱۔ اس کے بعد معروف کے صاحبزادے میرزا علی بخش خان کی دوسری شادی غالب کی بھانجی امانی خانم سے ہوئی تھی۔ انھوں نے کلیاتِ نثر (غالب) کے دیباچے میں لکھا ہے کہ "درمیانِ ایں نحیف و آں سخنورِ یکتا (غالب) از دو سو پیوندِ قرابت استوار است" تو یہاں انھی دونوں رشتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

۲۔ اردوے معلّٰی: ۲۹۵ (بنام نواب علاء الدین احمد خاں)؛ خطوطِ غالب (۱): ۳۷۴۔

۳۔ اردوے معلّٰی: ۳۱۰، خطوطِ غالب (۱): ۳۸۳

بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔

اس خط پر ۱۸۶۲ء کی تاریخ ثبت[1] ہے۔ گویا میرزا اکیاون برس پہلے ۱۸۱۲-۱۸۱۳ء میں آگرے سے دلّی چلے آئے تھے اور صحیح بھی یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ انھوں نے دوسری جگہ صاف لکھا ہے کہ ملا عبد الصمد ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۰-۱۸۱۱ء) میں وارد اکبر آباد ہوئے اور میں نے انھیں دو برس اپنے یہاں مہمان رکھا[2]۔ وہ ملا عبد الصمد کو آگرے سے ساتھ لے کر دلّی آئے اور تکمیلِ تعلیم کے بعد انھیں یہیں سے ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۲-۱۸۱۳ء) میں رخصت کیا[3]۔ اگرچہ ان کی بعض تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پھر بھی کبھی کبھی آگرے جاتے آتے رہے لیکن اس کے بعد ان کی مستقل سکونت دلّی ہی میں رہی۔

قیامِ دلّی کا اثر

دلّی میں وہ اپنے علیحدہ مکان میں رہے مگر ظاہر ہے کہ اگر نواب احمد بخش خان اور میرزا الٰہی بخش خان کی عزیز داری نے ان کا حلقۂ احباب وسیع کر دیا تھا، تو یہ احباب بھی اونچے طبقے کے لوگ ہونگے۔ میرزا الٰہی بخش خان معروف جہاں کہنہ مشق اور قادر الکلام سخنور تھے، وہیں صاحبِ حال وقال فقیر اور صوفی بھی۔ غالب جب بھی ان کے ہاں کسی مجلس میں شریک ہوتے ہونگے، وہاں ان کے کان میں یا شعر و

۱- اردوے معلّی میں یہاں ۱۸۶۳ء لکھی ہے۔ یہ کتابت کی غلطی ہے، صحیح ۱۸۶۲ء ہے جیسا کہ خطوطِ غالب (۱) میں بھی ہے۔

۲- درفشِ کاویانی: ۱۳۰

۳- یادگارِ غالب (حالی): ۲۶

سخن کی بات پڑی ہو گی! یا مذہب و تصوّف کی شعر و شاعری کی چیٹک انھیں پہلے ہی سے تھی۔ یہاں تصوّف کا بھی، کم از کم نظریے ہی کی حد تک، کچھ علم ہوا، جس سے متعلق شیخ علی حزیں نے کہا ہے کہ "برائے شعر گفتن خوب است"۔ پس، اگرچہ یہ ماحول ان کے شاعرانہ مذاق کے خلاف تو نہیں تھا، لیکن اس میں اتنی صلاحیت بھی نہیں تھی کہ شاعری میں جو غلط راستہ وہ قیامِ آگرہ کے زمانے میں اختیار کر چکے تھے، اس سے انھیں ہٹا دیتا۔ مگر قدرت کو یہ بھی منظور نہیں تھا کہ یہ گوہرِ گرانمایہ یوں ضائع ہو جائے۔ یہاں دلّی میں ان کی ملاقات مولوی فضلِ حق خیرآبادی سے ہوئی اور رفتہ رفتہ دونوں کے تعلقات نہایت گہرے اور دوستانہ ہو گئے۔ مولوی صاحب موصوف آخری دور کے فاضلِ اجل اور امامِ معقولات ہونے کے علاوہ، شعر و سخن کا بھی نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے غالب کو ان کی بیراہ روی پر متنبہ کیا۔[1] خوش قسمتی سمجھیے کہ غالب کے دل میں ان کی عزّت اور وقعت تھی اور وہ ان کے خلوص اور پایۂ سخن سنجی کو مانتے تھے۔ ورنہ کیا بعید تھا کہ جیسے انھوں نے اس سے پیشتر اکثر لوگوں کی نکتہ چینی کی پروا نہیں کی تھی، اسی طرح ان کی بات کو بھی قابلِ توجہ نہ سمجھتے۔

نوجوانی کی رنگ رلیاں

میرزا کی عمر نو برس سے کم تھی، جب ان کے چچا کا انتقال ہوا ہے۔ گویا اس کے بعد سر پر کوئی ایسا شخص نہ رہا، جو ان کی غور و پرداخت میں دلچسپی لیتا۔ وہ اپنی والدہ کے پاس نانھیال ہی میں رہتے تھے اور وہی ان کے خرچ وغیرہ کی کفیل تھیں۔ ان کے نانا میرزا غلام حسین خان اگرچہ ان کی جوانی تک زندہ رہے[2] مگر معلوم ہوتا ہے

۱- یادگارِ غالب: ۱۲۷

۲- اردوے معلّیٰ: ۴۲۶؛ خطوطِ غالب (۱): ۴۲۳

کہ انھوں نے بھی نواسے سے کبھی باز پرس نہیں کی۔ روپے پیسے کی افراط اور آزادی، اس پر جوانی دیوانی۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں اگر غالب بھی اپنے زمانے کے رئیسوں کی عام روش کے مطابق راہِ راست سے بھٹک گئے اور لہو و لعب میں پڑ گئے، تو کچھ تعجب کا مقام نہیں۔ تعجب تو جب ہوتا اگر اتنی آزمائشوں کے ہوتے ہوئے بھی، وہ دامن بچا کر صاف نکل جاتے۔

ڈومنی

انھوں نے اس زمانے کی رنگ رلیوں کی طرف اپنی تحریروں میں کئی جگہ اشارہ کیا ہے۔ کہیں فرومایوں اور اوباشوں کی ہم نشینی کا ذکر ہے، تو کہیں "فسق و فجور اور عیش و عشرت میں انہماک" کا۔ ایک خط میں "شور سودائے پری چہرگان" کا افسانہ ہے، تو دوسرے میں "ستم پیشہ ڈومنی" کا۔

ایک تعزیتی خط میں میرزا حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں[۲]

> شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہمطرحی نصیب ہووے۔ لیلیٰ اوس کے سامنے مری تھی، تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری، بلکہ تم اوس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں، اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری۔ بھئی! مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں، اوس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان

---

[۲] اردوئے معلیٰ: ۱۸۸؛ خطوطِ غالب: ۳۶۳

دونوں کو بخشے؛ اور ہم تم دونوں کو بھی، کہ زخمِ مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔[1]

یہ خط انھوں نے مہر کی معشوقہ کی وفات پر لکھا تھا۔ جب اس کے بعد دوبارہ مہر نے جزع فزع کا اظہار کیا، تو میرزا نے پھر لکھا:

آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ؛ اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو، تو چُنّا جان نہ سہی، مُنّا جان سہی۔

اس عبارت میں چُنّا جان عَلَم ہے اور نام ہے مہر کی محبوبہ کا، جس کی وفات پر یہ خط لکھے گئے تھے۔ چُنّا جان کا انتقال ۳۱ مئی ۱۸۶۰ء (۹ ذیقعدہ ۱۲۷۶ھ) کو ہوا تھا۔[2] ظاہر ہے کہ یہ دونوں خط اس حادثے کے بالکل قریبی زمانے میں لکھے گئے ہوں گے۔

اوپر جس خط کا اقتباس دیا گیا ہے، اس میں لکھتے ہیں کہ "چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے" کہ "ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے" اس صورت میں یہ واقعہ لگ بھگ ۱۸۱۸ - ۱۸۲۰ء کا ہونا چاہیے، جب کہ ان کی عمر ۲۲-۲۳ برس کی رہی ہو گی۔

میرزا کی ایک مشہور غزل ہے، جس کا مطلع ہے ؎

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری، ہائے ہائے!
کیا ہوئی ظالم! تری غفلت شعاری، ہائے ہائے!

جیسا کہ نظم طباطبائی نے بھی لکھا ہے،[3] "یہ ساری غزل معشوق کا مرثیہ ہے۔" چوں کہ یہ

۱۔ اردوے معلّیٰ: ۱۹۰؛ خطوط غالب (۱): ۳۶۴

۲۔ "بیان بخشایش" از میرزا حاتم علی بیگ مہر بحوالۂ مضمون "چُنّا جان" از سید مسعود حسن رضوی ادیب (ماہِ نو، فروری ۱۹۴۹ء: ۱۲-۱۳)

۳۔ شرح دیوانِ اردوے غالب: ۱۴۰

غزل "نسخۂ حمیدیہ" کے متن میں شامل ہے، اس لیے یقیناً ۱۸۲۱ء سے پیشتر کا کلام ہے[1]۔ جو اس نسخے کی تاریخ کتابت ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ اسی ستم پیشہ ڈومنی کا مرثیہ ہو۔

میرزا کے زمانے کی جو فضا تھی، اس میں "رنڈی" کا وہ مفہوم نہیں تھا، جو بعد کو اس لفظ کا لازمہ سا بن گیا۔ تاہم میرا خیال ہے کہ یہ "ڈومنی"، کوئی "رنڈی" نہیں تھی۔ اسی غزل میں ایک شعر ہے:

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر، پردہ داری ہائے ہائے!

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی بازاری عورت نہیں تھی۔ ورنہ کہاں کی "شرمِ رسوائی" اور کہاں کی "پردہ داریِ الفت"!! اس شعر سے یہ بھی گمان گزرتا ہے کہ شاید اس نے خودکشی کر لی تھی۔

میرزا کی زندگی کے اس دور میں ان پر جو ہیجانی کیفیت طاری تھی، اس میں کچھ بعید نہیں، اگر ان کے تعلقات "اربابِ نشاط" کے طبقے سے بھی رہے ہوں۔ لیکن اس بارے میں، جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے[2]، ان کا نظریہ مصری کی مکھی کا تھا، نہ کہ شہد کی مکھی کا۔ یعنی انھوں نے مرض کو مزمن صورت نہیں اختیار کرنے دی اور سارا معاملہ دل لگی کی حد سے آگے نہیں بڑھنے پایا۔ بارے، رندی اور سیہ مستی کی یہ گھنگور گھٹائیں ۲۴ - ۲۵ برس کی عمر سے پہلے ہی پہلے موسلا دھار برس کے

۱۔ اور ضمناً یہ بھی کہ یہ ان کے خود نوشت دیوان (مکتوبہ ۱۲۳۱ھ / ۱۸۱۶ء) کے بعد کی ہے، چونکہ یہ اس کے حاشیے پر بعد کو اضافہ ہوئی تھی۔

۲۔ اردوے معلیٰ: ۱۹۰؛ خطوطِ غالب (۱): ۳۶۳

چھٹ گئیں، اور وہ جلد ہی راہِ راست پر آ گئے۔

اخلاقی اصلاح۔

اگر مولوی فضل حق اور ان کے رفقار کی صحبت کا صرف اتنا ہی اثر ہوا ہوتا کہ وہ شاعری میں اپنی پہلی غلط روش چھوڑ کر ایک معتدل راہ پر آ گئے، تو یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں تھی، لیکن اس سے بھی زیادہ قابلِ قدر کام ان کی اخلاقی اصلاح کا ہوا۔ ان کی اس زمانے کی اخلاقی حالت کا ذکر ہو ہی چکا ہے۔ اگر وہ اسی ڈگر پر قائم رہے ہوتے، تو آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے دل و دماغ کا کیا حشر ہوتا۔ بارے شکر ہے کچھ معروف کی عزیز داری اور بہت حد تک مولوی صاحب موصوف اور اسی وضع کے دوسرے احباب کی دینداری کا یہ اثر ہوا کہ وہ سنبھل گئے۔

اس زمانے میں دلّی ایک بہت بڑے مذہبی بحث مباحثے کا میدان بنی ہوئی تھی۔ شاہ اسمٰعیل شہید رح اور سید احمد بریلوی "وہابیت" اور عدمِ تقلید کے اصول کے علمبردار تھے اور مولوی فضل حق حامیانِ تقلید کے قافلہ سالار۔ پوری دلّی ان دو دھڑوں میں منقسم ہو گئی۔ غالب بھی اس ہنگامے کی لپیٹ سے نہ بچ سکے۔ چونکہ مولوی فضل حق ان کے عزیز دوست تھے، اس لیے انھیں مجبوراً ان کا ساتھ دینا پڑا؛ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں ان کا نقطۂ نظر دوسرے فریق کے اصولوں سے زیادہ قریب تھا۔ انھوں نے مولوی صاحب کے کہنے پر ایک فارسی مثنوی بھی "امتناعِ نظیرِ خاتم النبیین" کے نظریے سے متعلق لکھی۔[1] اوّل اوّل اس میں بھی انھوں نے اپنی فطری سلامت روی کے اقتضا

---

[1] یہ ہنگامہ اس طرح شروع ہوا کہ مولوی شاہ محمد اسمٰعیل رح نے اپنی مشہور کتاب "تقویت الایمان" میں، جو شرک کے رد میں ہے اور جس میں شرک کی مختلف اقسام کا بیان ہے، یہ فرمایا کہ خدا کی یہ "شان ہے کہ ایک آن میں ایک حکم کن سے چاہے، تو کروڑوں نبی و ولی ...... اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر پیدا کر ڈالے۔" (ص ۲۲) مولانا فضل حق خیرآبادی ان دنوں دلّی میں ناظرِ دیوانی تھے۔ انھوں نے اعتراض کیا کہ یہ اللہ تعالیٰ اور رسولِ کریم پر افترا ہے

(باقی ص ۵۰ پر)

سے وہی کچھ لکھا جو اصولاً صحیح تھا، مگر وقتی مصلحتیں دائمی صداقت پر غالب آئیں اور بعد کو مولوی صاحب کے کہنے پر انھیں اس میں رد و بدل کرنا پڑا![1]

ان تمام باتوں کا یہ اثر ہوا کہ غالب نے اپنی آزادانہ زندگی ترک کر دی۔ اگرچہ وہ اب بھی کبھی کبھی "روزِ ابر" اور "شبِ ماہتاب" میں شراب تو پی لیتے تھے اور آخر تک پیتے رہے مگر اب پہلا سا وہ غیر معتدل طریقہ موقوف ہو گیا۔ ان میں مذہبیت کا عنصر پیدا ہو گیا۔ اس سے پہلے ان کی مہر پر کندہ تھا: "اسد اللہ خان عرف میرزا نوشہ"، مگر اب جو نئی مہر انھوں نے ۱۲۳۰ھ میں تیار کروائی، اس میں کندہ ہے: "محمد اسد اللہ خان"۔ یہ دونوں مہریں جس عظیم الشان ذہنی انقلاب کی شاہد ہیں، اس کی تشریح الفاظ میں نہیں کی جا سکتی۔[2]

مالی پریشانیوں کا آغاز

غالب جب تک آگرے میں رہے، انھیں خرچ کی طرف سے کوئی تنگی نہیں ہوئی۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ روپے پیسے کی افراط تھی۔ اس لیے انھیں اپنے

شاہد و شمع و شراب و ذکر و نائے و سرود

کے ذوق کی تسکین کے لیے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ پھر جب دلی آئے، تو

(صفحہ ۴۹ کا بقیہ) ہے۔ شاہ محمد اسمٰعیل نے قرآن کی آیت سے جواب دیا:

اَوَلَيْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰی وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ (یٰس، ۳۶: ۸۱)	کیا وہ ذات جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اس پر قادر نہیں کہ ان کی مانند کوئی اور پیدا کر سکے؟ کیوں نہیں؛ وہ سب سے بڑا پیدا کرنے والا اور جاننے والا ہے۔

۱۔ یادگارِ غالب: ۹۰-۹۲۔ یہ کلیاتِ نظم فارسی کی چھٹی مثنوی ہے اور اس کا عنوان ہے: "بیانِ نموداریِ شانِ نبوت و ولایت کہ در حقیقت پرتوِ نور الانوارِ حضرتِ الوہیت است"

۲۔ غالب نے اپنی عمر میں چھ مہریں بنوائیں: (۱) اسد اللہ خان عرف میرزا نوشہ (۲) اسد اللہ الغالب (۳) محمد اسد اللہ خان (۴) نجم الدولہ دبیر الملک، نظام جنگ (۵) یا اسد اللہ الغالب (۶) غالب۔ تفصیل کے لیے دیکھیے میرا مضمون: "غالب کی مہریں" (مشمولہ فسانۂ غالب)

یہاں بھی چندے یہی رنگ رہا۔ ساڑھے سات سو انگریزی پنشن کے نواب احمد بخش خان سے ملتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی وہ سلوک کرتے رہتے تھے۔ الور سے بھی کچھ نہ کچھ یافت ہو جاتی تھی۔ والدہ زندہ تھیں، وہ بھی گاہے ماہے آگرے سے بھیجتی رہتی تھیں۔ لیکن یہ صورت حال جلد ہی بدل گئی۔

نواب احمد بخش خان نے ۲۶ اکتوبر ۱۸۲۲ء کو سرکار انگریزی اور الور دربار کی منظوری اور اپنے خاندان اور متعلقین کی رضامندی سے فیصلہ کیا کہ ان کے بعد گدّی پر ان کے بڑے بیٹے شمس الدین احمد خان بیٹھیں، جو ان کی میواتی حرم مُدّی عرف بہو خانم کے بطن سے تھے، البتہ لوہارو جاگیر کی آمدنی دونوں چھوٹے صاحبزادوں، امین الدین احمد خان اور ضیاء الدین احمد خان کو ملتی رہے، جو ان کی ہم کفو بیاہتا بیوی بیگم جان[1] کی اولاد تھے۔ چونکہ بھائیوں میں آپس میں کشمکش تھی اور خاندان کے دوسرے افراد بھی شمس الدین احمد خان کو پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے نواب احمد بخش خان ڈرے کہ کہیں ایسا نہ ہو میری موت کے بعد جھگڑا کھڑا ہو جائے، اور شمس الدین احمد خان وصیت کی خلاف ورزی کرکے اپنے چھوٹے بھائیوں کا حق غصب کر لے، اس لیے انھوں نے مناسب خیال کیا کہ اس فیصلے پر عمل درآمد ان کی زندگی ہی میں شروع ہو جائے۔ چنانچہ ۱۳ اکتوبر ۱۸۲۶ء کو وہ خود ریاست کے انتظام سے دست بردار ہو کر گوشہ نشین ہو گئے، اور شمس الدین احمد خان فیروز پور جھرکہ کے نواب تسلیم کر لیے گئے[2]۔

اس نئے انتظام کا غالب کے معاملات پر بہت گہرا اثر پڑا۔ آیندہ کے لیے ان کی پنشن

۱۔ بیگم جان صاحبزادی تھیں نیاز محمد بیگ کی۔ بعد کو ان کے خاندان کو لوہارو میں کپتان فیملی کا نام دیا گیا تھا کیونکہ بیگم جان کے بھائی نذر محمد بیگ لوہارو فوج میں کپتان کے عہدے پر فائز رہے تھے۔ بیگم جان کا انتقال ۴ نومبر ۱۸۶۶ء کو ہوا۔ (اردوئے معلی: ۲۸۹۔ (بنام نواب امین الدین احمد خان) نیز دیکھیے دستاویز فنانس، مارچ ۱۸۶۸ء (۶-۹)

۲۔ پولیٹیکل، ۵ ستمبر ۱۸۳۳ء (۹۲)

نواب شمس الدین احمد خان سے متعلق ہوگئی۔ اور چونکہ غالب کے تعلقات نواب کے دونوں چھوٹے بھائیوں سے تھے، جنھیں وہ اپنا مخالف خیال کرتے تھے، اس لیے اس کی ادائی میں طرح طرح کے روڑے اٹکائے جانے لگے۔ جب انگریزی منظور شدہ پنشن کا یہ حال ہو، تو ان فتوحات کا کیا ذکر، جو وقتاً فوقتاً نواب احمد بخش خان کی ذاتی صوابدید اور سفارش پر ملا کرتی تھیں، انھیں تو بند ہونا ہی تھا۔ قرضخواہوں نے یہ مخالف حالات دیکھے، تو غالب سے اپنا روپیہ واپس مانگا اور تقاضوں سے ناک میں دم کر دیا۔ مصیبت بالائے مصیبت، غالب کے چھوٹے بھائی میرزا یوسف انھیں دنوں اٹھائیس برس کی عمر میں دیوانے ہو گئے۔ قدرتاً غالب جنھوں نے آج تک تنگی اور پریشانی کا ایک دن نہیں دیکھا تھا مصیبتوں کی اس یکبارگی یلغار سے گھبرا اٹھے۔[1]

پنشن کا قضیّہ

غالب نے آج تک پنشن کی تقسیم کے خلاف کوئی عملی احتجاج نہیں کیا تھا، حال آں کہ انھیں پانچ ہزار کی رقم میں سے صرف ساڑھے سات سو سالانہ ملتے تھے۔ چونکہ نواب احمد بخش خان خود بھی کچھ نہ کچھ دیتے رہتے تھے اور انھیں کے ذریعے سے اِدھر اُدھر سے بھی ملتا رہتا تھا، اس لیے انھیں کبھی اس رقم کی قلّت کا احساس نہیں ہوا، اور وہ خاموش رہے۔ لیکن میرے خیال میں ان کی خموشی کا اس کے علاوہ ایک اور سبب بھی ہو سکتا ہے۔ نواب احمد بخش خان کے چھوٹے بھائی، الٰہی بخش خان معروف، میرزا کے خسرِ بزرگوار تھے۔ پس اگر وہ نواب احمد بخش خان کے خلاف کوئی اقدام کرتے، یا ان سے جھگڑا ہو جاتا، تو یہ یقیناً معروف کی ناخوشی کا باعث ہوتا۔ گویا ایک کا ادب اور لحاظ، دوسرے سے مصالحت کا سبب بن گیا۔

۱۸۲۶ء (۱۲۴۲ھ) میں معروف کا انتقال ہو گیا۔[2] اور یوں وہ روک درمیان

۱۔ کلیاتِ نثر (غالب): ۱۰۳

۲۔ گلشنِ بیخار: ۱۸۴

سے ہٹ گئی۔ اس سے شاید ایک ہی برس پہلے خواجہ حاجی نے وفات پائی تھی۔ یہ وہی

؎ میرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کا دعویٰ ہے کہ خواجہ حاجی غالب کے جدِّ اعلیٰ ترسم خان کے چھوٹے بھائی اور بقول خواجہ قمرالدین خان راقم چچیرے بھائی (احوالِ غالب: ۳۰) رستم خان کی اولاد میں سے تھے یعنی تین چار پشت اوپر غالب اور خواجہ حاجی کا سلسلۂ نسب مل جاتا ہے۔ خدا معلوم حقیقت کیا ہے، لیکن ان کے بیان کے علاوہ کوئی اور شہادت اس کے ثبوت میں ہمارے پاس موجود نہیں۔ خود غالب اس سے انکاری ہیں اور کہتے ہیں کہ خواجہ حاجی کا باپ خواجہ میرزا پانچ روپے مشاہرے پر میرے دادا توقان بیگ خان کا سائیس تھا اور اس کی اولاد دو پشت سے ہماری خانہ زاد اور تین پشت سے نمک خوار ہے (متفرقات غالب: ۶)۔ گو یہ انہوں نے جل کے لکھا ہے، تاہم اس میں اتنی صداقت ضرور ہے کہ خواجہ حاجی کے والد خواجہ میرزا (؟ قطب الدین) میرزا کے دادا توقان بیگ خان کے ملازم رہے اور انھیں کے ساتھ ہندستان آئے تھے لیکن دور کی رشتہ داری بھی ضرور تھی، مثلاً میرزا توقان بیگ خان کی ایک بیوی کی بھانجی خواجہ میرزا کے عقدِ نکاح میں تھی اور خواجہ حاجی اسی کے بطن سے تھے۔ (فارن (متفرق) نمبر ۲۰۸، ص ۱۴، انڈیا آفس، ص ۴۶، ۴۴، نیز فسانۂ غالب) پھر اس میں بھی شبہہ نہیں کہ خواجہ حاجی کی شادی انہی میرزا جیون بیگ کی صاحبزادی امیر النساء بیگم سے ہوئی تھی، جن کے ایک صاحبزادے میرزا اکبر بیگ سے غالب کی ہمشیر (یعنی میرزا نصر اللہ بیگ خان کی بھتیجی) چھوٹی خانم منسوب تھیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی درست ہے کہ خواجہ حاجی چار سو سواروں کے اس رسالے میں ایک افسر تھے (اور ان کے علاوہ دو افسر اور تھے) جو میرزا نصر اللہ بیگ خان کے ماتحت تھے۔ میرزا نصر اللہ بیگ خان کی وفات پر جب یہ رسالہ ٹوٹا اور اس میں سے صرف پچاس سوار نواب احمد بخش خان کو دیے گئے، تو انھوں نے خواجہ حاجی ہی کو ان سواروں کا افسر مقرر کر دیا، تاکہ ان کا روزگار بنا رہے۔

ظاہر ہے کہ ان دور کی رشتہ داریوں کے خیال سے خواجہ حاجی کسی طرح میرزا نصر اللہ بیگ خان کے پسماندگان میں شمار نہیں کیے جا سکتے کہ وہ پانچ ہزار میں سے دو ہزار سالانہ کے مستحق قرار پائیں۔

صاحب ہیں (جو، جون ۱۸۰۶ء والے حکم کی رُو سے پنشن میں سے دو ہزار سالانہ کے حصے دار قرار پائے تھے۔ اب ان کے انتقال کے بعد ان کا حصہ ان کے دونوں بیٹوں، شمس الدین خان عرف خواجہ جان اور بدرالدین خان عرف خواجہ امان (مترجم بوستانِ خیال) کے نام منتقل کر دیا گیا[۱]۔ نواب احمد بخش خان نے میرزا کو یہ توقع دلائی تھی کہ خواجہ حاجی کو یہ رقم صرف ان کی زندگی بھر ملتی رہیگی اور ان کے بعد تمہارے خاندان کی طرف منتقل ہو جائیگی۔ اسی لیے اگرچہ وہ اسے شروع سے ناانصافی تو خیال کرتے رہے کہ خواجہ حاجی کو دو ہزار سالانہ ملیں، لیکن اسے عارضی بات سمجھتے ہوئے اتنے دن مصلحت سے خاموش رہے تھے۔ اب ان کے مرنے کے بعد جب یہ رقم ان کے صاحبزادوں کو ملنے لگی، تو وہ قدرتاً چِز بز ہوئے۔

ہے یوں کہ اگر نواب احمد بخش خان حسبِ سابق اب بھی کارفرما ہوتے اور غالب کے تعلقات بھی براہِ راست انھیں سے رہتے، تو عین ممکن ہے کہ معاملات بدستور خوش اسلوبی سے طے پا جاتے۔ لیکن ان کے گوشہ نشینی اختیار کر لینے اور نواب شمس الدین احمد خان کے حکمران ہو جانے سے حالت بالکل بدل گئی۔ خواجہ حاجی کے حصے کا جھگڑا تو تھا ہی، نواب شمس الدین احمد خان کے مخالفانہ سلوک نے ان کے غصے کی آگ کو اور ہوا دی۔ قدرتی طور پر، میرزا کا خیال یہ تھا کہ ۴ مئی ۱۸۰۶ء کے حکم کے بموجب ہمارے خاندان کو دس ہزار سالانہ ملنا چاہیے تھا، اور ملتا صرف پانچ ہزار رہا ہے کیونکہ انھیں دوسرے، ۷ جون ۱۸۰۶ء والے شقّے کا علم ہی نہیں تھا۔ اس لیے اب مالی پریشانیوں سے گھبرا کر انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس ناانصافی کے خلاف سرکارِ انگریزی میں باقاعدہ شکایت کرنا چاہیے۔

صلح کی کوشش

البتہ آخری قدم اٹھانے سے پہلے میرزا نے ایک بار نواب احمد بخش خان کی خدمت

---

[۱] فارن (پولیٹیکل) ۲۸ اگست ۱۸۳۰ء (۹۳-۹۵)؛ ۸؛ انڈیا آفس: ۴۳۰ ۵۰۲

میں حاضر ہوکر صلح صفائی سے معاملہ سلجھانے کی کوشش کی[1]۔ ان کے دوستوں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ اتنے پرانے تعلقات کو مدّنظر رکھتے ہوئے کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہیے، جس سے نواب احمد بخش خان کو کسی طرح کا رنج ہو۔ چنانچہ وہ نواب صاحب موصوف سے ملاقات کی غرض سے لوہارو گئے[2]۔

میرزا نے کلکتے پہنچ کر جو درخواست گورنر جنرل کے دفتر میں پیش کی تھی، اس کی تمہید میں انھوں نے روانگی سے پہلے کے حالات پوری تفصیل سے قلم بند کیے ہیں۔ لکھتے ہیں[3]:

اس سے پہلے بارہا میں نے نواب احمد بخش خان سے زبانی اور تحریری احتجاج کیا تھا کہ خواجہ حاجی کو اس وظیفے میں کیوں حصّہ دار بنا دیا گیا ہے۔ وہ کہتے رہے کہ مجھ سے غلطی ہو گئی، میں جرنیل صاحب (لارڈ لیک) کے سامنے اسے نصر اللہ بیگ خان کا رشتہ دار کہہ چکا ہوں۔ اگر اب میں کچھ اس کے خلاف کہوں، تو یہ میری بے عزتی کا باعث ہوگا۔ چندے اور صبر کرو۔ خواجہ حاجی کی وفات کے بعد میں اس کے دو ہزار بھی تمھیں دونوں بھائیوں کو دے دوں گا۔ احمد بخش خان میرے بزرگ اور ہم قوم تھے اور ان کی مجھ سے دوہری دوہری عزیزداری تھی یعنی میرے چچا ان کے بہنوئی تھے اور خود میں ان کے بھائی الٰہی بخش خان کا داماد تھا؛ اس لیے میں خاموش رہا اور میں نے اپنے بھائی کو بھی منع کر دیا کہ نواب صاحب کے خلاف حکومتِ انگریزی سے کوئی شکایت نہ کی جائے۔

ایک زمانے کے بعد خواجہ حاجی کا انتقال ہو گیا۔ میں نے خیال کیا کہ اب سے سال کی پوری تنخواہ ہمیں ملیگی۔ لیکن جب وظیفہ تقسیم ہوا، تو دو ہزار کی مشارٌالیہ رقم خواجہ حاجی کے دونوں بیٹوں کو ادا کر دی گئی۔

میں مایوس ہوکر نواب احمد بخش خان کے پاس فیروز پور گیا اور ان سے کہا:۔

۱۔ کلیاتِ نثر: ۹۸ (بنام میرزا علی بخش خان)

۲۔ کلیاتِ نثر (غالب): ۶۳، نیز ص ۹۹

۳۔ انڈیا آفس: ۳۱ تا ۴۵

اب آپ کو اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے اور جائز وارثوں کو ان کا حق دینا چاہیے، یا پھر مجھے اجازت دیجیے کہ کلکتے جا کے اپنا مطالبہ حکومت کے سامنے پیش کروں

اس زمانے میں نواب صاحب کو بہت زخم آئے تھے اور ان کے باعث وہ بہت بیمار تھے؛ انہی ایام میں وہ بسترِ علالت سے اٹھے تھے۔ پھر ان کی الور کی مختاری بھی جاتی رہی تھی، جس سے وہ اور زیادہ افسردہ اور غمگین تھے۔ وہ میرے سامنے رونے، بلکہ ہچکیاں لینے لگے۔ فرمایا:

تم میرے بچے اور نورِ نظر ہو۔ دیکھتے ہو کہ مجھے کیسے زخم آئے ہیں اور کیسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ میرا حق مارا گیا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جرنیل اختر لونی[1] کی اور میری دوستی ختم ہو گئی۔ کچھ اور تحمّل سے کام لو، تمہارا حق تمہیں، پورا پورا ملیگا۔

اس کے جلد ہی بعد اختر لونی کا انتقال ہو گیا[2] اور پھر ان کی جگہ سر چارلس مٹکاف کے تقرر کی خبر ملی۔

نواب صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا کہ سر چارلس مٹکاف کو آنے دو، میں تمہیں ان کی خدمت میں پیش کر کے تمہارا ان سے تعارف کرا دونگا اور تمہارے معاملات اور تمہارے چچا کے سرکارِ انگریزی سے تعلقات بھی ان کے گوش گزار کر دونگا، تاکہ حقدار کو اس کا حق مل سکے۔ نہ صرف یہ، بلکہ میں حکومت سے کہہ کر تم پانچوں[3] کے نام الگ الگ سندلے دونگا، تاکہ میرے پیچھے، میری اولاد روپیہ دینے میں کوئی عذر اور رکاوٹ نہ پیدا

۱۔ جرنیل اختر لونی ان دنوں دلّی میں انگریزی ریذیڈنٹ تھا۔

۲۔ اس کا انتقال ۱۵ جولائی ۱۸۲۵ء کو میرٹھ میں ہوا اور اس کی جگہ مٹکاف کا تقرر ۲۶ اگست ۱۸۲۵ء کو۔

۳۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس درخواست (۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء) سے پہلے غالب کی دادی (یعنی نصراللہ بیگ خان کی والدہ) کا انتقال ہو چکا تھا۔

کر سکے اور تمہیں با قاعدہ گزارا ملتا رہے۔
سر چارلس مٹکاف کے آنے کے بعد بھرت پور کا معاملہ پیش آگیا[1] اور وہ راجہ بلدیو سنگھ کو بچانے اور راج کے شورہ پشتوں کو سزا دینے میں مصروف ہو گئے۔ نواب احمد بخش خان بھی وہاں جا رہے تھے۔ انھوں نے مجھ سے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔
میں اس زمانے میں اپنے بھائی کی بیماری[2] کی وجہ سے ایک مصیبت میں گرفتار تھا۔ مزید برآں قرض خواہوں نے تقاضوں اور شور و غوغا سے میرا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اس لیے میں اس سفر کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس توقع پر کہ مجھے

۱۔ بھرت پور کا قضیہ یہ ہے کہ ۱۸۲۳ء میں سر ڈیوڈ اختر لونی نے منظور کر لیا کہ بلدیو سنگھ کو گدی پر بٹھا دیا جائے، بحال آں کہ وہ اس وقت نابالغ تھا۔ بلدیو سنگھ کے چچیرے بھائی دُرجن سال نے اس کی مخالفت کی اور ریاست پر خود قابض ہو گیا۔ اس پر اختر لونی نے دلّی سے بلدیو سنگھ کی مدد کو سپاہ بھیج دی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب انگریز برما میں لڑ رہے تھے۔ لارڈ ایمہرسٹ گورنر جنرل (۱۸۲۸ - ۱۸۲۳ء) اس لڑائی سے بہت گھبرائے ہوئے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ انگریز کسی اور دیسی ریاست کے معاملے میں دخل دے کر کوئی نئی ذمہ داری اٹھائیں۔ چنانچہ انھوں نے اختر لونی کا حکم منسوخ کر دیا اور بھرت پور سے فوج واپس بلانے کے احکام صادر کر دیے۔ اختر لونی نے اس کا مطلب یہ لیا کہ حکومت کو مجھ پر اعتماد نہیں اور استعفیٰ دے دیا اور اس کے تھوڑے عرصے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ جب سر چارلس مٹکاف ریذیڈنٹ مقرر ہوئے تو انھوں نے کہا کہ یوں چھوٹے چھوٹے راجاؤں کو حکومت کے خلاف من مانی کرنے کی اجازت دے دی گئی تو اس سے ملک میں انگریزوں کی ساکھ ختم ہو جائیگی۔ اس پر کمانڈر انچیف لارڈ کومبر میر (Combermere) کی کمان میں بلدیو سنگھ کی کمک پر فوج روانہ کی گئی۔ سخت مقابلے کے بعد ۱۸ جنوری ۱۸۲۶ء کو بھرت پور کا قلعہ فتح ہوا، اور دُرجن سال کو شکست ہوئی اور اسے ریاست سے نکال دیا گیا۔ یوں بلدیو سنگھ کو دوبارہ بھرت پور کی گدّی ملی۔
۲۔ گویا مرزا یوسف ۱۸۲۵ء سے پہلے اپنا دماغی توازن کھو چکے تھے۔

مٹکاف صاحب کی خدمت میں سلام کرنے کا موقع مل جائیگا، میں نے اپنے بھائی کو بخار اور ہذیان کی حالت میں چھوڑا، چار آدمیوں کو اس کی نگہداشت کے لیے مقرر کیا، کچھ قرض خواہوں کو طرح طرح کے دم دلاسوں سے چپ کرایا، اور دوسروں کی نظر سے چوری چھپے، بھیس بدل کر، کسی طرح کا ساز و سامان لیے بغیر، سو مشکلوں سے میں نواب احمد بخش خان کے ساتھ بھرتپور کے لیے روانہ ہو گیا۔

میرے بار بار کے کہنے کے باوجود نواب احمد بخش خان نے سر چارلس مٹکاف سے میرا تعارف نہ کرایا۔ اسی اثنا میں نواب صاحب کے منہ پر لقوہ ہو گیا، لیکن کچھ مدت بعد ڈاکٹر ڈنکن (Duncan) کے علاج سے وہ ٹھیک ہو گئے اور فیروز پور واپس چلے آئے۔ حال آں کہ سر چارلس مٹکاف بھی تین دن وہاں فیروز پور میں رہے اور میں بھی روزانہ احمد بخش خان سے درخواست کرتا رہا، انھوں نے مجھے سر چارلس کی خدمت میں پیش نہیں کیا۔

جب مٹکاف صاحب بہادر دلّی واپس چلے گئے، تو اب میں احمد بخش خان سے بالکل مایوس ہو گیا۔ پھر میں نے دل میں خیال کیا کہ انصاف پسند حکمران اپنے متعلقین میں سے ہر ایک کا خیال رکھتے ہیں۔ آخر مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں احمد بخش خان کا وسیلہ اور واسطہ تلاش کروں کیوں نا کسی کی سفارش کے بغیر میں آپ خود سر چارلس مٹکاف کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے تمام معاملات شروع سے لے کر آخر تک ان کے گوش گزار کر دوں! لیکن قرض خواہوں کے شور و غل کے ڈر سے میرا دلّی جانا نا ممکن تھا۔ مجھے اپنی عزت کا خیال آیا اور آخر میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔

اس کے علاوہ انہی دنوں نواب گورنر جنرل بہادر کے ورود کی خبر پھیلی۔ یقین تھا کہ سر چارلس مٹکاف بھی ان کی پذیرائی اور استقبال کے لیے جائینگے۔ لہذا میں نے فیصلہ کیا کہ کانپور جاؤں اور وہاں سے ان کی معیت میں واپس آؤں، اور راستے میں کسی

---

۵ یاد رہے کہ یہ نومبر۔ دسمبر ۱۸۲۵ء کا ذکر ہو رہا ہے۔

مناسب موقعے پر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی مصیبت اور بے بسی اور قرض کا سارا افسوسناک احوال ان سے کہوں اور انصاف کا طالب ہوں۔

لکھنؤ

غرض اس ارادے سے وہ فرخ آباد اور کانپور کی طرف روانہ ہو گئے۔ بدقسمتی سے جونہی کانپور پہنچے، وہاں بیمار پڑ گئے، یہاں تک کہ ہلنے جلنے تک کی سکت بھی جاتی رہی۔ چونکہ اس شہر میں ڈھنگ کا کوئی معالج نہیں ملا، اس لیے انھیں مجبوراً ایک کرایے کی پالکی میں گنگا پار لکھنؤ جانا پڑا[1]۔ یہاں وہ پانچ مہینے سے کچھ دن اوپر بستر پر پڑے رہے[2]۔ یہیں انھوں نے نواب گورنر جنرل بہادر کے ورود اور بادشاہِ اودھ کے ان کے استقبال کو جانے کی خبر سنی لیکن ان دنوں وہ چارپائی سے اٹھنے تک کے قابل نہیں تھے۔ غرض کہ لکھنؤ کی آب و ہوا انھیں بالکل راس نہیں آئی[3]۔

بہرحال لکھنؤ کے اربابِ نظر نے ان کی مناسب آؤ بھگت کی۔ ان کی اردو غزل جس کا مطلع ہے:

واں پہنچ کر جو غش آتا پیہم ہے ہم کو	صد رہ آہنگِ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

قیامِ لکھنؤ کی یادگار ہے۔ اس کے آخر میں تین شعر کا قطعہ ہے:

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی	ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر	عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ!	جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

لیکن پہلے جب یہ غزل انھوں نے لکھنؤ میں کہی ہے، تو مقطع کا مصرعِ اول یوں تھا:

1۔ سفر کی اس تفصیل سے حالی کا یہ بیان محلِ نظر ہو جاتا ہے کہ "چونکہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ میرزا ایک بار لکھنؤ آئیں۔ اس لیے کانپور پہنچ کر ان کو خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلیں" (یادگارِ غالب: ۳۷)

2۔ یہاں اب ۱۸۲۶ء کے وسط کا ذکر ہو رہا ہے

3۔ غالب نے ابن حسن خان کے نام خط میں بھی قیامِ لکھنؤ کی میعاد تقریباً پانچ مہینے لکھی ہے۔

(اردو ادب، جولائی ۱۹۵۲ء)

لائی ہے معتمد الدّولہ بہادر کی اُمّید[1]۔ یہ معتمد الدّولہ بہادر کون تھے؟

آغا میر

اس زمانے میں غازی الدین حیدر شاہِ اودھ تھے، لیکن سلطنت کے سیاہ وسپید کے مالک ان کے نائب السلطنت معتمد الدولہ سیدّ محمد خان بہادر عرف آغا میر تھے۔ رفتہ رفتہ ان تک خبر پہنچی کہ غالب لکھنؤ میں موجود ہیں، تو انھوں نے ملاقات کے لیے ایما فرمایا[2]۔ میرزا بھی تیار ہو گئے کہ نائب السلطنتِ اودھ کے دربار میں باریابی کا فخر حاصل کریں۔

کلیاتِ نظم فارسی کا قصیدہ (۴۹) جس کا مطلع ہے:

گر بہ سنبل کدۂ روضۂ رضواں رفتم	ہوسِ زلفِ تُرا سلسلہ جنباں رفتم

جیسا کہ اس کی ردیف ہی سے ظاہر ہے، اسی سفر کے دوران میں لکھا گیا تھا۔ اس کی تشبیب میں متعدّد شعر ایسے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اسے انھوں نے دلّی سے روانہ ہوتے ہی شروع کر دیا تھا۔ مثلاً:

چہرہ اندُودہ بجگر دو مژہ آغشتہ بخوں	خود گواہم کہ زدہلی بچہ عنواں رفتم
اضطرار آینہ پردازِ جلائے وطنست	نہ بدل رفتم ازاں بقعہ، بل ازجاں رفتم
ہم جگر تفتہ زکیں خواہیِ اغیار شدم	ہم دل آزردہ زبے مہریِ خویشاں رفتم
از تعلق نبود رُو بقفا، فتنِ من!	وحشتے بُردم از احباب و ہراساں رفتم

آگے چل کر لکھنؤ پہنچنے کا ذکر کرتے ہیں:

لکھنؤ دامِ نشاطے سرِ راہم گسترد	بخود از ولولۂ شوق، پرافشاں رفتم

یقین ہے کہ انھوں نے یہ قصیدہ غازی الدین حیدر اور آغا میر کی خدمت میں پیش کرنے کو لکھنا شروع کیا تھا۔ آغا میر سے ملاقات کی تجویز پیش ہوئی، تو غالباً یہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا اور معلوم یوں ہوتا ہے کہ ملاقات کا جو وقت مقرر ہوا تھا، وہ اتنا

۱۔ مخطوطہ دیوانِ غالب (نسخۂ شیرانی): ۵۶ (الف) (پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور)

۲۔ کلیاتِ نثر (فارسی): ۶۵

تنگ تھا کہ وہ اسے مکمل بھی نہیں کر سکتے تھے[1]۔ اس لیے انھوں نے آغا میر کی خدمت میں پیش کرنے کو ایک مختصر سی فارسی نثر صنعتِ تعطیل میں لکھ لی[2]۔ لیکن اس کا بھی یقین ہے کہ لکھنؤ کے قیام کے دوران میں انھوں نے یہ قصیدہ مکمل کر لیا تھا۔ میرا خیال یہ ہے کہ وہ اسے کسی مناسب تقریب پر خود بادشاہِ اودھ غازی الدین حیدر کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے تھے، جس کا انھیں موقع نہ ملا۔

میرزا آغا میر کی خدمت میں جانے کو راضی تو ہو گئے، لیکن بقولِ حالی اس کے ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ اوّل، میرے پہنچنے پر آغا میر میری تعظیم دیں یعنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر پذیرائی کریں، دوم، مجھے نقد نذر پیش کرنے سے معاف رکھا جائے[3]۔ بلکہ غالب یہ چاہتے تھے کہ آغا میر ان سے معانقہ بھی کریں[4]۔ "گدا طبع، سلطان صورت" آغا میر اعزاز و اکرام کی اس حد تک جانے کو تیار نہ ہوا۔ ادھر میرزا اس سے کم کو "آئینِ خویشتن داری" کے خلاف اور "شیوۂ خاکساری" کے لیے ننگ خیال کرتے تھے، اس لیے ملاقات نہ ہو سکی[5]۔

باندہ

چونکہ طویل قیام اور علاج کے باوجود لکھنؤ میں ان کی تندرستی بحال نہیں ہو سکی تھی، اس لیے انھوں نے باندہ جانے کا فیصلہ کیا، جہاں کے نواب سے ان کی ننھیال کی طرف سے رشتہ داری تھی[6]۔

۱۔ جب آغا میر سے ملاقات نہ ہو سکی اور پھر غازی الدین حیدر کا بھی انتقال ہو گیا، تو انھوں نے قصیدہ مکمل کر کے اسے اس کے بیٹے نصیر الدین حیدر اور نئے وزیر روشن الدولہ کے نام کر دیا، جیسا کہ اب کلیات میں موجود ہے۔

۲۔ یہ نثر "کلیاتِ نثر" کے صفحہ ۶۵-۶۶ پر ہے

۳۔ یادگارِ غالب (حالی): ۳۸

۴ نامہہای فارسی غالب: ۱۳

۵۔ کلیاتِ نثرِ غالب (فارسی): ۱۵۰ (پنج آہنگ)

۶۔ رشتہ داری متعین کرنے کے لیے دیکھیے اردوئے معلی یا خطوطِ غالب: ۱۹۹ (بنام شفق) ۲۲۳

لکھتے ہیں:[1]

"میرے بزرگوں کے اور نواب ذوالفقار علی بہادر (باندہ) کے باہمی بہت پرانے تعلقات تھے۔ خود میرے دل میں بھی نواب صاحب موصوف کے لیے حد درجہ محبت اور لگاؤ تھا۔ اس لیے میں جوں توں کر کے گرتا پڑتا باندہ (بوندیل کھنڈ) پہنچ گیا۔ یہاں میں تقریباً چھ مہینے تک نواب صاحب کے مکان پر رہا۔ خدا کے کرم اور نواب صاحب کی ہمدردی اور تیمارداری اور توجہ سے مجھے اس خطرناک بیماری سے نجات ملی۔

"اب بارشیں ختم ہو چکی تھیں اور نواب گورنر جنرل بہادر بھی کلکتے مراجعت فرما چکے تھے۔ میں فیروز پور سے دلّی تو جا نہیں سکا تھا۔ اب باندہ سے کیسے اور کیوں کر اس کی جرأت کر سکتا تھا، اس کے علاوہ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ آخر دلّی اور کلکتے میں دونوں جگہ قانون تو وہی ایک ہے، مجھے سارا معاملہ حکومت کے انصاف پر چھوڑ دینا چاہیے۔

"چونکہ کشتی سے سفر کرنے کی میری مقدرت نہیں تھی۔ اس لیے مجھے مجبوراً اکیلے خشکی کے راستے گھوڑے کی سواری سے کلکتے جانا پڑا۔ دو تین ملازم میرے ساتھ تھے، لیکن میں بہت کمزور اور تھکا ماندہ تھا۔ زادِ راہ[2] اور کوئی آسائش کا سامان بھی نہیں تھا۔[3]

"مرشد آباد پہنچا، تو یہاں نواب احمد بخش خان کے انتقال اور شمس الدین احمد خان کی جانشینی کی خبر ملی۔[4]

۱۔ انڈیا آفس: ۲۴، ۴۳

۲۔ نواب ذوالفقار علی کی وساطت سے انھوں نے باندے کے ایک شخص امین چند سے دو ہزار قرض لیا تھا۔ یہ رقم بہ زادِ سفر مہیا کرنے کے کام آیا ہوگا (نامہ ہای فارسی غالب: ۴۱) کلکتے پہنچنے کے بعد محمد علی خان (صدر امین) باندہ نے بھی دو سو روپیہ بھیجا تھا۔ (ص ۴۳) اور آگرے سے بھی ڈھائی سو کی رقم پہنچی تھی (ایضاً، ص ۸)

۳۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک مرتبہ ۱۸۲۵ء میں جو دلّی سے نکلے تو پھر فیروز پور، کانپور، لکھنؤ اور باندے میں ڈیڑھ دو سال کے قیام کے بعد سیدھے کلکتے چلے گئے۔

۴۔ میرزا علی بخش خان (پسر معروف) کو کلکتے سے لکھا کہ مرشد آباد میں میرے پرانے دوست میر فضل مولیٰ نے مجھے بتایا کہ نواب فخر الدولہ کا انتقال ہو گیا ہے کلکتے پہنچا تو میرزا افضل بیگ وغیرہ نے بھی اس کی تصدیق کی۔ افسوس کہ اس خاندان کا روشن چراغ گل ہو گیا۔ (کلیاتِ نثر: ۹۹)

بہرحال چونکہ میرا دعویٰ احمد بخش خان کی جاگیر (فیروز پور) سے متعلق تھا، اس لیے میں نے کہا، وہ زندہ ہوں یا مردہ، اس سے میرے معاملے پر کیا اثر پڑسکتا ہے! اور کلکتے پہنچ گیا!

ورودِ کلکتہ

وہ مختلف مقامات پر ٹھہرتے ہوئے ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء (۴ شعبان ۱۲۴۳ھ) کو کلکتے پہنچے۔[2] یہ سفر بیشتر گھوڑے پر ہوا۔ اگرچہ کچھ مسافت گھوڑا گاڑی اور کشتی سے بھی طے ہوئی۔ جس دن کلکتے پہنچے، اسی دن کسی غیر معمولی جستجو اور زحمت کے بغیر رہنے کو مکان مل گیا۔ یہ شملہ بازار[3]

۱۔ مقدمہ پر تو کیا اثر پڑتا لیکن لکھتے ہیں: اس سے دو خیال پیدا ہوئے، ایک یہ کہ جو خطرہ مستقبل میں پیش آتا، وہ فوراً سامنے آگیا یعنی اب آیندہ دستِ گدائی اپنے بھائیوں کے سامنے دراز کرنا پڑیگا۔ (اس سے مراد احمد بخش خان کی اولاد اور خصوصاً شمس الدین احمد خان ہیں)۔ دوسرے یہ کہ مقدمے میں کامیابی سے جو مسرت میرے تصور میں تھی، وہ غارت ہوگئی یعنی غاصبِ قوی سے انتقام لینا اور دردمند احباب کی مجلسوں میں اس کا فخریہ اظہار کرنا۔ (نامہ ہای فارسی غالب: ۲۸)

۲۔ کلیاتِ نثر (غالب): ۱۶۶ (بنام مولوی محمد علی خان) یہاں پر تاریخوں اور دنوں میں کچھ تفاوت ہے۔ میرزا لکھتے ہیں کہ میں "روز سہ شنبہ چارم شعبان" دن چڑھے کلکتے پہنچا۔ منگل کے دن جنتری کی رو سے شعبان کی دوسری تھی۔

۳۔ کارنوالس اسکوائر کے تالاب کے سامنے مانک ٹولہ اسٹریٹ کی نکڑ پر ایک گرجا ہے جس کا نام کرائسٹ چرچ (Christ Church) ہے۔ اس گرجے کی پشت پر ایک بازار ہوا کرتا تھا، جو مانک ٹولہ اسٹریٹ سے شروع ہوکر شمال کو بیڈن اسٹریٹ کی طرف چلا جاتا تھا۔ اسی کا نام شملہ بازار تھا۔ یہ بازار اس صدی کے شروع تک موجود تھا۔ اب اس کے کچھ حصے میں تو عمارتیں بن گئی ہیں، اور باقی میں بیتھون رو ہے۔ (Bethune Row) میرزا علی سوداگر کا مکان غالباً اسی جگہ تھا، جہاں اس وقت بیتھون رو کا مکان ۱۴۲ ہے۔ اس کے صحن کا کنواں ۱۹۳۵ء میں پاٹا گیا تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ گرد تالاب اس جگہ تھا، جہاں اب کارنوالس اسکوائر کا تالاب ہے۔

(متصل چیت بازار) میں گرو تالاب کے نزدیک میرزا علی سوداگر حویلی میں تھا[1]۔ مکان کھلا اور پُر فضا تھا۔ اس میں ضرورت کے تمام سامان موجود تھے۔ گوشۂ صحن میں میٹھے پانی کا کنواں تھا اور تمام خوبیوں اور سہولتوں کے باوجود کرایہ صرف چھ روپیہ ماہانہ تھا[2]۔

یہاں پہنچ کر انھوں نے ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء کو اپنی درخواست گورنر جنرل باجلاس کونسل کی خدمت میں پیش کی، تو انھیں دفتر کی طرف سے حکم موصول ہوا[3] کہ "یہ پہلے دلّی میں انگریز ریذیڈنٹ کے سامنے پیش ہونا چاہیے"۔ اس کی رپورٹ پر یہاں مناسب کارروائی کی جائیگی۔ میرزا کے لیے یہ ناممکن تھا کہ واپس دلّی آتے اور پھر دوبارہ ہفتوں طے کر کے کلکتے پہنچتے۔ اس لیے وہ خود تو کلکتے ہی میں رہے اور دلّی ریذیڈنسی میں مقدمے کی پیروی کے لیے خط کے ذریعے سے لالہ ہیرالال کو اپنا وکیل مقرر کر دیا[4]۔

اُن دنوں دلّی میں سر ایڈورڈ کولبروک ریذیڈنٹ تھے اور منشی التفات حسین خان ان کے میر منشی۔ میرزا نے کلکتے سے ان دونوں کے نام سفارشی خط حاصل کیے، ریذیڈنٹ کے لیے کرنیل ہنری اطاک سے، جو کمپنی کی فوج میں ملازم تھے، اور کولبروک کے ملنے والوں میں سے تھے؛ میر منشی کے لیے خط نواب علی اکبر خان طباطبائی متوَلّیِ امام باڑہ ہوگلی سے لیا۔ انھوں نے یہ دونوں خط اپنے وکیل ہیرالال کو بھیج دیے۔ ان کوششوں اور سفارشوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ کولبروک صاحب نے ۴ فروری ۱۸۲۹ء کو ان کے حق میں رپوٹ صدر کو بھیج دی۔ جس میں ان کے دعوے کی تائید تھی[5]۔ دیکھا جائیگا کہ دلّی

۱۔ کلیاتِ نثر: ۱۵۹ (بنام رائے چھج مل)؛ ایضاً: ۹۹ (بنام علی بخش خان)

۲۔ ایضاً: ۱۶۶ (بنام مولوی محمد علی خان) میں دس روپیہ لیکن نامہ ہای فارسی غالب (ص ۲۷) میں رقم چھ روپیہ ماہانہ لکھی ہے؛ اور یہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ فارن متفرق نمبر ۲۰۸: ۷، ۵ء ۶؛ نیز کلیاتِ نثر: ۱۶۸ (بنام مولوی محمد علی خان)؛ انڈیا آفس: ۶۸

۴۔ کلیاتِ نثر: ۱۶۸ (بنام مولوی محمد علی خان)؛ ایضاً: ۱۰۰ (بنام علی بخش خان)

۵۔ کلیاتِ نثر: ۱۰۰ (بنام علی بخش خان) و ایضاً: ۱۴۴ (بنام مولوی سراج الدین احمد) نیز دستاویز فارن (۲۸): ۱۷-۱۹

سے اس ابتدائی رپوٹ کے حاصل کرنے ہی میں دس مہینے کا طویل زمانہ گذر گیا اور میرزا یہ سارا عرصہ بیکار کلکتے میں بیٹھے رہے۔

بدقسمتی سے سر ایڈورڈ کولبروک جلد ہی غبن اور رشوت ستانی کے جرم میں ماخوذ ہو کر معزول ہو گئے[۱]، اور ان کی جگہ فرانسس ہاکنس ریذیڈنٹ مقرر ہوئے۔ ہاکنس کا نواب شمس الدین احمد خان سے یارانہ تھا۔ اس نے نواب کے کہنے پر صدر میں دوسری رپوٹ بھیجی، جس میں لکھا کہ غالب کو جو ساڑھے سات سو سالانہ آج تک ملتے رہے ہیں، وہ اس سے زیادہ کے مستحق نہیں[۲]۔

میرزا کو پورا یقین تھا کہ چوں کہ میں سچائی پر ہوں، اس لیے مقدمے کا فیصلہ ضرور میرے حق میں جائیگا۔ اُن دنوں حکومتِ انگریزی کے دفترِ فارسی کے سکتر اینڈریو اسٹرلنگ تھے[۳]۔ انھوں نے میرزا کی خاصی آؤ بھگت کی؛ دوسرے اعلیٰ انگریزی افسر بھی بہت اچھی طرح پیش آئے۔ میرزا کی طبیعت پر ان سب باتوں کا یہی اثر ہوا کہ فیصلہ ضرور میرے حسبِ دلخواہ ہوگا۔ اور اسی امید پر وہ ڈیڑھ سال سے زیادہ کلکتے میں پڑے رہے۔ جب وہ دلّی سے روانہ ہوتے ہیں تو اتنے شکستہ دل اور مایوس تھے کہ وہ سوچ رہے تھے، کہ اب ہندستان میں نہیں رہونگا، بلکہ ایران چلا جاؤنگا اور وہیں "یزد کے آتش کدوں اور شیراز کے میخانوں" میں زندگی کے باقی دن گزارونگا۔ مگر کلکتے میں افسروں کے حوصلہ افزا سلوک اور برتاؤ نے ان کی ڈھارس بندھائی اور انھوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا[۴]۔ بلکہ یہاں کی فضا اور ماحول انھیں اتنا پسند آ گیا تھا کہ وہ اس کی تعریف

۱۔ اس مقدمے کے حالات کے لیے دیکھیے Twilight of the Mughals باب ۸ (ص ۱۶۹-۱۸۱)

۲۔ کلیاتِ نثر: ۱۳۰-۱۳۱ (مولوی سراج الدین احمد) نیز متفرقاتِ غالب: ۳۱-۳۴؛ ہاکنس سے متعلق دو ہجو یہ قطعے میرزا کے کلیاتِ نظم فارسی میں موجود ہیں (قطعہ ۱۵ و ۱۶)

۳۔ اینڈریو اسٹرلنگ کی مدح میں ایک پُر زور قصیدہ کلیاتِ فارسی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ (قصیدہ سی و نہم)۔ قطعہ ۴۵ بھی انہی کی جوانا مرگی کے غم میں لکھا گیا تھا۔

۴۔ کلیاتِ نثر (غالب): ۱۰۳ (بنام میر اعظم علی)

ہیں رطب اللسان ہیں اور لکھتے ہیں[1] کہ کلکتے جیسا شہر تختۂ زمین پر نہیں، یہاں کی خاک نشینی، اَور جگہ کی حکمرانی سے بہتر ہے۔ خدا کی قسم، اگر میں مجرّد ہوتا اور خانہ داری کی ذمّہ داریاں اور زنجیریں میری راہ میں حائل نہ ہوتیں، تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر عمر بھر کے لیے یہیں کا ہو رہتا۔

کلکتے کی تعریف میں ایک رباعی بھی کہی ہے، اس میں یہاں کی آب و ہوا کی تعریف کی ہے:

غالب! ہر پردہ نوائے دارد
ہر گوشۂ از دہر فضائے دارد
بر چیدہ بہ بوست ز دماغم یکسر
بنگالہ شگرف آب و ہوائے دارد

لیکن جب ایک مدّت کے قیام کے بعد بھی کوئی فیصلہ نہ ہوا اور اس کے جلد صادر ہونے کی بھی کوئی صورت نظر نہ آئی، ادھر دلّی سے ہاکنس کی مخالفانہ کوشش کی خبر پہنچی، تو انھوں نے واپس آنے کا عزم کر لیا۔ اس سے نہ صرف مزید زیرباری اور خرچ کی بچت منظور تھی، بلکہ انھیں یقین تھا کہ میں دلّی پہنچ کر زیادہ مفید کام کر سکونگا، اور اپنے اثر و رسوخ سے یہاں سے بہتر رپوٹ بھجوا سکونگا۔ اس لیے کلکتے میں مقدمے کی دیکھ بھال کے لیے منشی نصراللہ کو اپنا وکیل[2] مقرر کر کے وہ وہاں سے روانہ ہو گئے اور یوں کوئی تین برس کی غیر حاضری کے بعد اتوار کے دن ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء (یکم جمادی الثانی ۱۲۴۵ھ) کو واپس دہلی پہنچے[3]۔

---

۱ کلیاتِ نثر (غالب): ۱۴۶ (بنام مولوی سراج الدین احمد)

۲- کلیاتِ نثرِ غالب: ۱۴۵ (بنام مولوی سراج الدین احمد)

۳- ایضاً۔ یہاں مطبوعہ کلیات میں ۲ دوم جمادی الثانی" کے لفظ چھپے ہیں، لیکن قلمی نسخے میں "یکم جمادی الثانی" ہے؛ اور یہی درست ہے۔ متفرقاتِ غالب (ص ۱) میں بھی یکم جمادی الثانی ہے۔

ادبی معرکہ

غالب کے ایک فارسی قصیدے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس سفر میں دو ہنگامے پیش آئے[1]: پہلا الٰہ آباد میں، دوسرا کلکتے میں۔ الٰہ آباد والے قضیے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ ہاں کلکتے کے معرکے سے متعلق ان کی تحریروں میں کافی تفصیل موجود ہے۔

ان دنوں کلکتے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مدرسۂ عالیہ کے زیر اہتمام ہر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو ایک بزم سخن منعقد ہوا کرتی تھی۔ میرزا کے پہنچنے کے بعد جو مشاعرہ ہوا[2] اس میں انھوں نے ہمام تبریزی کی زمین میں غزل پڑھی جس کا یہ مقطع بہت مشہور ہے:

گر دہم شرحِ ستم ہائے عزیزاں غالبؔ!   رسمِ امید ہمانا ز جہاں برخیزد

اسی زمین کا ایک شعر ہے:

جزوے از عالمم و از ہمہ عالم بیشم   ہمچو موئے کہ بتاں راز میاں برخیزد

اس پر حاضرین میں سے کسی نے اعتراض کیا کہ مصرعِ اولیٰ میں بیش کی جگہ تفضیلِ بعض بیشتر ہونا چاہیے تھا۔ برابر سے ایک دوسرے صاحب بول اٹھے کہ مصرعِ ثانی میں "موئے زمیاں" کی ترکیب غلط ہے، بلکہ پورا شعر بےمعنی ہے۔ ایک اور صاحب نے

۱۔ کلیاتِ غالب (نظم فارسی) قصیدہ نہم در منقبتِ سید الشہدا علیہ السلام۔ اس میں ایک شعر ہے:

نفس بلرزہ ز بادِ نہیبِ کلکتہ   نگاہ خیرہ ز ہنگامۂ الٰہ آباد

۲۔ کلیاتِ نثر، ۷۰۔ ۱۹۳۹ء میں کلکتے کے متعدد بزرگوں نے میرے پوچھنے پر مجھے بتایا تھا کہ یہ مشاعرہ مدرسۂ عالیہ کی موجودہ ولزلی اسٹریٹ والی عمارت میں ہوا تھا۔ اس سے پہلے مدرسہ بیٹھک خانے میں تھا۔ اس ولزلی اسٹریٹ والی عمارت کا سنگِ بنیاد ۱۵ جولائی ۱۸۲۴ء کو رکھا گیا تھا۔ پوری عمارت تین سال کی مدت میں تیار ہوئی اور غالب کے کلکتے پہنچنے سے صرف چند ماہ پہلے اگست ۱۸۲۷ء میں جماعتیں اس نئی جگہ منتقل ہوئی تھیں۔ ظاہراً مشاعرے میں نشست کا انتظام یوں تھا کہ شعرائے کرام اندر کے مغربی برآمدے میں تشریف فرما تھے۔ حاضرین کی بڑی تعداد باہر کھلے صحن میں فرش پر بیٹھی تھی۔

غالب کے اندازے کے مطابق تقریباً پانچ ہزار کا مجمع تھا (عودِ ہندی: بنام صاحب عالم مارہروی)

"ہمہ عالم" کی ترکیب پر فرمایا کہ "عالم مفرد ہے، اس کا ربط ہمہ کے ساتھ حسبِ اجتہادِ قتیل ممنوع ہے"![1]

غالب نے ایک اور غزل بھی پڑھی تھی ۔ اس میں شعر ہے :

شورِ اشکے بہ فشارِ بُنِ مژگاں دارم

طعنہ بر بے سر و سامانیِ طوفاں زدہٴ

اس پر یہ اعتراض ہوا کہ اس کے دوسرے مصرعے میں زدہٴ کا استعمال غلط ہوا ہے۔

میرزا غالب بھلا قتیل اور دوسرے ہندستانی فارسی دانوں کو کب خاطر میں لاتے تھے۔ انھوں نے قتیل کا نام سن کر ناک بھوں چڑھائی اور کہا، قتیل کون؟ وہی فرید آباد کا کھتری بچہ ؟ میں کیوں اس فرومایہ کو سند ماننے لگا! اس پر ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ غالب کی طرف سے اعتراضوں کا جواب نواب علی اکبر خان طباطبائی اور مولوی محمد محسن[2] اور مرزا کامران دُرّانی والیِ ہرات کے سفیر حسین علی خان الملقب بہ کفایت خان[3] اور مولوی عبدالکریم نے دیے مگر مخالفت کسی طرح فرو نہ ہوئی[4]

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم لکھتے ہیں[5]:

۱- عودِ ہندی : ۱۷۱ (شاکر)؛ درفشِ کاویانی : ۱۳۷

۲- کلیاتِ نثر: ۱۷۰ (بنام مولوی محمد علی خان)

۳- ایضاً۔ کلیاتِ نثر؛ نیز عودِ ہندی: ۱۶۹ (بنام عبدالرزاق شاکر) ریاست پٹیالہ کے دفتر خانے میں ایک خط موجود ہے، جو محمد شاہ والیِ ہرات نے مہاراجا کرم سنگھ کے نام لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے مہاراجا سے درخواست کی ہے کہ کفایت خان ہمارا سفیر، کلکتے سے دلی اور پٹیالہ کے راستے واپس آرہا ہے، اس کی ہر طرح امداد کی جائے۔

غالباً یہ محمد شاہ، مرزا کامران دُرّانی کا جانشین ہوگا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کفایت خان بہت دن تک کلکتے میں مقیم رہا۔ (نیز دیکھیے تحریر (۱۹) : ۵۷)

۴- مآثرِ غالب: ۲۳؛ اردوے معلّٰی: ۲۴ (بنام میاں داد خان سیاح)

۵- نقشِ آزاد: ۲۷۹

کلکتہ میں یہ ہنگامہ جن لوگوں نے برپا کیا تھا، میں ان کے نام معلوم کرنا چاہتا تھا، مگر بجز دو تین کے معلوم نہ ہو سکے۔ ایک صاحب احمد علی گوپاموی کے، پرنس غلام محمد (میسور) کے یہاں میر منشی تھے، "حملۂ حیدری" کا انھوں نے اردو ترجمہ کیا تھا۔ دوسرے صاحب انہی کے ہم نام مولوی احمد علی مدرسۂ عالیہ میں مدرّس اور ایشیاٹک سوسائٹی کی فارسی مطبوعات کے مصحح تھے۔ تیسرے ایک صاحب مولوی وجاہت علی لکھنوی، گورنر جنرل کے دفتر انشا میں ملازم تھے۔ ان لوگوں نے صرف اعتراضات ہی نہیں کیے تھے، بلکہ تحریرات بھی لکھی تھیں اور بعض تحریرات "جام جہاں نما" نے جو فارسی کا ہفتہ وار اخبار تھا، چھاپ دی تھیں۔ وجاہت علی قتیل کے شاگرد اور وجاہت تخلص کرتے تھے۔

احمد علی گوپاموی اور وجاہت لکھنوی سے متعلق کچھ کہنے سے قاصر ہوں، لیکن مولوی احمد علی مدرّس مدرسۂ عالیہ کا نام اس سلسلے میں لینا یقیناً غلط ہے۔ یہ وہی صاحب ہیں، جنھوں نے کئی برس بعد برہانِ قاطع والے مباحثے میں غالب کے جواب میں مؤید برہان، تالیف کی تھی۔ ان کی تاریخ ولادت، ۱۷ دسمبر ۱۸۳۹ء (۱۰ شوال ۱۲۵۵ھ) ہے[1]۔ (مظہر علی ان کا تاریخی نام تھا) جب کہ میرزا کو یہ سفر ہی ۱۸۲۸ء - ۱۸۲۹ء میں پیش آیا تھا۔

نواب علائی لکھتے ہیں[2] کہ "اس مخالفت کا باعث مولوی عبدالقادر صاحب نام اور مفتی کبیر احمد صاحب نام دو بزرگ کلکتہ تھے اور یہ دونوں آدمی کالج گورنمنٹ میں معلم اور مشاہیر سے تھے"۔ مفتی کبیر احمد سے مراد غالباً حافظ احمد کبیر[3] ہیں۔ یہ رام پور کے

۱- ہفت آسمان (دیباچہ): ۱- یہ مولوی احمد علی کی تالیف ہے، جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ اس کا دیباچہ، جو ان کے سوانحِ حیات پر مشتمل ہے، ان کے شاگرد بلاخ مین (Blochman) نے لکھا تھا (نیز حالات کے لیے دیکھیے، تاریخ مدرسۂ عالیہ: ۱۸۴-۱۸۵)

۲- نگار، رام پور- فروری ۱۹۶۳ء: ۱۰

۳- ان کے حالات کے لیے دیکھیے تذکرۂ کاملانِ رام پور: ۲۹، نیز تاریخ مدرسۂ عالیہ: ۱۸۳-۱۸۴، ۱۰

رہنے والے اور اس زمانے میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں مدرس تھے۔ ممکن ہے کہ انھوں نے مناقشے میں حصّہ لیا ہو۔ مولوی عبدالقادر کے متعلق میں فی الحال تحقیق نہیں کر سکا۔

مولانا آزاد مرحوم نے اوپر کی عبارت میں اعتراضات کی اخباروں میں اشاعت سے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کی تائید خود میرزا کے ایک خط سے بھی ہوتی ہے[۱]، جو انھوں نے قیام کلکتے کے زمانے میں وہیں کے ایک دوست کے نام لکھا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خلاف شورش مشاعرہ گاہ کی چار دیواری ہی تک محدود نہیں رہی، بلکہ ان کے دوسرے کلام کو بھی شامل کر کے اعتراض لکھ لیے گئے تھے؛ اور ممکن ہے، انھیں شائع بھی کر دیا گیا ہو۔ نیز یہ معاملہ کوچہ و بازار تک پہنچ گیا تھا اور رستہ چلتے لوگ ان پر آوازے کسنے لگے تھے[۲]

بادِ مخالف

یہ حالت یقیناً افسوسناک تھی اور ان کے مقاصد کے سراسر خلاف۔ چوں کہ کلکتے کے لوگ زیادہ تر قتیل کے شاگرد اور مدّاح تھے، اس لیے غالب نے یہی سوچا کہ دریا میں رہ کر مگر سے بیر، عقلمندی کا طریقہ نہیں۔ نہیں معلوم، ابھی مجھے کتنے دن اور یہاں ٹھہرنا ہے اور ان لوگوں سے کیا کیا کام لینا ہیں۔ اس کے علاوہ جس کام سے وہ وہاں گئے تھے، ان ادبی بحثوں میں الجھ کر پوری توجہ اور سکون سے اس کی چارہ جوئی بھی ناممکن تھی۔ ان مصلحتوں کو مدّ نظر رکھ کر انھوں نے نواب علی اکبر خان اور مولوی محمد محسن کی فرمایش پر اپنی مشہور مثنوی "بادِ مخالف" لکھی[۳]، جس میں اپنے سفر کلکتہ کی غرض و غایت اور فارسی میں اپنے مسلک اور اصول کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ خدا گواہ، میں "آویزشِ بیان" سے نہیں ڈرتا اور نہ مجھے اعتراضوں

۱۔ مآثر غالب: ۲۳-۲۴ (بنام میرزا احمد بیگ خان تپاں)

۲۔ ایضاً: ۲۷ (بنام میرزا احمد بیگ خان تپاں)

۳۔ کلیاتِ نثر: ۱۷۰ (محمد علی خان)

کا خوف ہے۔ صرف یہ خیال گزرتا ہے کہ اتفاق سے چند روز کے لیے یہاں آیا ہوں۔ اگر آپ لوگوں کو ناراض کر لونگا تو آپ ہی بعد کو کہینگے کہ دلّی سے ایک "شوخ چشم" اور "بے حیا" شخص آیا تھا جس نے بزرگوں سے بیکار جھگڑا کیا۔ خدا نہ کرے کہ میں اپنے وطن کی بدنامی کا باعث ہوں۔ پس معذرت خواہ ہوں¹ اور درخواست کرتا ہوں کہ آپ یہ واقعہ بھول جائیں۔ مثنوی کے آخر میں قتیل کی بھی تعریف، بلکہ ہجوِ ملیح سی کر دی، جس میں تعریض کے نشتر اتنے تیز ہیں کہ اس سے سکون ہونا تو درکنار، ناممکن تھا کہ مخالفت اور نہ بڑھ جاتی۔

حضرت صاحبِ عالم مارہروی گو میرزا کے دوست تھے، لیکن قتیل کے شاگرد تھے۔ اس لیے ہندستانی فارسی گو شاعروں سے متعلق غالب کا جو نظریہ تھا، اس سے متفق نہیں تھے۔ کہیں تیس برس بعد ایک مرتبہ ان سے اس مثنوی (بادِ مخالف) کی بات چل نکلی، تو انھیں لکھتے ہیں:

> غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ یہ مثنوی وہاں (کلکتہ میں) لکھی گئی اور ایک ایک نقل مولوی کرم حسین بلگرامی اور مولوی عبدالقادر رام پوری اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی اور ان کے امثال و نظائر کے پاس بھیجی گئی۔ اگر یہ لوگ جگہ پاتے، تو میری کھال اُدھیڑ ڈالتے۔

اس سے جناب شیخ محمد اکرام کو شبہہ[2] ہوا کہ چونکہ ان "لوگوں کے اعتراضات کا انھیں خوف تھا" اس لیے یہ نسخے انھیں بھیجے گئے تھے۔ حال آں کہ یہ سب ان کے دوست تھے۔ میرزا کی یہ عام عادت تھی کہ وہ اپنی مصنّفات دوستوں میں تقسیم کرتے رہتے تھے۔ اس موقع پر بھی انھوں نے یہی کیا اور یہ مثنوی ان کے اور ان کے "امثال و نظائر کے پاس" بھیجی۔ انھیں ان اصحاب کے اعتراضات کا خوف نہیں تھا، بلکہ وہ ایک واقعہ بیان کر رہے ہیں کہ اگر مثنوی میں کوئی غلطی

۱۔ عودِ ہندی: ۱۰

۲۔ حیاتِ غالب: ۸۲

یا قابلِ اعتراض بات ہوتی، تو یہ لوگ اس سے کبھی درگذر کرنے والے نہیں تھے؛ مجھے ضرور متنبہ کرتے۔

جن اصحاب کا نام اوپر آیا ہے، ان کے علاوہ انھوں نے اس کا ایک نسخہ مولوی محمد علی خان صدر امین، باندہ کو بھی ہدیۃً بھیجا تھا!

یہاں ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے۔
اس مثنوی کا آخری شعر ہے:

آشتی نامہ وودادِ پیام
ختم شد، والسّلام والاکرام

اس سے معلوم ہوا کہ جب یہ مثنوی لکھی گئی ہے، تو اس کا نام "آشتی نامہ" تھا، نہ کہ "بادِ مخالف"؛ یہ نام بعد کو، شاید ترتیبِ دیوان کے وقت، رکھا گیا۔ آزاد نے اس سے متعلق جو لطیفہ آبِ حیات میں لکھا ہے[۲]:

> جب مثنوی حریفوں کے جلسے میں پڑھی گئی، تو بجاے اس کے کہ کمال کو تسلیم کرتے، یا جہان سے اپنی زیادتیوں کا عذر کرتے، ایک نے عمداً کہا کہ اس مثنوی کا نام کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ بادِ مخالف۔ دوسرے نے گلستان کا فقرہ پڑھا، یکے از صلحا را بادِ مخالف در شکم پیچید۔ اور سب نے ہنس دیا۔

یہ بالکل بے بنیاد اور ان کی اپنی من گھڑت ہے۔ اس وقت اس کا یہ نام تھا ہی نہیں۔

مقدمے کا بیان

میرزا کا مطالبہ مندرجۂ ذیل امور پر مشتمل تھا[۳]: حکومت نے جب نواب احمد بخش خان کو جاگیر

۱۔ کلیاتِ نثر: ۱۷۰
یہ مثنوی کلیات میں شامل ہے (مثنوی ۵) لیکن کلیات میں جس طرح چھپی ہے، اسے نقشِ ثانی سمجھنا چاہیے۔ اس کی سب سے ابتدائی شکل نامہ ہای فارسی غالب (مرتبہ ترمذی) میں ہے۔

۲۔ آبِ حیات: ۵۲۶

۳۔ انڈیا آفس: ۵۶-۴۷

دی ہے، تو شرط یہ تھی کہ وہ اس کی بیس ہزار* جمع سالانہ حکومت کو ادا کرتے رہینگے۔ پھر جب نصراللہ بیگ خان فوت ہوئے تو فیصلہ ہوا کہ وہ ان کے سواروں کے دستے میں سے پچاس سواروں کی دیکھ بھال کرینگے اور نیز مرحوم کے پسماندگان کو گزارا دینگے۔ اور ان دونوں مدّات کے عوض میں یہ جمع معاف کردی گئی تھی۔ حکومت تحقیق کرے اور نواب شمس الدین احمد خان سے گزشتہ بیس بائیس برس کا حساب طلب کرے، تاکہ معلوم ہو کہ انھوں نے کتنے اسوار رکھے؟ ان پر کیا خرچ ہوا؟ اور نصراللہ بیگ خان کے خاندان کے گزارے کے لیے کتنی رقم ادا ہوئی؟

"نواب احمد بخش خان نے نصراللہ بیگ خان کے خاندان کے لیے خود بخود ہی پانچ ہزار سالانہ کی رقم مقرر کردی اور اس میں سے بھی ہمیں صرف تین ہزار ملے کیونکہ خواجہ حاجی کا ہمارے خاندان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ گویا وہ تمام رقم جو نواب احمد بخش خان کی جاگیر میں سے نصراللہ بیگ خان کے پس ماندگان کے لیے مقرر ہوئی تھی، اور ہمیں ملنا چاہیے تھی، اس میں سے ہمیں صرف تین ہزار سالانہ ملے، اور وہ بھی صرف دو آدمیوں کو یعنی نصراللہ بیگ خان کی والدہ (اور اب ان کی ایک ہمشیر) اور ایک بھتیجے کو، دوسرے رشتے دار نظر انداز کر دیے گئے۔ پس نہ یہ رقم ہی کافی تھی، نہ اس کی تقسیم کا طریقہ ہی درست ہے۔

"میں یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ میرے خاندان کا ایک ملازم میرے ساتھ برابر کا حصہ دار ہو۔

"اور نہ میں اس وظیفے کے لیے کسی اور کے سامنے ہاتھ پھیلانے کو آمادہ ہوں۔

"حکومت مہربانی کرکے اس معاملے کی پوری تحقیقات کرے، لارڈ لیک کی ۱۸۰۵ء اور ۱۸۰۶ء کی خط و کتابت اور سندات ملاحظہ فرمائی جائیں، جو کلکتے کے دفتر میں موجود ہونگی۔ ان سے یقیناً معلوم ہو جائیگا کہ نواب احمد بخش خان کو جو یہ تین لاکھ مالیت کی جاگیر دی گئی تھی، تو اس کے ساتھ کیا شرط وابستہ تھی، جس کی بنا پر ہمیں یہ ہزاروں

* یہاں انھیں غلط فہمی ہوئی، صحیح رقم پچیس ہزار مقرر ہوئی تھی۔

کی جمع معاف ہوئی۔ شرط یہی تھی کہ وہ اسے نصراللہ بیگ خان کے خاندان کو ادا کرینگے معلوم ہو گا کہ ہمیں تین ہزار سالانہ سے ایک حبّہ زیادہ نہیں ملا۔

"دو ہزار سالانہ جو خواجہ حاجی کو ملتے رہے، تو ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں، نہ وہ اس رقم سے کسی صورت میں بھی وضع ہونا چاہییں، جو ہمارے خاندان کے لیے مقرّر ہوئی تھی۔

"حکومت دیکھیگی کہ جو رقم اس نے پچاس اسواروں کی دیکھ بھال اور تنخواہ وغیرہ کے لیے معاف کی تھی، ان کی جگہ کوئی اسوار رکھا ہی نہیں گیا۔ بس جب وہ شرط ہی پوری نہیں کی گئی، تو معافی کس بات کی؟ لیکن اس روپے پر میرا یا میرے خاندان کا کوئی حق نہیں، یہ رقم حکومت کے خزانے میں جانا چاہیے۔

"نصراللہ بیگ خان کے پس ماندگان اور وارثوں کی تحقیق کی جائے۔ معلوم ہو گا کہ اس وقت اس کے جائز وارث صرف اس کی تین بہنیں اور دو بھتیجے ہیں۔ جو تین ہزار سالانہ ہمیں ملتا رہا ہے، اسے منہا کر کے باقی رقم ان افراد کے درجے اور ضروریات اور استحقاق کو مدّنظر رکھتے ہوتے ان میں تقسیم کر دی جائے۔ اسی اساس پر حکومت ان پانچوں افراد کا حصّہ بھی متعیّن کر دے اور ان میں سے ہر ایک کو اس کی الگ سند عطا کر دی جائے، جس کے مطابق آیندہ وہ اپنا اپنا وظیفہ حکومت کے خزانۂ دہلی سے وصول کرتے رہیں۔"

گویا مختصراً درخواست یہ تھی:

(۱) موجودہ تین ہزار (یا پانچ ہزار) کا وظیفہ ناکافی ہے اور اس کی تقسیم ٹھیک طریقے پر نہیں ہوئی؛

(۲) خواجہ حاجی (یا اس کی اولاد کو) ہمارے وظیفے میں سے کچھ نہیں ملنا چاہیے؛

(۳) تین ہزار سالانہ وضع کر کے گزشتہ اتنے برس کا بقایا ہمیں دلایا جائے؛

(۴) وظیفے حسبِ حیثیت پھر سے متعیّن کیے جائیں؛

(۵) تمام وظیفہ خواروں کو الگ الگ سند دی جائے؛ اور

(۶) یہ وظیفہ آیندہ فیروز پور کی جاگیر کی بجائے انگریزی خزانہ دہلی سے ادا ہو۔[1]

چونکہ مقدمہ شروع ہونے سے پہلے ہی نواب احمد بخش خان کا اکتوبر ۱۸۲۷ء میں انتقال ہو چکا تھا، اس لیے اب مقدمہ گویا میرزا اور نواب شمس الدین احمد خان کے درمیان تھا۔ نواب شمس الدین احمد خان نے جواب دعوی میں، ۷ جون ۱۸۰۶ء والا فارسی خط پیش کیا، جس کی رو سے پانچ ہزار کی تقسیم ہوئی تھی۔[2] میرزا کو اس دستاویز کا علم تک نہیں تھا۔ انھوں نے اسے درست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، اور کہا کہ یہ خط جعلی ہے یا کم از کم دھوکے اور فریب سے حاصل کیا گیا ہے، اور اس کے لیے دو دلیلیں ہیں۔ پہلی یہ کہ اس کی نقل دلی سے لے کر کلکتے تک کسی سرکاری دفتر میں موجود نہیں، حال آں کہ حکومتِ انگریزی کا یہ مسلمہ دستور تھا کہ جب بھی کوئی سند یا جاگیر عطا کی جاتی، تو اس کی نقل، انگریزی ترجمے سمیت مرکزی حکومت کے دفتر میں محفوظ کر لی جاتی تھی۔ اس ۷ جون ۱۸۰۶ء کے خط کی نقل نہ دلی ریذیڈنسی کے کاغذات میں ہے، نہ کلکتے کے دفتر میں؛ بلکہ گورنر جنرل کے دفترِ کلکتہ کی لارڈ لیک کے ساتھ جو سرکاری خط و کتابت موجود ہے، اس میں بھی اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ خود لارڈ لیک نے بھی کسی جگہ اطلاع نہیں دی کہ میں نے یہ سند نواب احمد بخش خان کو دی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی پشت پر انگریزی میں دستخط نہیں، جیسا کہ سرکاری دفتر کا ایسے تمام خطوط سے متعلق دستور ہے، جو فارسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ لہذا یہ خط قابلِ اعتماد نہیں اور عملدر آمد اسی ۴ مئی ۱۸۰۶ء والے حکم پر ہونا چاہیے، جو اس سے پہلے باضابطہ لارڈ لیک کے دستخطوں سے اور گورنر جنرل باجلاسِ کونسل کی منظوری سے جاری ہوا تھا۔ اور جس کی نقل سرکاری

۱۔ یہی باتیں اس قصیدے میں بھی ہیں جو انھوں نے ۱۸۳۵ء میں سر چارلس مٹکاف کی مدح میں کہا تھا (قصیدہ ۳۵)۔ البتہ اس قصیدے میں انھوں نے اپنے لیے مزید اعزاز و اکرام اور خطاب و خلعت کا اضافہ کر دیا ہے۔

۲۔ دیکھیے اوپر ص ۳۲

دفتر میں موجود ہے![1]

غالب کے دلائل اتنے معقول اور وزنی تھے کہ حکومتِ ہند کے چیف سکتر مسٹر جارج سوئنٹن کو یقین ہوگیا کہ یہ ۷ جون ۱۸۰۶ء کا خط ٹھیک نہیں۔ اس پر انھوں نے ۱۹ اگست ۱۸۳۰ء کو اس سے متعلق ایک مفصّل یادداشت قلم بند کی۔ اس میں سب سے پہلے انھوں نے پنشن کی منظوری کی پوری رُوداد بیان کی کہ یہ ابتدا میں کیسے اور کیونکر منظوری ہوئی اور اس پر عمل درآمد کیوں نواب احمد بخش خان کے سپرد کیا گیا۔ پھر غالب کا دعویٰ لکھ کر اس پر بحث کی، اور آخر میں لکھا کہ بادی النظر میں یہ ۷ جون ۱۸۰۶ء والا خط اصلی نہیں معلوم ہوتا، نہ لارڈ لیک نے اُسے جاری ہی کیا تھا؛ لہٰذا اس پر عمل نہیں ہونا چاہیے۔

اس کے بعد انھوں نے دوسرا پہلو اختیار کیا اور لکھا کہ اگر بفرضِ محال یہ خط ٹھیک بھی ہو، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ۴ مئی ۱۸۰۶ء کو ایک حکم گورنر جنرل باجلاسِ کونسل کی طرف سے جاری ہوچکا تھا، جس کی رُو سے مدّعی کے خاندان کو دس ہزار سالانہ ادا کیے جانے کی منظوری دی گئی تھی، تو کیا لارڈ لیک کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنے آپ، گورنر جنرل کی منظوری یا اُن سے استصواب کیے بغیر، یہ حکم منسوخ کرکے دوسرا حکم جاری کردیں، جس میں یہ رقم دس ہزار سالانہ سے گھٹا کر پانچ ہزار کردی گئی؟ اس کا جواب بہرحال نفی میں ہے۔ تو اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر یہ خط جعلی نہیں، بلکہ اصلی ہے، جب بھی اس پر عمل نہیں ہوسکتا![2]

چونکہ جس زمانے میں نواب احمد بخش خان نے یہ دوسرا خط حاصل کیا تھا، ان دنوں سرجان مالکم، لارڈ لیک کے سکتر تھے، اس لیے ۲۲ اکتوبر ۱۸۳۰ء کو مقدّمے کے کوائف کے ساتھ اسے حکومتِ بمبئی کے چیف سکتر کے پاس بھیجا گیا کہ سرجان مالکم سے (جو اب گورنر بمبئی تھے) دریافت کرکے لکھا جائے کہ غالب کا عذر کس حد تک قابلِ قبول ہے۔[3]

۱۔ فارن (متفرق) نمبر ۲۰۸: ۵۹-۶۴؛ نیز دیکھیے متفرقاتِ غالب: ۱۱

۲۔ اس یادداشت کے لیے دیکھیے، دستاویز محولۂ فوق: ۱۳-۲۶

۳۔ پولٹیکل، ۲۲ اکتوبر ۱۸۳۰ء (۱۸)

سرجان مالکم نے جواب دیا کہ میرے خیال میں اس شقے پر دستخط لارڈ لیک ہی کے ہیں۔ وہ زمانہ بہت مصروفیت کا تھا اور کام بہت جمع ہو گیا تھا۔ نواب احمد بخش خان بہت معزز آدمی تھے اور لارڈ لیک کو ان پر پورا اعتماد تھا۔ میں نہیں خیال کر سکتا کہ انھوں نے کوئی جعلی خط بنا لیا ہوگا۔ اگر وہ ایسا کرتے، تو ضرور اس طرح کی اور شکایتیں بھی سننے میں آتیں۔[۵]

اس پر ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ء کو میرزا کو لکھا گیا کہ گورنر جنرل باجلاسِ کونسل موجودہ انتظام میں ردّ و بدل کرنے پر تیار نہیں۔ گویا ان کا دعویٰ خارج کر دیا گیا۔

سرجان مالکم کی اس رائے نے مقدمے کا فیصلہ کر دیا اور اس کے بعد اگرچہ میرزا نے برسوں متواتر اپیلیں کیں اور بہت ہاتھ پاؤں مارے، لیکن کسی جگہ ان کی شنوائی نہ ہوئی۔ بہر حال وہ ہمّت نہیں ہارے، اور متواتر درخواستیں بھیجتے رہے۔

ولیم فریزر کا قتل

یہ پنشن کا قضیہ ابھی درمیان ہی میں تھا کہ خود نواب شمس الدین احمد خان بیچارے مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ ان دنوں دلّی میں انگریزی ایجنٹ مسٹر ولیم فریزر تھے۔ ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو شام کا کھانا انھوں نے دریا گنج میں راجہ کشن گڑھ کے ہاں کھایا۔ وہاں سے واپسی میں انھیں دیر ہو گئی۔ وہ پہاڑی پر ایک بنگلے میں رہتے تھے، جو بعد کے زمانے میں راجہ ہندو راؤ کا سکونتی مکان رہا۔ جب رات گئے گیارہ بجے کے قریب وہ واپس آ رہے تھے، تو راستے میں کسی نے ان کے مکان سے تھوڑے فاصلے پر، انھیں گولی سے ہلاک کر دیا۔ قاتل اس وقت تو بچ کے نکل گیا، لیکن فوراً تمام ناکے بند کر لیے گئے، اور تفتیش ہونے لگی۔ آخر کار پولیس نے نواب شمس الدین احمد خان کے داروغۂ شکار کریم خان کو گرفتار کر لیا۔ تھوڑے دن بعد نواب کا ایک اور ملازم واصل خان بھی مشتبہ حالات میں دلّی آتا ہوا پکڑا گیا۔ جب مزید تحقیقات ہوئی اور کریم خان کا بیان لیا گیا، تو عجیب و غریب انکشاف ہوتے۔ بلکہ بعض

---

[۵] فارن (متفرق) نمبر ۲۰۸: ۶-۷

قرائن سے شبہہ ہوا کہ خود نواب کا دامن بھی اس قتل کی ذمہ داری سے پاک نہیں۔ اس دوران میں کریم خان کا میواتی ساتھی انیا بھی جو ابھی تک مفرور تھا، سکندر آباد سے پکڑا آیا، اور سلطانی گواہ بن گیا۔ اس نے جو بیان دیا، اس سے اور کتنی باتیں معلوم ہوئیں۔ اس پر مجسٹریٹ نے نواب صاحب کو لکھا کہ تحقیقات مکمل کرنے کے لیے آپ کی مدد کی ضرورت ہے، بہتر ہو، اگر آپ فیروز پور سے یہاں دلی تشریف لے آئیں۔ نواب شمس الدین احمد خان ۱۰ اپریل ۱۸۳۵ء کو دلی پہنچے۔ یہاں جب مسٹر سائمن فریزر مجسٹریٹ نے ان سے بعض سوال پوچھے، تو ان کے جواب سے اس کی تسلی نہ ہوئی۔ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ نواب صاحب کو باہر کے لوگوں سے الگ رکھا جائے، اور تحقیقات کے دوران میں کوئی شخص ان سے ملاقات نہ کرنے پائے۔ نواب صاحب کی خواہش تھی کہ مجھے دریا گنج میں اپنے مکان میں رہنے کی اجازت دی جائے، مگر اخیر فیصلہ یہی ہوا کہ وہ پولیس کے پہرے میں کشمیری دروازے کے باہر انگریز افسروں کے بنگلوں میں رہیں۔ صرف پانچ ملازم ان کی خدمت اور گھریلو کام کاج کے لیے رکھنے کی اجازت دی گئی؛ نہ باہر کا کوئی شخص اندر جا سکتا تھا اور نہ اندر سے کوئی باہر آ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ نواب صاحب کے تمام متعلقین خصوصاً ان کے خسر میرزا مغل بیگ خان پر بھی بہت سختی کی گئی؛ ان کی خانہ تلاشی ہوئی اور کچھ دن انھیں نظر بند بھی رہنا پڑا۔

جادا دلوہارو کا جھگڑا

دراصل نواب شمس الدین احمد خان اور مسٹر ولیم فریزر کے درمیان کشیدگی پہلے سے تھی۔ کہنے والے تو بیسیوں قصے سناتے ہیں اور اس سلسلے میں گانے بھی مشہور ہیں، خدا معلوم ان میں کتنی سچائی ہے اور کتنا جھوٹ؛ لیکن اصلی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نواب احمد بخش خان کی وفات کے بعد فیروز پور جھرکہ کا علاقہ شمس الدین احمد خان کو ملا تھا اور پرگنۂ لوہارو ان کے دونوں چھوٹے بھائیوں، امین الدین احمد خان اور ضیاء الدین احمد خان، کے حصے میں آیا تھا۔ شمس الدین احمد خان نے اس تقسیم کی

مخالفت کی اور کہا کہ سب سے بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے تمام جاداد مجھے ملنا چاہیے ؛ دوسری اولاد کو زیادہ سے زیادہ وظیفہ دلایا جاسکتا ہے ۔ بالآخر پانچ چھ سال کی متواتر کوششوں کے بعد ستمبر ۱۸۳۲ء میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور لوہارو کا نظم و نسق بھی اس شرط پر ان کے سپرد کر دیا گیا کہ وہ اپنے دونوں بھائیوں کے گزارے کے لیے چھبیس ہزار روپیہ سالانہ ادا کرتے رہینگے ۔

اس زمانے میں مسٹر ولیم فریزر ریذیڈنٹ تھے ۔ انھوں نے پوری کوشش کی کہ انگریزی حکومت نواب کے اس مطالبے کو رد کر دے ۔ لیکن اس کے باوجود یہ فیصلہ ہو گیا ، تو انھوں نے دوبارہ صدر میں اس کے خلاف لکھا اور خود نواب امین الدین احمد خان کو بھی کلکتے جانے اور وہاں ذاتی اثر سے اس فیصلے کو تبدیل کرانے کا مشورہ دیا ۔ چنانچہ نواب امین الدین احمد خان ستمبر ۱۸۳۴ء میں کلکتے گئے اور وہاں تگ و دو کرتے رہے ۔ آخر کار پہلا حکم منسوخ ہوا اور لوہارو ان دونوں بھائیوں کو واپس مل گیا ۔

نواب شمس الدین احمد خان اپنی مخالفانہ کوششوں کی بنا پر ولیم فریزر سے سخت ناراض تھے اور یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں تھی کہ ان دونوں کی آپس میں نہیں بنتی ۔ اس لیے جب یہ قتل ہوا تو نواب صاحب کے خلاف شبہہ زیادہ قوی ہو گیا ۔

غالب اور فتح اللہ بیگ خان

نواب شمس الدین احمد خان کہتے تھے کہ میرا اس قتل میں کوئی ہاتھ نہیں ؛ میں بالکل بیقصور ہوں ۔ میرے خلاف یہ سب کچھ میرزا فتح اللہ بیگ خان کی سازش اور ریشہ دوانیوں کی بنا پر ہو رہا ہے ؛ وہ میرا جانی دشمن ہے اور مجھے تباہ کرنے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے ؛ وہ انعام کے وعدے کر کر کے جھوٹے گواہ بنا رہا ہے ؛ میں سرکارِ انگریزی کا وفادار اور فرمانبردار ہوں ، اور میرا کوئی قصور نہیں ہے

---

۵ پولٹیکل : ۲۷ ۔ اپریل ۱۸۳۵ء (۲۹ - ۳۰) ؛ ایضاً ۲۶ اکتوبر ۱۸۳۵ء (۹ - ۱۳) اس سلسلے میں پولٹیکل یکم جون ۱۸۳۵ء (۱۰۹ - ۱۱۰) بھی دیکھا جاسکتا ہے ۔

چوں کہ ولیم فریزر مقتول ریذیڈنٹ غالب کے گہرے دوست اور مربّی تھے، اور مجسٹریٹ شہر بھی ان کے لئے والوں میں سے تھے، اس لیئے لوگوں کو شبہہ ہوا کہ میرزا فتح اللہ بیگ خان[1] کے علاوہ غالب نے بھی نواب کے خلاف جاسوسی کی ہے۔

لیکن اگر تمام حالات پر غور کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ غالب کا دامن اس دھبّے سے پاک ہے۔

فروری ۱۸۳۵ء میں غالب کے خلاف ایک دیوانی مقدّمے میں پانچ ہزار کی ڈگری ہوگئی[2]۔ ان دنوں دستور یہ تھا کہ اگر مقروض کوئی صاحبِ حیثیت اور باوجاہت شخص ہوتا تو ڈگری کا روپیہ ادا نہ کرسکنے پر اسے صرف اسی صورت میں گرفتار کیا جاسکتا تھا، جب وہ اپنے مکان کی چاردیواری سے باہر ہو۔ یعنی اسے اپنے مکان

۱۔ فتح اللہ بیگ خان کو غالب نے نواب شمس الدین احمد خان کا ابنِ عم لکھا ہے۔ (کلیاتِ نثر: ۱۶۲) دراصل فتح اللہ بیگ خان بیٹے تھے، محمد بخش خان کے، اور محمد بخش خان کے والد تھے قاسم جان، جو نواب احمد بخش خان کے والد عارف جان کے بھائی تھے۔ اس کے علاوہ فتح اللہ بیگ خان پوتے ہوتے تھے، نواب شمس الدین احمد خان کی پھوپھی کے یعنی نواب احمد بخش خان کی ایک بہن محمد بخش خان کو بیاہی تھی (دوسری میرزا غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خان کے عقد میں تھے)

۲۔ کلیاتِ نثر: ۱۶۱؛ نیز متفرقاتِ غالب: ۹۹، ۱۰۰ (بنام ناسخ) میرزا نے ناسخ کے نام جو خط لکھا ہے (کلیاتِ نثر: ۱۶۱)، اس میں لکھتے ہیں کہ میرے خلاف دو قرض خواہوں نے پانچ ہزار روپیہ کی ڈگری لی ہے۔ یہاں انھوں نے ان کے نام نہیں لکھے، لیکن دوسری جگہ (کلیاتِ نثر: ۱۴۳) نواب حسام الدین حیدر خان کو لکھتے ہیں کہ آپ پہلے اندرجیت اور ہیرالال کو اپنے ہاں بلوا بھیجیے اور اس کے بعد مجھے بلوائیے، اور ان سے بات چیت کیجیے کہ وہ فی الحال ایک ہزار روپیہ لے کر مصالحت کرلیں۔ میرا گمان ہے کہ جن ساہوکاروں نے عدالت سے یہ ڈگری حاصل کی تھی، وہ یہی دونوں آدمی تھے۔

کے اندر سے گرفتار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بھلا غالب کے پاس اتنا روپیہ کہاں کہ وہ ادا کر دیتے۔ گرفتاری کی ذلت سے بچنے کے لیے وہ اپنا زیادہ وقت گھر پر گزارتے اور سورج ڈوبنے کے بعد رات کے اندھیرے میں سوار ہو کر نکلتے اور دوستوں سے ملتے جلتے تھے۔ اسی زمانے میں یہ قتل ہو گیا چوں کہ مجسٹریٹ بھی ان کے دوست تھے، اس لیے وہ جس طرح اور دوستوں کے پاس آتے جاتے تھے، اسی طرح ان کے ہاں بھی جاتے اور تھوڑی دیر گپ کرنے کے بعد واپس چلے آتے۔ وہاں فریزر کے قتل سے متعلق بھی گفتگو ہوتی اور جیسا کہ خود میرزا نے لکھا ہے[۱] مجسٹریٹ نے انھیں "پرشادہشں کار وحلِ اسرار" میں اپنا ہم راز بنالیا۔

اگر نواب شمس الدین احمد خان اور فریزر کے کشیدہ تعلقات کا حال سب کو معلوم تھا، تو ان کی غالب دشمنی بھی کسی سے مخفی نہیں تھی۔

غالب کا فریقِ مخالف یعنی نواب امین الدین خان اور ضیاء الدین احمد خان سے بہت میل جول تھا۔ اپنی بساط بھر وہ ہمیشہ ان دونوں بھائیوں کی مدد بھی کرتے رہے۔ مثلاً جب نواب امین احمد خان ۱۸۳۴ء میں لوہارو کی بازیافت کے لیے کلکتے گئے ہیں تو انھوں نے اپنے وہاں کے دوستوں کے نام تعارفی اور سفارشی خط لکھ کر انھیں دیے تھے۔ ان کی اسی قسم کی سرگرمیوں کے باعث شمس الدین احمد خان ان سے بہت ناراض تھے۔ لیکن وہ براہِ راست انھیں کچھ نقصان بھی نہیں پہنچا سکتے تھے! لے دے کے ان کی پنشن کی ادائی ان کے ہاتھ میں تھی، چناں چہ انھوں نے اپریل ۱۸۳۱ء میں یہ بند کر دی۔ یہ بات چھپنے والی نہیں تھی یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ سارے شہر کو علم ہو گا کہ نواب نے ان کی پنشن بند کر دی ہے۔ اور اس کے بعد موقع ملنے پر غالب بھی کھلے بندوں، نواب شمس الدین احمد خان کے خلاف ضرور باتیں کرتے رہے ہوں گے۔

سرکاری کرسی نشین اور وظیفہ یاب ہونے کی وجہ سے غالب سب افسروں سے

---

[۱] کلیاتِ نثر (غالب): ۱۶۱ (بنام ناسخ)

ملتے رہتے تھے۔ جو مجسٹریٹ اس مقدمے کی تفتیش کر رہا تھا، وہ ان کا پرانا دوست تھا اور اس کے ہاں ان کی آمد و رفت بھی تھی۔ عین مقدمے کے دوران میں بھی یہ راہ و رسم جاری رہی۔ یہیں عام لوگوں کے لیے غالب کے خلاف چہ میگوئیاں کرنے کے لیے کافی، بلکہ اس سے زیادہ، وجہ موجود تھی۔ نواب سے ان کی مخالفت، فریزر سے دوستی، ان کا مجسٹریٹ سے یارانہ اور مقدمے کے دوران میں اس کے ہاں آنا جانا؛ ظاہری قرائن سے لوگوں نے شبہہ کیا کہ غالب نے نواب شمس الدین احمد خان کی چغلی کھائی ہے اور مخبری کی ہے۔ لیکن یہ شبہہ غلط تھا اور غالب کو ایسا کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی

کریم خان اصلی قاتل، مقدمے کے آغاز ہی میں گرفتار ہو چکا تھا؛ نواب کا ایک اور ملازم بھی زیرِ حراست تھا؛ قاتل کا بیان، نواب کی اعانتِ مجرمانہ کا ثبوت تھا، اور اسی سے نواب کے خلاف شبہہ پیدا ہوا؛ ان کے فریزر سے کشیدہ تعلقات نے شبہے کو تقویت دی۔ اس پر مجسٹریٹ نے انھیں دلّی طلب کیا اور بعد کو نظر بند کر دیا۔ مقدمے کی باقاعدہ تفتیش ہوئی۔ اس دوران میں کریم خان کا ساتھی انیا بھی گرفتار ہو گیا اور اس نے سلطانی گواہ بن کر سارا راز فاش کر دیا۔

ان حالات میں کسی چغلی یا مخبری کی گنجائش ہی کہاں تھی! خود نواب شمس الدین احمد خان کو بھی غالب کے خلاف کوئی شبہہ نہیں تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، انھوں نے صرف میرزا فتح اللہ بیگ خان کو ملزم گردانا ہے، اور میرے نزدیک میرزا کو اس الزام سے بری کرنے کے لیے یہی شہادت کافی ہے۔

حاشا، غالب فرشتہ نہیں تھے کہ وہ چغلی کھانے اور مخبری کرنے سے بالا ہوں؛ آخر وہ بھی ہماری آپ کی طرح گوشت پوست کے انسان تھے۔ نواب شمس الدین احمد خان نے جو سلوک ان سے کیا تھا اور ان کے رویے سے وہ جس حد تک نالاں تھے، اس کا ثبوت ان کی کئی تحریروں سے ملتا ہے۔ ان حالات میں اگر وہ چغلی کھاتے، تو بھی ہم اسے انسانی کمزوری پر محمول کر کے، انھیں معاف کر سکتے تھے؛ لیکن

جیسا کہ میں نے کہا، حالات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انھوں نے ایسا کیا ہو۔

نواب کو پھانسی

لمبی تحقیقات اور مقدمے کے بعد کریم خان قاتل قرار پایا اور اُسے اس جرم کی پاداش میں ۲۶ اگست ۱۸۳۵ء کی صبح کو پھانسی دی گئی[۱]۔ اس کے ساتھ ہی مجسٹریٹ نے رائے دی کہ یہ قتل نواب شمس الدّین احمد خان کی شہ اور انگیخت پر ہوا ہے۔ اس لیے وہ بھی اسی سزا کے مستحق ہیں۔ چوں کہ نواب ایک ریاست کے حکمران تھے، اس لیے مجسٹریٹ کو انھیں سزا دینے کا اختیار حاصل نہیں تھا۔ اس نے مقدمے کے تمام کوائف، اپنا فیصلہ اور سزا کی تجویز لکھ کر گورنر جنرل کو کلکتے بھیج دی۔ جب نواب کو ان امور کی اطلاع ملی تو انھوں نے اپنے وکیل میرزا اسفند یار بیگ خان کو کلکتے بھیجا کہ وہ خود گورنر جنرل کی خدمت میں حاضر ہو کر عذر داری پیش کرے۔ وکیل نے کلکتے کے ایک انگریز سالسٹر مسٹر چارلس ٹھیکرے کی وساطت سے درخواست دی[۲] مگر بے کار، ۲۱ ستمبر ۱۸۳۵ء کو گورنر جنرل نے باجلاسِ کونسل یہ فیصلہ کر دیا کہ نواب شمس الدّین احمد خان کو ولیم فریزر کے قتل کی انگیخت کے جرم میں پھانسی کی سزا دی جائے، اور ان کی جاداد اور فیروزپور جھرکہ کی ریاست بحقِ سرکار ضبط کر لی جائے[۳]۔ اس حکم کی تعمیل میں ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو جمعرات کے دن صبح کے وقت نواب کو کشمیری دروازے کے باہر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ چوں کہ خطرہ تھا کہ کہیں فساد یا بلوہ نہ ہو جائے، اس لیے پھانسی کے موقع پر دیسی اور گورہ فوج کا کافی انتظام تھا۔ ایک گھنٹے تک لاش لٹکتی رہی اور اس کے بعد اسے نواب کے خسر میرزا مغل بیگ خان کے حوالے کر دیا گیا۔ انھوں نے اسے

۱۔ پولٹیکل، ۲۱ ستمبر ۱۸۳۵ء (۳۱)

۲۔ پولٹیکل، ۵ اکتوبر ۱۸۳۵ء (۱۰۵ - ۱۰۶)

۳۔ پولٹیکل، ۲۱ ستمبر ۱۸۳۵ء (۳۰ - ۳۲)

لے جاکر قدم شریف میں دفن کر دیا[1]۔ شہر میں اس واقعے سے سنسنی پھیل گئی تھی۔ نماز جنازہ میں آٹھ ہزار کا مجمع بیان کیا جاتا ہے۔ امامت مولانا محمد اسحاقؒ نے کی[2]۔ وفات کے وقت نواب کی عمر صرف پچیس برس کی تھی[3]۔

۱۔ ایضاً، ۲۶ اکتوبر ۱۸۳۵ء (۹-۱۳)

۲۔ سلطان الاخبار، کلکتہ (۲۲ نومبر ۱۸۳۵ء بحوالۂ تاریخ صحافت اردو (۱) ص ۸۸-۸۹

۳۔ مطبوعہ کتابوں میں اس موضوع پر مفصل ترین بیان وہ ہے، جو ٹھگی والے کرنیل سلیمان نے اپنی کتاب (Rambles and Recollections of an Indian Official) کی دوسری جلد کے سولھویں باب میں لکھا ہے۔

بعض اور انگریزی کتابوں میں بھی اس کا حال ہے مثلاً The Indian Criminal از ایچ۔ ایل۔ آدم، یا Twilight of the Mughals از پرسیول سپیر وغیرہ۔ اردو میں مولوی بشیر الدین احمد دہلوی نے "واقعات دار الحکومت دہلی" کے حصہ دوم (ص ۹۲-۹۴) میں اس واقعے کا مختصراً ذکر کیا ہے، اگرچہ یہ اغلاط سے پاک نہیں۔

فیروز پور جھرکہ میں ایک روایت مشہور ہے کہ نواب شمس الدین احمد خان کے زوال اور تباہی کا باعث ایک فقیر مستان شاہ کی بد دعا تھی۔ کہتے ہیں کہ نواب شمس الدین احمد خان نے قلعے میں اپنے لیے ایک کوٹھی تعمیر کرائی۔ ابھی وہ تکمیل کو نہیں پہنچی تھی کہ چونہ ختم ہو گیا اور باوجود تلاش شہر میں بھی کہیں سے دستیاب نہ ہوا۔ قلعے کے سامنے مستان شاہ کا تکیہ تھا اور وہاں کچھ تیار چونا پڑا تھا، جو اس نے مسجد تعمیر کرانے کے لیے مانگ کر رکھا تھا۔ نواب نے جب سنا کہ فقیر کے ہاں چونہ ہے تو خود جاکر اسے زبردستی اٹھوا لایا۔ مستان شاہ کی زبان سے نکل گیا کہ فقیر کا چونہ جس مکان میں لگیگا، وہ آباد نہیں ہوگا۔ خدا کی شان، بد دعا تیر بہدف ثابت ہوئی۔ اس کے بعد فریزر کا قتل ہوا اور نواب بھی اس سلسلے میں دلّی بلائے گئے۔ کوٹھی تیار کھڑی تھی۔ نواب نے فیصلہ کیا تھا کہ عید کے دن اس کا افتتاح ہوگا۔ عین نماز عید میں دلّی سے حکم پہنچا کہ فوراً یہاں آ جائیے۔ چناں چہ وہ کوٹھی میں جانے بھی نہیں پائے تھے کہ دلّی کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہاں سے واپس جانا نصیب ہی نہ ہوا۔ (مرقع اور: ۱۴۳)۔

(باقی ص ۸۵ پر)

مقدّمے کا فیصلہ

نواب شمس الدین احمد خان کی وفات اور ریاست فیروز پور جھرکہ کی ضبطی کے بعد میرزا غالب کو پنشن دہلی کلکٹری[1] سے ملنے لگی۔ لیکن ان کا مقدّمہ بدستور چل رہا تھا۔ آخر ۱۸ جون ۱۸۳۶ء کو لفٹننٹ گورنر غرب و شمال (حال یوپی) نے فیصلہ کیا کہ ۷ جون ۱۸۰۶ء کے خط کے مطابق جو ساڑھے سات سو سالانہ انھیں ملتے رہے ہیں، وہی درست ہیں۔ اور آیندہ کبھی وہ اس سے زیادہ کے حقدار نہیں۔ میرزا نے اس کے خلاف اپیل کی مگر پھر بھی یہی فیصلہ بحال رہا۔[2]

سب طرف سے مایوس ہو کر میرزا نے ۲۴ نومبر ۱۸۳۶ء کو یہ درخواست دی[3] کہ میرا مقدمہ صدر دیوانی عدالت، کلکتہ کے سامنے رکھا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر کمپنی کے ڈائرکٹروں کے پاس فیصلے کے لیے اسے ولایت بھیج دیا جائے۔ اس پر ۵ دسمبر ۱۸۳۶ء کو جواب ملا کہ مقدمے کے تمام کاغذات ولایت بھیج دیے جائینگے[4]۔ یہ اطلاع ملنے پر میرزا نے ۲۶ دسمبر ۱۸۳۶ء کو درخواست دی[5] کہ مئی ۱۸۰۶ء سے آج تک ہمیں دس ہزار سالانہ سے جتنی کم رقم ملی ہے، وہ دو لاکھ تین ہزار روپیہ بنتی ہے؛ یہ اس دو لاکھ ساٹھ ہزار سے وضع کر کے ادا کر دی جائے، جو نواب شمس الدین احمد خان نے اپنی وفات سے پہلے انگریزی خزانے میں جمع کرایا تھا۔ دوسرے

۱- مکاتیب غالب ۸۱ (مکاتیب) ۲- پولٹیکل، ۵ دسمبر ۱۸۳۶ء (۱۵۹-۱۶۱) ۳- ایضاً

۴- پولٹیکل، ۹ جنوری ۱۸۳۷ء (۱۱۷) یہ تمام کاغذات (La Belle Alliance) نامی جہاز کی ڈاک میں ۱۰ مئی ۱۸۳۷ء کو ولایت گئے تھے۔ پولٹیکل ۱۴ مارچ ۱۸۳۸ء (۲۶-۲۸) نیز ایضاً، ۲۷ نومبر ۱۸۳۹ء (۱۵۶)۔ کلیاتِ نظم فارسی کا قطعہ (۲۳) اسی موقع پر لکھا گیا تھا۔

۵- پولٹیکل، ۹ جنوری ۱۸۳۷ء (۱۱۷)

(صفحہ ۸۴ کا بقیہ) وحید الدین بیخود دہلوی مرحوم نے مجھ سے بیان کیا تھا، کہ نواب نے جب سنا کہ مستان شاہ نے بد دعا دی ہے تو اسے ایک درخت سے بندھوا کر پٹوایا بھی تھا۔ چوں کہ اپنی خاندانی روایات کے خلاف نواب شمس الدین احمد خان پیروں فقیروں کے قائل نہیں تھے، اس لیے عین ممکن ہے کہ ان سے واقعی یہ حرکت سرزد ہو گئی ہو۔

ہمیں تین ہزار سالانہ پنشن کا اپریل ۱۸۳۱ء سے لے کر اپریل ۱۸۳۵ء تک کا بقایا اس جاداد سے دلوایا جائے، جو نواب فیروز پور جھرکہ چھوڑ کے مرے ہیں اور تیسرے جب تک ولایت سے ڈائرکٹروں کا فیصلہ موصول نہیں ہو جاتا، ہمیں تین ہزار سالانہ باقاعدہ ملتا رہے۔

مگر یہ تمام درخواستیں بیکار گئیں اور ۱۸۴۲ء کے شروع میں ولایت کا آخری فیصلہ بھی ان کے خلاف ہو گیا۔ اور لکھا آیا کہ جو کچھ ہندستان میں فیصلہ ہو چکا ہے، وہی درست ہے۔ میرزا اس کے بعد بھی ناامید نہیں ہوئے۔ انھوں نے ۲۹ جولائی ۱۸۴۲ء کو اس فیصلے کے خلاف بطور اپیل ایک میموریل ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں ارسال کرنے کے لیے گورنر جنرل کو بھیجا۔ مگر اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اور آخر کار ۱۸۴۴ء میں ہر طرف سے مایوس ہو کر خاموش ہوئے![1]

خلعت اور دربار

یہ مقدمہ ۱۸۲۸ء سے لے کر ۱۸۴۴ء تک تقریباً سولہ برس چلتا رہا۔ آج جب آمد و رفت اور رسل و رسائل کی اتنی آسانیاں مہیا ہیں ہم ان مشکلات کا اندازہ نہیں کر سکتے، جو میرزا کو اس زمانے میں پیش آئی ہوں گی۔ بلا مبالغہ اس مقدمے پر ان کا ہزاروں روپیہ اٹھ گیا، جس کا بڑا حصہ انھوں نے مہاجنوں سے سود پر قرض لیا ہو گا۔ چوں کہ انھیں آخری فیصلے کے اپنے حق میں ہو جانے اور اس کے نتیجے میں ایک بھاری رقم کے ملنے کا پورا یقین تھا، انھوں نے نہ کبھی بڑی سے بڑی رقم قرض لینے سے دریغ کیا اور نہ سود کی شرح ہی کی پروا کی۔ بدقسمتی سے مقدمے کا فیصلہ ان کے خلاف ہو گیا، اور ان کی باقی عمر اس قرض کے چکانے میں کٹ گئی۔ ان کی پریشانیوں کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۳۵ء میں جب ان کے خلاف پانچ ہزار روپے کی ڈگری ہوئی ہے، تو اس زمانے میں ان پر بقول ان کے مجموعی طور پر چالیس پچاس ہزار روپیہ کا قرض تھا![2]

۱۔ اس سلسلے میں تین دستاویزیں دیکھی جا سکتی ہیں: (۱) پولیٹیکل، ۲۹ جون ۱۸۴۲ء (۱۲۸-۱۳۰)؛ ایضاً، ۲ جولائی ۱۸۴۲ء (۱۴۲-۱۴۴)؛ ایضاً، ۲۳ نومبر ۱۸۴۴ء (۷۰-۷۲)

۲۔ متفرقاتِ غالب: ۱۰۰ (بنام ناسخ)

انھوں نے مقدّمے کے آغاز میں جو مطالبے کیے تھے[1]، ان میں سے پہلے پانچ کا فیصلہ تو قطعی طور پر ان کے خلاف ہوا۔ نواب شمس الدین احمد خان کے پھانسی پا جانے سے، چھٹا خود بخود پورا ہو گیا کیوں کہ فیروز پور کی ریاست ضبط ہو گئی اور اس سے متعلق جتنی پنشنیں اور وظیفے تھے، وہ اس کے بعد انگریزی خزانے سے ملنے لگے۔ رہا آخری، تو انھیں تمام سرکاری درباروں میں کرسی نشینی اور ہفت پارچہ خلعت اور تین رقم جواہر کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ دربار کا حق انھیں لارڈ ولیم بنٹنگ کے عہد میں اس وقت ملا، جب وہ مقدّمے کے لیے کلکتے گئے ہیں[2]؛ اور خلعت کا لارڈ الن برا کے عہد میں (۱۸۴۲ء سے ۱۸۴۴ء) جب یہ مقدّمہ ختم ہونے کے قریب تھا۔ انھوں نے ۱۸۴۲ء میں کمپنی کے ڈائرکٹروں کے آخری فیصلے کے خلاف بطور اپیل ایک درخواست ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں بھیجی تھی۔ فیصلے پر تو اس کا کوئی اثر نہیں ہوا، البتہ اشک شوئی کے طور پر انھیں سرکاری درباروں میں سیدھے ہاتھ کے دسویں نمبر پر کرسی نشینی کے علاوہ خلعت کا مزید اعزاز عطا کیا گیا؛ اور دیکھا جائے تو نمبر کے لحاظ سے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ منشی حبیب اللہ خان ذکا کو لکھتے ہیں[3]:

> ۱۸۳۰ء میں کلکتے گیا۔ نواب گورنر سے ملنے کی درخواست کی۔ دفتر دیکھا گیا، میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا، ملازمت ہوئی۔ سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید، یہ تین رقم خلعت ملا۔ زاں بعد جب دلّی میں دربار ہوا، مجھ کو بھی خلعت ملتا رہا۔

قطع نظر اس سے کہ سفر کلکتہ کی تاریخ میں سہو ہوا ہے اور یہاں ۱۸۳۰ء کی جگہ ۱۸۲۸ء چاہیے، اس خط سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ دربار اور خلعت کے دونوں اعزاز اسی سفر میں عطا ہوئے۔ صحیح وہی ہے جو اوپر لکھا گیا۔ یہاں انھوں نے محض

۱۔ دیکھیے اوپر: ۷۴-۷۵

۲۔ غالب (متفرق) نمبر ۲۰۸: ۸۹-۹۰

۳۔ اردوئے معلّیٰ: ۲۷؛ ایضاً: ۴۰۶ (قدر بلگرامی)؛ خطوط غالب (۱): ۲۴۳

اختصار کی خاطر ایسا لکھ دیا ہے۔ ہاں، یہ ممکن ہے کہ قیامِ کلکتہ کے زمانے میں وہ کسی ایسے دربار میں شامل ہوئے ہوں جس میں انھیں خاص طور پر خلعت بھی ملا ہو، ورنہ اس سفر میں انھیں مستقل اعزاز صرف دربار کا ملا تھا۔

دلّی کالج کی مدرّسی

۱۸۴۰ء[1] میں میرزا کو دلّی کالج میں فارسی کی میر مدرسی کا عہدہ پیش کیا گیا، لیکن انھوں نے اپنی تنک مزاجی کے باعث اسے منظور کرنے سے انکار کر دیا۔

دلّی کالج میں مولوی مملوک العلی نانوتوی عربی کے میر مدرّس تھے، جو بقولِ مولوی کریم الدین "عالم بے بدل اور متقیِ بے مثل اور فاضلِ کامل" تھے[2]۔ کالج میں فارسی کی تعلیم کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں تھا۔ جب ۱۸۴۰ء میں حکومتِ ہند کے سکتر جیمس ٹامسن صاحب (جو بعد کو صوبۂ غرب و شمال کے لفٹنٹ گورنر ہو گئے تھے) کالج کا معاینہ کرنے کو تشریف لائے، تو انھوں نے فرمایا کہ جس طرح عربی کی تعلیم کے لیے ایک قابل مولوی صاحب موجود ہیں، اسی طرح فارسی کے لیے بھی ایک فاضل مدرّس کا انتظام ہونا چاہیے۔ مفتی صدر الدین خان آزردہ بھی معاینے کے وقت ان کے ساتھ تھے، انھوں نے کہا کہ دلّی میں تین صاحب فارسی کے استاد مانے جاتے ہیں: میرزا اسد اللہ خان غالب، حکیم مومن خان مومن، اور شیخ امام بخش صہبائی۔ اس پر ٹامسن صاحب نے پہلے میرزا کو بلوا بھیجا۔ یہ اگلے دن سوار ہو کر بنگلے پر پہنچے اور دروازے پر کھڑے، لگے انتظار کرنے کہ ابھی کوئی صاحب استقبال کو آتے ہیں۔ جب کسی نے باہر آ کے ان سے کہا کہ حضرت، تشریف لائیے، تو کہا کہ صاحب کوئی آگے سے لینے کو آئے تو اتروں۔ یہ گفتگو سن کر ٹامسن خود باہر نکل

۱۔ مولانا محمد حسین آزاد نے (آبِ حیات: ۵۰۷) سہواً اور ان کے تتبع میں مولانا حالی نے (یادگارِ غالب: ۳۹) عمداً سال ۱۸۴۲ء لکھا ہے؛ یہ غلط ہے۔ ٹھیک ۱۸۴۰ء ہی ہے، جیسا کہ (مرحوم دہلی کالج: ۱۵۲ میں) ڈاکٹر مولوی عبد الحق نے لکھا ہے۔

۲۔ طبقات الشعرار ہند: ۴۶۳

آئے اور کہا کہ چوں کہ آپ رسمی ملاقات کے لیے نہیں، بلکہ ملازمت کے لیے آئے ہیں، اس لیے کوئی پذیرائی کو کیسے حاضر ہوتا! میرزا بولے کہ ملازمت اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے میرے عزّ و قار میں اضافہ ہو، نہ کہ جو پہلے سے ہے، اس میں بھی کمی آجائے۔ اگر ملازمت کے معنی موجودہ رتبے میں بھی کمی کے ہیں، تو ایسی ملازمت کو میرا دور ہی سے سلام ہے؛ اور کہاروں کو حکم دیا کہ واپس لوٹ چلو![1]

اس پر ٹامسن صاحب نے حکیم مومن خان کو بلوایا۔ یہ پہنچے۔ جب تنخواہ کی بات چلی، تو کہا کہ مولوی مملوک العلی صدر مدرس عربی سو روپیہ مہینا پاتے ہیں، میں اس سے کم قبول نہیں کروں گا۔[2] غرض یہ بھی انکار کر کے چلے آئے۔ صہبائی کا کوئی ذریعۂ معاش نہیں تھا، انھوں نے چالیس قبول کر لیے؛ بعد کو ترقی ہوئی تو پچاس کر دیے گئے۔[3]

حادثۂ اسیری

میرزا کو شروع سے شطرنج اور چوسر کھیلنے کی عادت تھی۔ بعض اوقات دوست احباب بھی ان کے مکان پر جمع ہو جاتے؛ اس طرح ہنسی خوشی، کھیل تماشے میں وقت گزارتے۔ وہ عام طور پر تفریحاً کچھ بازی بد کر کھیلا کرتے تھے۔[4] حکام بھی ان حرکتوں سے چشم پوشی کرتے۔ فی الواقع یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات بھی نہیں تھی، کیونکہ اس زمانے میں خوش باش امیروں اور بےفکر رئیسوں کا یہ عام مشغلہ تھا۔ لیکن جونہی کوئی سنجیدہ مزاج حاکم آجاتا، یہی ہنسی کھیل کا سامان، بلائے جان بن جاتا اور

۱۔ آبِ حیات (آزاد): ۵۰۷-۵۰۸

۲۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق نے رقم نہیں لکھی (مرحوم دلّی کالج: ۱۵۳) لیکن اگر مولوی محمد حسین آزاد کی اطلاع صحیح ہے، تو ٹامسن نے انھیں اسّی روپے کی پیشکش کی تھی۔ (صحیفہ: غالب نمبر (حصّۂ اوّل): ۲۵ (حاشیہ ۱۲)

۳۔ مرحوم دلّی کالج: ۱۵۲-۱۵۳

۴۔ یادگارِ غالب: ۴۰

ان غریبوں کی شامت آجاتی۔ معلوم ہوتا ہے[۱] کہ ۱۸۴۱ء میں اسی طبیعت کے ایک تھانیدار صاحب اس علاقے میں تعینات ہو گئے۔ انھوں نے ایک دن میرزا کے مکان پر چھاپا مارا اور انھیں بعض دوستوں سمیت، کھیلتے میں گرفتار کر لیا اور پیشی پر عدالت نے سب کو جرمانہ کر دیا۔ چنانچہ میرزا کو بھی سو روپیہ جرمانے کی سزا ہوئی اور مزید یہ حکم ہوا کہ جرمانہ ادا نہ کریں، تو چار مہینے قید خانے میں رہیں۔ بظاہر انھوں نے جرمانہ ادا کر کے گلوخلاصی کرائی۔

اگر خدا انھیں توفیق دیتا تو یہی سزائے جرمانہ اُن کے لیے عبرت کا سامان بن جاتی اور وہ آیندہ کے لیے اس بُری علت سے توبہ کر لیتے۔ لیکن بچپن کی عادتیں بھلا کہیں یوں آسانی سے ترک ہوتی ہیں۔ وہ اس تلخ تجربے کے باوجود متنبہ نہ ہوئے اور بدستور اپنی دلچسپیوں میں مگن رہے۔

آخر یہ آزادہ روی رنگ لائی اور ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء[۲] کو وہ پھر جوئے کے الزام میں گرفتار ہو گئے؛ اور اب کے نتیجہ زیادہ افسوسناک نکلا۔

میرزا نے ایک خط میں لکھا ہے[۳] کہ کوتوالِ شہر میرا دشمن تھا اس لیے اس نے مجھے قمار بازی کے جرم میں گرفتار کر لیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں[۴] کہ چوں کہ میرزا، حالی کے استاد اور ممدوح تھے اس

۱۔ دیکھیے، دہلی اردو اخبار، ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء: ۴۔

۲۔ فوائد الناظرین (دہلی)، ۳ مئی ۱۸۴۷ء بحوالہ مکاتیب غالب: ۷۰ (دیباچہ) مئی ۱۸۴۷ء کی تصدیق طبقات الشعرائے ہند (ص ۳۸۰) سے بھی ہوتی ہے لیکن تاریخ کی تعیین فوائد الناظرین کی اس اشاعت سے ہوئی۔

۳۔ باغ دودر: ۱۴۳-۱۴۲ (بنام تفضل حسین خان) اسی کا اردو ترجمہ مولانا حالی نے (یادگارِ غالب: ۴۰-۴۱) دیا ہے۔

۴۔ نقشِ آزاد: ۲۰۹-۲۰۲ البتہ مولانا آزاد کا خیال کہ یہ واقعہ غالباً ۱۸۴۵ء میں پیش آیا، ٹھیک نہیں ہے؛ یہ ۱۸۴۷ء کی بات ہے۔

لیے انھوں نے تفصیل نہیں لکھی۔ حالاں کہ واقع یہ ہے کہ ان دنوں میرزا کا مکان باقاعدہ قمار خانہ بن گیا تھا۔ چاندنی چوک کے بعض جوہریوں کو جوئے کا چسکا پڑ گیا۔ ادھر میرزا کو بھی شروع سے چوسر کھیلنے کی لت تھی۔ یہ سب لوگ ان کے مکان پر جمع ہوتے اور جوا کھیلتے۔ جب تک محمد میرزا خان عرف میرزا خانی کوتوالِ شہر تھے۔ ان لوگوں کو کسی قسم کا ڈر نہیں تھا، کیونکہ وہ غالب کے گہرے دوست اور مدّاح تھے۔ ان کے جانے کے بعد فیض الحسن خان نئے کوتوال آئے۔ یہ نہ صرف ان سے واقف نہیں تھے بلکہ طبعاً کچھ سخت گیر بھی واقع ہوئے تھے اور خدا معلوم کیوں، انھیں میرزا سے عداوت پیدا ہو گئی۔ ادھر حکام بھی اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح شہر سے جوئے کی وبا کم ہو۔ پس ایک دن فیض الحسن خان کوتوال رتھ میں برقندازوں کو لے کے میرزا کے مکان پر پہنچ گیا۔ اطلاع کرائی کہ کچھ زنانی سواریاں آئی ہیں، جس پر کسی نے ان کے داخلے پر اعتراض نہیں کیا۔ لیکن جب اندر جانے پر بھید کھلا، تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مزاحمت ہوئی جس پر پولیس کو سختی کرنا پڑی اور نوبت زدوکوب تک پہنچی۔ بہرحال میرزا جوا خانہ قائم کرنے کے جرم میں دھر لیے گئے۔[1] مقدمہ کنور وزیر علی خان مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا[2]۔ خود بہادر شاہ ظفر نے ریذیڈنٹ کے نام چِٹھی لکھی۔ شہر کے رؤسا کی طرف سے بھی سفارشیں گئیں۔ غرض بہت کوشش ہوئی کہ کسی طرح میرزا سزا سے بچ جائیں، لیکن بے سود؛ ان کوششوں اور اپیلوں سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اپیل میں سشن جج نے بھی عدالتِ ماتحت کا فیصلہ بحال رکھتے ہوئے چھ مہینے قیدِ بامشقت اور دو سو روپیہ جرمانہ کی سزا کا حکم دے دیا اور لکھا کہ جرمانے کی عدم ادائی کی صورت میں، چھ ماہ مزید قید اور اگر اصل جرمانے کے علاوہ اور پچاس روپے ادا کر دیں، تو مشقت معاف ہو جائیگی[3]۔ لیکن میرزا پورے چھ مہینے قید میں نہیں رہے بعد

۱۔ کلام عاصی (منشی گھنشیام لال عاصی دہلوی): ۲۶۳-۲۶۴

۲۔ لال قلعہ کی ایک جھلک (ناصر نذیر فراق): ۳۳

۳۔ دلّی کا آخری سانس: ۱۴۴

تین مہینے بعد ڈاکٹر راس سول سرجن دہلی کی سفارش پر رہا کر دیے گئے[۱]۔
اگرچہ یہ قید محض نظر بندی تھی، کھانا کپڑا سب کچھ گھر سے جاتا تھا، دوست احباب کی ملاقات پر بھی کوئی خاص پابندی نہیں تھی، مگر پھر بھی قید تھی، اس لیے قدرتی طور پر میرزا جیسے خوددار شخص نے اسے بہت محسوس کیا۔ لکھتے ہیں[۲]:

من خود ازاں رو کہ ہر صفت و ہر فعل و ہر امر را از کردگار می نگرم، وستیزہ با کردگار روا نبود، از آنچہ رفت، آزادم و بدانچہ رفت، شادم۔ اما چوں آرزو منافیِ آئینِ بندگی نیست، شعر:

عشق است و صد ہزار تمنا، مرا چہ جرم!
گر خواہشے کند دلِ شیدا، مرا چہ جرم!

خواہم سپس در جہاں نہ باشم؛ و اگر باشم، در ہندوستاں نہ باشم؛ روم است و مصر است و ایران است و بغداد است، و گر نہ خود کعبہ پناہِ آزادگاں و سنگِ آستانۂ رحمۃ للعالمین تکیہ گاہِ دلدادگاں بس است۔ کے بود، آیا کہ از بندِ فرماندگی کہ خود ازاں بند کر رفت، رواں فرسا تر است، بروں جہم و منزلے در نظر نیا وردہ سر بصحرا نہم! آنست آنچہ بر ما رفت، و اینست آنچہ می خواہم۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس قید سے ان کے عزّ و وقار کو سخت نقصان پہنچا، لیکن یہ علم و ادب کے لیے عظیم الشّان فائدے کا باعث ثابت ہوئی۔ قید خانے میں جو ترکیب بند[۳] انھوں نے لکھا ہے اور جسے ہم موضوع کی مناسبت سے "اسیریہ" کہہ سکتے ہیں، وہ فارسی نظم کے سرمایے میں بیش بہا اضافہ ہے۔ اسلوبِ بیان اور سوز و گداز اور شدّتِ جذبات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے یہ خاقانی کے حبسیّہ سے کسی طرح کم نہیں؛ بلکہ بعض مقامات پر تو یقیناً اس سے بڑھ گیا ہے۔

۱۔ کلامِ حاصی: ۲۶۴
۲۔ باغِ دو در: ۱۴۹-۱۵۰۔ اسی کا ترجمہ یادگارِ غالب: ۴۰-۴۱ میں ہے۔
۳۔ یہ ترکیب بند سبدِ چین میں شامل ہے (ص ۲۴-۳۰)

زمانۂ اسیری میں عام طور پر ان کے دوستوں نے ان سے بہت ہمدردی اور خلوص کا اظہار کیا، خصوصاً نواب محمد مصطفےٰ خان شیفتہ نے ہر طرح سے ان کی مدد کی۔ قید کا سارا زمانہ ان سے جیل خانے میں جا جا کر ملتے رہے۔ مقدمے کا سارا خرچ بھی انہی نے اپنی جیب سے ادا کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس سلسلے میں حالی مرحوم سے روایت کرتے ہیں:[۵]

جونہی انھیں (یعنی شیفتہ کو) اس واقعہ کی خبر ملی، فوراً ایک ایک حاکم سے جاکر ملے اور میرزا کی رہائی کے لیے بہیم کوششیں کیں۔ پھر جب مقدمہ چلا تو، اس کی اپیل کی گئی تو تمام مصارف اپنے پاس سے ادا کیے۔ جب تک میرزا قید خانے میں رہے، ان کا معمول تھا کہ ہر دوسرے دن سوار ہو کر قید خانے میں جانا اور میرزا سے ملاقات کرنی۔ وہ لوگوں سے کہتے تھے: مجھے میرزا سے عقیدت ان کے زہد و اتقا کی بنا پر نہ تھی، فضل و کمال کی بنا پر تھی: جوئے کا الزام آج عائد ہوا، مگر شراب پینا تو ہمیشہ سے معلوم ہے۔ پھر محض اس الزام و گرفتاری کی وجہ سے میری عقیدت کیوں متزلزل ہو جائے! گرفتاری کے بعد بھی ان کا فضل و کمال ایسا ہی ہے جیسا پہلے تھا۔

میرزا نے اس ترکیب بند میں شیفتہ کی ہمدردی اور دلسوزی کا جس گرم جوشی اور خلوص سے اعتراف کیا ہے، وہ دونوں کے لیے ہمیشہ قابلِ فخر رہیگا۔

مالی مشکلات

غالب کے لیے یہ بڑی سختی کے دن تھے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ پچھلے بیس پچیس برس سے نہایت پریشانی کے عالم میں بسر کر رہے تھے۔ کلکتے سے واپس آنے کے بعد ۱۸۳۳ء میں تو ان کی حالت اس درجہ نازک ہو گئی تھی کہ مجبور ہو کر وہ اس پر بھی تیار ہو گئے تھے کہ ہندستان کے کسی والیِ ریاست کی ملازمت اختیار کریں۔ لیکن اس بے بسی کے عالم میں بھی فطری خودداری اور اپنے کمال کا احساس انھیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ خود کسی کے آگے ہاتھ پھیلائیں، بلکہ چاہتے

---

۵ نقشِ آزاد: ۲۸۳؛ نیز دیکھیے یادگارِ غالب: ۴۱-۴۲

تھے کہ کوئی قدردان اور پایہ شناس رئیس میرے شایانِ شان اعزاز و اکرام سے مجھے اپنے پاس بلالے۔ چنان چہ لکھتے ہیں:[1]

حالیا برآں سرم کہ اگر کسے از جاہمندانِ ہندستان بمن پرداز دو بہ ہنجارِ اندازۂ نگاہ داریِ قانونِ پایہ شناسی، مرا بسوے خود خواند، دل بہ بیچاکِ طرۂ دل آویزِ گردِ رہش بندمے، و رختِ سفر بسایۂ دیوارِ قصرِ والا ایش کشایمے۔

اور غالباً یہی وجہ ہوئی کہ نہ وہ کسی جگہ جاسکے، نہ ان کی مالی پریشانیوں کا خاتمہ ہوا۔ وہ خود سلسلہ جنبانی کر نہیں سکتے تھے، ادھر ہمارے رئیسوں کو دنیا جہان کی دوسری لغویتوں سے اتنی فرصت کہاں کہ وہ ایک شاعر اور ادیب کی بے طلب قدر افزائی کریں۔

لطیفہ

۱۸۳۵ء میں جب ان پر پانچ ہزار روپیے کی ڈگری ہوئی ہے، تو اس زمانے میں بقول ان کے ان پر چالیس پچاس ہزار کا قرض تھا[2]۔ ناسخ نے انھیں لکھنؤ سے لکھا کہ آج دکن میں ہُن برس رہا ہے۔ حیدرآباد میں مہاراجا چندو لال اہلِ کمال کا قدردان موجود ہے۔ اگر آپ وہاں چلے جائیں، تو سب دلدّر دور ہو جائینگے۔ میرزا نے جواب دیا کہ پہلے تو قرضہ ادا کیے بغیر یہاں سے ہلنا محال ہے۔ پھر اگر وہاں جاؤں بھی، تو چندو لال غریب میری کیا قدر کریگا، اسے میرے طرزِ سخن کی ہوا تک نہیں لگی اور اس کے کان اس آواز سے آشنا نہیں۔ جہاں فارسی میں قتیل اور اُردو میں شاہ نصیر استاد مانے جاتے ہوں، وہاں غالب اور ناسخ کو کون پوچھتا ہے۔ مزید برآں وہ اسّی برس کا بڈھا خود قبر میں پانو لٹکائے بیٹھا ہے۔ جب تک

۱۔ مآثرِ غالب: ۲۰ (بنام خواجہ فخرالدین)

۲۔ متفرقاتِ غالب: ۱۰۰ (بنام ناسخ)

میں حیدر آباد پہنچوں، وہ آپ عدم آباد پہنچ چکا ہو گا![1]

> انصاف بالاے طاعت است۔ عزیمتِ سفرِ بے گسستنِ بندِ دام امضا پذیر نیست، و چوں ایں بند گسستہ و ایں سنگ از راہ برخاستہ شد، حیف باشد کہ جز راہِ نجف پویم، و واے برمن، اگر جز وَے جویم۔ چند دلال زمزمۂ ما را چہ داند و ہنجارِ ما را کے دریابد۔ آں کہ در پارسی قتیل را باوستادی گیرد، غالب را چہ می کند! و آں کہ در اردو نصیر را ستاید، ناسخ را چہ می کند و خود عمرش از ہشتاد متجاوز است، تا باُو می رسم، اُو بہ جہنّم می رسد۔

مالی تنگی کا یہ دور بہت دن تک رہا۔ قرضخواہوں نے یہ صورتِ حال دیکھی تو ہر طرف سے یورش کر دی اور مقدّمے دائر کرنے لگے۔ اسی طرح کے ایک اور مقدّمے سے متعلق کلکتے کے مشہور اخبار "جام جہاں نما" کی ایک اشاعت میں مندرجۂ ذیل خبر ملتی ہے[2]:

> عرض شد، کہ میرزا اسد اللہ خان براے ملاقات یوسف خان رفتہ بود۔ در اثناے راہ چپراسیِ عدالت بابتِ نالشِ دو صد و پنجاہ روپیہ میکفرسن صاحب او را گرفتار نمودہ، در مکانِ ناظر بُردہ، قید نمودہ امین الدین خان چہار صد روپیہ مع اصل و سُود دادہ، او را رہا کنانیدند۔

یہ میکفرسن صاحب اس زمانے کے ایک مشہور شراب فروش انگریز دوکاندار تھے، جہاں سے میرزا بھی اپنی ضرورت کا سامان منگواتے رہتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی پریشانیوں کا یہ سلسلہ عرصے تک رہا۔

قلعے کی ملازمت

لیکن یہ فاقہ مستی کب تک چل سکتی تھی! پیٹ بھرنے کو روٹی اور تن ڈھانکنے کو

۱۔ متفرقاتِ غالب: ۱۰۱-۱۰۲ (بنام ناسخ)

۲- جام جہاں نما (کلکتہ) نمبر ۸۳، ۷، جون ۱۸۳۲ء

کپڑا درکار ہے؛ یہ کام نری شاعری سے تو نہیں ہو سکتا۔ لے دے کے پنشن کے ساڑھے باسٹھ روپے مہینا تھے۔ ناکھیاں سے فتوح کا سلسلہ غالباً بند ہو چکا تھا؛ اور کوئی آمدنی کی صورت نہ تھی۔ وہ شروع سے آرام و آسایش بلکہ اسراف کی زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ عسیرُ الحالی ان پر بہت شاق گذرتی ہو گی۔ ان کے دوستوں کو بھی فکر ہوئی۔ آخر یہ تجویز ٹھہری کہ کسی طرح میرزا کا تعلق قلعۂ معلیٰ سے ہو جائے۔ میرزا کے کلام سے شہادت ملتی ہے کہ ان کے دربار سے بعضا بطہ اور غیر مستقل رنگ کے تعلقات بہت زمانے سے تھے؛ لیکن یہ تعلق بس اتنا ہی تھا کہ عید، بقرعید یا کسی شادی بیاہ کی تقریب پر قصیدہ یا قطعہ پیش کر دیتے تھے؛ مستقل طور پر وہ کبھی ملازمانِ شاہی میں شامل نہیں ہوئے۔ اور گمانِ غالب یہ ہے کہ انھوں نے خود بھی شاید اس کے لیے کوشش نہیں کی۔ ذوق ۱۸۰۸ء سے استادِ ظفر تھے۔ ان کی موجودگی میں کوئی اور استادِ شاہ اور ملک الشعرا تو ہو نہیں سکتا تھا؛ اور غالب اس سے کم پر قناعت نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ درباری کونسا سنجر اور ملک شاہ، یا جہانگیر اور شاہ جہان کا دربار تھا کہ انھیں اس سے کوئی زیادہ توقع ہو سکتی۔ جس زمانے میں ظفر ابھی ولی عہد تھے، ذوق کو چار روپیہ مہینا ملتا رہا۔ جب تخت پر بیٹھے، تو تیس پانے لگے؛ بعد کو اور اضافہ ہوا، تو سو ہو گئے۔[1]

مگر برا ہو احتیاج کا! جب سب طرف سے مایوس ہو گئے، تو آخر انھوں نے بادشاہ کی "وظیفہ خواری" اور "دعاگوئی" پر آمادگی کا اظہار کیا۔ مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے مولانا نصیر الدّین عرف میاں کالے، بہادر شاہ ظفر کے پیر تھے اور غالب کے بھی دلی دوست اور پرانے مہربان۔ ان کے علاوہ احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خان مدار المہام بھی ان کے خاص قدردان تھے۔ ان صاحبوں نے سفارش کی اور بہادر شاہ نے منظور کر لیا کہ میرزا خاندانِ تیموری کی تاریخ فارسی زبان میں لکھیں۔ میرزا جمعرات کے دن ۴ جولائی ۱۸۵۰ء (۲۳ شعبان ۱۲۶۶ھ) کو بادشاہ کے حضور

---

[1] آبِ حیات، ص ۴۴۲، ۴۵۷، ۴۵۸

میں پیش ہوئے۔ ظفر نے "نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ" کہہ کر خطاب کیا۔ کارپردازوں نے بادشاہ کے حکم سے چھ پارچے اور تین رقم جواہر کا خلعت پہنایا، پچاس روپیہ مشاہرہ مقرر ہوا اور یوں میرزا باقاعدہ قلعے کے ملازم ہو گئے۔[۲]

مولانا محمد حسین آزاد اس تقرر پر بڑی دور کی کوڑی لائے ہیں۔ لکھتے ہیں[۳]:

حکیم احسن اللہ خان طبیب شاہی تھے اور بڑے مقرب تھے، انہی کے پاس بادشاہ کی غزلیں جمع ہوا کرتی تھیں، وہی دیوانِ ظفر ترتیب دیتے تھے اور مرتب کر کے چھپواتے تھے۔ مطبع سلطانی انہی کے اہتمام میں تھا۔ سخن کے جوہر شناس تھے۔ استاد (ذوق) کا کلام بھی شوق سے لکھوا لیتے تھے ...... کلام کی محبت سے استاد سے محبت رکھتے تھے، مگر خلیفہ صاحب (یعنی محمد اسمٰعیل خلف استاد ذوق) کے سبب سے کھٹکتے تھے۔ خیال تھا کہ حضور پھر انھیں خدمت سپرد نہ کر دیں۔ ان کے سامنے حکیم صاحب کے اختیار ضعیف ہو جاتے تھے۔ اسی لیے میرزا نوشہ غالب مرحوم کو حضور میں پہنچایا تھا، حال آں کہ استاد نے ترقی و تنزلِ خلیفہ کے کسی معاملے میں کبھی دخل ہی نہیں دیا۔

مولانا نے یہ تمہید ذوق مرحوم کی اس غزل پر لکھی ہے، جس کا مطلع ہے:

ہم سے ظاہر و پنہاں، جو اُس غارت گر کے جھگڑے ہیں
دل سے دل کے جھگڑے ہیں، نظروں سے نظر کے جھگڑے ہیں

حافظ محمود شیرانی مرحوم نے ثابت کر دیا ہے[۴] کہ یہ غزل مولانا آزاد نے خود کہی اور

۱۔ کلیاتِ نثرِ فارسی: ۲۷۱۔ یہاں غلطی سے ۴ جولائی کی جگہ ۴ جون لکھا گیا ہے؛ ۲۳ شعبان کو ۴ جولائی تھی اور ۴ جون کو ۲۲ رجب۔

۲۔ ایضاً: ۲۷۱ - ۲۷۲۔

۳۔ دیوانِ ذوق (مرتبہ آزاد): ۱۲۷۔

۴۔ ماہی ہندستانی (الہ آباد) ۱۹۴۷ء: ۷

اپنے استاد کے نام سے منسوب کرکے ان کے دیوان میں شامل کر دی۔ جب غزل کی حقیقت یہ ہے، تو اس کی تمہید میں جو کچھ لکھا گیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ بھی افسانے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ پھر ان کا استدلال بھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ خلیفہ محمد اسمٰعیل کے ملازمِ قلعہ ہونے سے حکیم احسن اللہ خان کا اختیار کیونکر کم ہو جاتا تھا۔ جب باپ کے سامنے، جو ظفر کے استاد تھے، ان کے اختیارات ضعیف نہ ہوئے، تو بیٹے کے سامنے کیا ہوتے!

قلعے کا یہ دستور تھا کہ ملازموں کی تنخواہ سال میں دو بار بٹتی تھی۔ ہر ششماہی کے خاتمے پر ان چھ مہینوں کا چٹھا بانٹ دیا جاتا۔ غالب کی ضرورتوں کے سامنے اول تو ان پچاس روپوں ہی کی کیا ہستی تھی، پھر اس پر وہ بھی ملیں چھ چھ مہینے بعد۔ پہلی چھماہی تو انھوں نے جوں توں کاٹی، لیکن جنوری ۱۸۵۱ء میں یہ درخواست پیش کی کہ آپ کی ذرّہ نوازی نے مجھ بے ہنر کو اپنی ملازمت کا شرف بخشا اور روزینہ مقرّر فرمایا، لیکن اس کے ملنے کا عجیب ہنجار ہے، چھ چھ ماہ بعد ملتا ہے۔ مجھے ذوقِ آرائش نہیں کہ طرّہ و دستار مانگوں، مگر ان روزمرہ کی ضرورتوں کا کیا کروں؛ انھیں اتنی مدّت کے لیے ملتوی نہیں کر سکتا۔ مجبور ہو کر قرض لیتا ہوں۔ لیکن آئے دن قرض لینے سے مہاجن سُود کی شرح زیادہ مقرر کرتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی چھماہی میں سے ایک تہائی سود میں چلی گئی۔ پیر و مرشد!

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا! آپ کا نوکر، اور کھاؤں اُدھار!

میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

یقین ہے کہ اس کے بعد "غدر" تک انھیں یہ تنخواہ ماہ بماہ ملتی رہی ہوگی، کیونکہ دوسری صورت میں ان کا ارادہ تھا کہ اگر تنخواہ ہر مہینے نہ ملی، تو اس خدمت کو میرا سلام ہے۔ اور وہ اس کے بعد بھی تاریخ نویسی کا کام کرتے رہے۔

ﮯ خطوطِ غالب: ۱۰۵ (بنام حقیر)؛ نیز یادگارِ غالب: ۱۹۰

استادِ ظفر

جیسا کہ میرزا نے خود لکھا ہے[1] ۱۸۵۴ء میں ولی عہدِ سلطنت فتح الملک میرزا محمد سلطان غلام فخرالدین رمز عرف میرزا فخرو ان کے شاگرد ہوئے، تو ان کی سرکار سے چار سو روپیہ سالانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ اسی سال ۱۵ نومبر (۲۳ صفر ۱۲۷۱ھ) کو ذوق نے وفات پائی اور اس کے بعد بادشاہ نے بھی میرزا سے اصلاح لینا شروع کی، اگرچہ بقولِ مولانا حالی میرزا "اس کام کو بادلِ ناخواستہ سرانجام کرتے تھے"[2] ان کے علاوہ ظفر کے سب سے چھوٹے شہزادے میرزا خضر سلطان[3] نے بھی ان کی شاگردی اختیار کی، اور غالباً اسی سال نواب واجد علی شاہ کی طرف سے بھی پانچ سو روپیہ سالانہ مقرر ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد وہ بہت حد تک اطمینان کی سانس لینے کے قابل ہوگئے ہونگے۔ مگر بدقسمتی سے یہ صورتِ حال زیادہ دن قائم نہ رہ سکی۔ دو برس بعد ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کو میرزا فخرو نے ہیضے[4] سے انتقال کیا۔ ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو سرکارِ انگریزی نے سلطنتِ اودھ کا الحاق کر دیا[5] اور اس کے بعد ۳ مارچ کو واجد علی شاہ لکھنؤ سے کلکتے چلے گئے، جہاں انھیں مٹیا برج میں نظر بند کر دیا گیا۔ اسی ۱۸۵۷ء میں "غدر" ہوگیا۔ میرزا خضر سلطان ستمبر ۱۸۵۷ء میں مقبرۂ ہمایون میں گرفتار ہوئے اور دلی کے باہر کپتان ہاڈسن کی گولی کا نشانہ بنے۔ ظفر پر باغیوں کی اعانت کے جرم میں مقدمہ چلا اور وہ اکتوبر ۱۸۵۸ء میں رنگون بھیج دیے

۱۔ اردوے معلیٰ: ۱۰۵ (بنام عبدالغفور سرور)

۲۔ یادگارِ غالب: ۴۶

۳۔ یہ وہی خضر سلطان ہیں، جن کی پیدائش پر میرزا نے لکھا تھا:

خضر سلطان کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز — شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

۴۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ میرزا فخرو ولی عہدی کے جھگڑوں اور رقابتوں کا شکار ہوئے، اور ان کی موت زہر خورانی سے ہوئی تھی۔

۵۔ تاریخِ اودھ (۵): ۲۶۵-۲۷۰۔

گئے، جہاں جمعہ کے دن، ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو ان کی وفات ہوئی۔ سچ ہے ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

"غدر"

اس ہنگامے کے مختصر حالات میرزا نے اپنی فارسی تصنیف دستنبو میں لکھے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو دیسی فوج شہر میں داخل ہوئی اور اسی دن میں نے مکان کا دروازہ بند کر کے باہر کی آمد و رفت ترک کر دی۔ لیکن اس میں انھوں نے مبالغہ کیا ہے۔ وہ خود ایک خط میں نواب محمد یوسف علی خاں والیِ رامپور کو لکھتے ہیں:[1]

> دریں ہنگامہ خود را بکنار کشیدم و بدیں اندیشہ کہ مبادا، اگر یک قلم ترکِ آمیزش کنم، خانۂ من تباراج رود و جان در معرضِ تلف اُفتد، بباطن بیگانہ و بظاہر آشنا ماندم۔

اس کے علاوہ بعض اور مصنفین[2] کے بیانات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ قلعے بھی جایا کرتے تھے۔ دلّی پر قبضہ کرنے کے بعد دیسی سپاہ نے بہادر شاہ ظفر کے "شہنشاہِ ہندستان" ہونے کا اعلان کر دیا۔ میرزا نے دل میں سوچا ہوگا، خدا جانے، اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؛ لہٰذا مصلحت اسی میں ہے کہ یکا یک تعلقات منقطع نہ کیے جائیں۔

اس زمانے میں میرزا محلہ بلّی ماران میں رہتے تھے۔ اسی محلّے میں حکیموں کے مشہور شریف خانی خاندان کی سکونت تھی۔ چونکہ یہ لوگ ریاست پٹیالہ میں ملازم تھے، اس لیے مہاراجہ پٹیالہ نے انگریزوں سے کہہ کر اس محلّے کے سرے پر دیوار کھنچوا دی تھی، تاکہ باہر کا آدمی اندر نہ جانے پائے؛ اور اپنے آدمیوں کا پہرہ بٹھا دیا کہ کوئی فوجی گورا لوگوں کو دق نہ کر سکے۔ اس کے باوجود ان غریبوں کو طرح طرح کی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور تو اور انھیں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ انگریزوں کے دلّی فتح کر لینے

۱۔ مکاتیب غالب: ۹ (مکاتیب)

۲۔ مثلاً غدر کی صبح شام: ۱۶۹؛ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ: ۵۹ نیز ۹۳

کے بعد ہی کوچہ بندی سے باہر جا کر پینے کا پانی تک لاسکیں۔ خوش قسمتی سے ایک دن ابرِ رحمت برسا اور ان لوگوں نے چادریں تان تان کر گھر بھر کے برتن بھر لیے۔

فساد شروع ہوتے ہی میرزا کی بیوی نے ان سے پوچھے بغیر اپنا تمام زیور اور قیمتی کپڑے میاں کالے صاحب کے مکان پر بھیج دیے تھے۔ انھیں خیال ہوگا کہ یہ چیزیں وہاں زیادہ محفوظ رہینگی کیونکہ ان کے ساتھ ایک طرح کا مذہبی تقدس وابستہ تھا اور گمان تھا کہ فوجی ان کا احترام کرینگے، اور ان کا گھر نہیں لوٹینگے، مگر میاں کالے کا مکان بھی تاراج ہوا اور ان کے اپنے سامان کے ساتھ میرزا کی بیگم کا سامان بھی لٹ گیا![1]

اس ہنگامے میں دلّی کی اسلامی آبادی خاص طور پر قابلِ عتاب ٹھہری تھی۔ جو لوگ مجرم تھے، ان کے لیے تو ڈرنے کا مقام تھا ہی، دوسرے بیگناہ بھی جان و مال اور ناموس کی خاطر شہر چھوڑ چھاڑ کر بھاگ گئے۔ میرزا کے اکثر دوستوں پر یہی افتاد پڑی اور وہ مدتوں مصیبتوں کا نشانہ بنے، مارے مارے پھرتے رہے۔

یہ ایام میرزا پر بھی نہایت مصیبت کے گذرے، آمدنی بالکل مفقود اور خرچ بدستور۔ بارے، ان کے بعض ہندو دوستوں نے اس زمانے میں ان کی خبر گیری کی۔ منشی ہرگوپال تفتہ میرٹھ سے روپیہ بھیجا کیے۔ لالہ مہیش داس شراب مہیا کرتے رہے۔ ان کے علاوہ منشی ہیرا سنگھ درد، پنڈت شیوجی رام اور ان کے بیٹے بال مکند نے بھی حتی الوسع ان کی خدمت میں کوتاہی نہیں کی۔ میرزا نے دستنبو میں ان سب کا ذکر کیا ہے[2]۔ لکھتے ہیں کہ میں نے ان حضرات کا ذکر اس لیے کیا کہ جہاں ان کی عنایتوں کا شکریہ مجھ پر واجب تھا، وہیں میں چاہتا ہوں کہ میرے دوستوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ میرے جیسا کثیر الاحباب شخص جس کا ہر گھر میں دوست اور ہر کوچے میں آشنا ہوا کرتا تھا، اس زمانے میں کیسے بسر کرتا رہا۔ اگر شہر میں یہ چار دل صاحب بھی موجود نہ ہوتے، تو کوئی میری بیکسی کا گواہ تک نہ ہوتا۔

۱۔ کلیاتِ نثر: ۴۰۹

۲۔ کلیاتِ نثر: ۴۰۷ - ۴۰۹

لطیفہ

پیر کے دن ۵ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو صبح کے وقت چند گورے کوچہ بندی کی دیوار پھاند کر محلّے میں گھس آئے۔ مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں نے انھیں روکنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کی ایک نہ چلی۔ گوروں نے لوگوں کے مال اسباب کو تو ہاتھ نہ لگایا، لیکن میرزا اور ان کے ہمسایوں میں سے چند آدمیوں کو پکڑ لے گئے۔ اور کرنیل برن[1] کے سامنے پیش کر دیا۔ دراصل تفتیش ہو رہی تھی کہ شہر میں کون کون سے محلّے میں مسلمان مقیم ہیں۔ کرنیل برن نے ان لوگوں سے نام اور مقام اور پیشے وغیرہ کی کیفیت پوچھی۔ جب میرزا کی باری آئی، تو اس نے ان کی کلاہِ پاپاخ اور ایرانی وضع پر متعجب ہو کر ان سے پوچھا، "وَل ٹم مسلمان"! انھوں نے جواب دیا: "حضور، آدھا" کرنیل صاحب حیران کہ یہ کیا کہتے ہیں۔ پوچھنے پر بولے: "قبلہ، شراب پیتا ہوں، سؤر نہیں کھاتا، اس لیے آدھا کہا"۔ سب ہنس پڑے۔ انھیں اور ان کے ساتھ دوسروں کو بھی ہنسی خوشی واپس آنے اور محلّے میں بدستور مقیم رہنے کی اجازت مل گئی[2]۔

میرزا غلام حسن خان محو نے لکھا ہے کہ جب یہ برن صاحب کے سامنے گئے تو وہاں اتفاق سے ان کے کوئی دوست بیٹھے تھے۔ انھوں نے صاحب سے ان کی سفارش کر کے رہائی دلوا دی[3]۔

۱۔ اس شخص کا نام میرزا کی تحریروں میں کئی جگہ آیا ہے اور سب جگہ انھوں نے براؤن (Brown) لکھا ہے۔ "غدر" کے حالات میں ایک کرنیل برن (Burn) کا نام ملتا ہے، پورا نام (Henry Pelham Burn) تھا۔ مثلاً دیکھیے ۱۸۵۷ء، مصنفہ سین، (ص ۱۱۹)۔ یہ ہنگامے کے بعد دلّی کا فوجی گورنر مقرر ہوا تھا۔ گمانِ غالب ہے کہ میرزا کی مراد اسی شخص سے ہے، وہ برن کی جگہ براؤن لکھتے رہے، صحیح برن ہوگا۔

۲۔ یادگارِ غالب: ۵۰؛ نیز کلیاتِ نثر: ۳۹۶

میرزا کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ لطیفہ اور سوال و جواب خود کرنیل برن سے نہیں پیش آیا تھا، بلکہ راستے میں یہ گفتگو گورے سارجنٹ سے ہوئی تھی۔ (انتخابِ غالب: ۴۱)

۳۔ غدر کا نتیجہ: ۶۵۔

بہر حال رسیدہ بود بلائے، و لے بخیر گزشت۔

میرزا یوسف کی وفات

بدقسمتی سے انہی دنوں ان کے چھوٹے بھائی میرزا یوسف نے انتقال کیا۔ میرزا یوسف بھی دلّی میں فراش خانے کے قریب سرس کی گلی میں تنہا رہتے تھے۔ اس ہنگامے میں ان کی بیوی اور لڑکی انھیں اکیلا چھوڑ کر آپ بچوں سمیت جے پور چلی گئی تھیں[1]۔ ان کے اکیلے ہونے کے باعث بہت فکر مند تھے اور شہر کی جو حالت تھی اور کہیں جانا آنا جتنا خطرناک تھا، اس کے پیشِ نظر یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ انھیں اپنے پاس لے آئیں۔ میرزا یوسف کے ساتھ ایک بوڑھی ماما اور ایک بوڑھا ملازم تھے۔ ایک دن معلوم ہوا کہ گورے میرزا یوسف کے مکان میں گھس آئے تھے۔ پھر ایک صبح ملازم نے آ کے اطلاع دی کہ پانچ دن کے سخت بخار کے بعد پچھلی رات میرزا یوسف نے انتقال کیا۔ یہ ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۷ء (۲۹ صفر ۱۲۷۴ھ) کی رات کا ذکر ہے[2]۔

جن حالات میں سے شہر اس وقت گزر رہا تھا، دو چار آدمیوں کا مل کر کسی نعش کو قبرستان تک دفن کرنے کے لیے لے جانا ممکن نہیں تھا۔ کفن اور گورکن کی تلاش، مزید مصیبت۔ ہمسایوں نے میرزا کی بیکسی پر رحم کھایا تھا اور میرزا کے ملازم اور مہاراجا پٹیالہ کا ایک سپاہی ان کے ساتھ گئے۔ کفن کے لیے دو تین سفید چادریں میرزا نے اپنے پاس سے دیں، اور ان لوگوں نے گلی کے سرے پر تہور خان کی مسجد کے صحن میں گڑھا کھودا اور میت کو اس میں اتار کر مٹی سے

۱۔ اردوئے معلّیٰ: ۲۵۵ (بنام یوسف میرزا)؛ کلیاتِ نثر: ۲۹۳

۲۔ یہ غالب کا اپنا بیان ہے (کلیاتِ نثر: ۲۹۸) اس کے برخلاف معین الدین حسن خان لکھتے ہیں کہ "میرزا یوسف خان کہ قدیم سے مجنوں تھے، گھر سے باہر نکل کر ٹہلنے لگے وہ بھی مارے گئے" (خدنگ غدر: ۱۴۸)۔ بگا بیگم بھی یہی کہتی ہیں (احوال غالب: ۸۷) میرے خیال میں یہاں غالب کا بیان مشتبہ ہے۔ اس سلسلے میں دیکھیے میرا مضمون "میرزا یوسف" (مشمولہ فسانۂ غالب)

باٹ دیا! انا للہ و انا الیہ راجعون۔
غالب نے بھائی کے مرنے کی تاریخ کہی:

زسالِ مرگِ ستم دیدہ میرزا یوسف — کہ زیستے بہ جہاں در زخویش بیگانہ
یکے در انجمن از سن ہمی پژوہش کرد — کشیدم "آہے" و گفتم "دریغ دیوانہ"
(۱۲۹۰ - ۱۶ = ۱۲۷۴)

امراؤ بیگم کا وظیفہ

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہونے کے ساتھ ہی میرزا کی آمدنی کے سب رستے بند ہو گئے۔ قلعے کی تنخواہ تو بند ہونا ہی تھی؛ وہاں تو دیسی فوج نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ ایک غریب شاعر اور تاریخ نویس کس شمار قطار میں تھا؛ وہ تو اسی کی خیر منائیں کہ انھوں نے ان سے باز پرس نہیں کی۔ ورنہ کہیں یہ کہہ کر کہ یہ بھی انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا، وہ انھیں بھی موت کے گھاٹ اتار دیتے، تو وہاں کون تھا جو ان کا ہاتھ روک لیتا۔ انگریزوں کی طرف سے جو خاندانی پنشن ملتی تھی، وہ بھی بند ہو گئی کیوں کہ جب دیسی فوج نے دلّی پر قبضہ کر لیا، تو انگریزی دفتر ہی کہاں رہا تھا، جہاں سے انھیں پنشن ملتی۔ یہ دیکھ کر نواب ضیاء الدین احمد خان نے میرزا کی بیوی جناب امراؤ بیگم کا پچاس روپیہ مہینا مقرر کر دیا۔ دراصل بالواسطہ یہ بھی میرزا ہی کی امداد تھی۔ یہ وظیفہ بیگم کو ان کی وفات تک ملتا رہا۔ میرزا رام پور سے ۲ نومبر ۱۸۶۵ء کو حکیم ظہیر الدین احمد خان کے نام لکھتے ہیں[۲]:

۱۔ فراش خانے سے کھاری باؤلی کی طرف جائیں، تو یہ مسجد نئے بانس کے متصل الٹے ہاتھ کو پڑتی ہے۔ اس کے بانی تہور خان تاشکندی عہدِ محمد شاہی میں شاہجہان پور کے زمیندار تھے۔ موجودہ مسجد نئی بنی ہے۔ اب اس کی کرسی اونچی ہے اور صحن کے نیچے بازار میں دکانیں ہیں۔ گمان ہے کہ اس ردّ و بدل میں قبر مٹ گئی، یا شاید نعش اس ہڑواڑ میں منتقل کر دی گئی، جو اب بھی سرس کی گلی کے اندر موجود ہے۔

۲۔ اردوئے معلیٰ: ۱۷۴

سنو میاں ظہیر الدین، تم اپنی دادی (بیگم غالب) کے پاس ابھی چلے جاؤ اور
ان سے میری اور دونوں لڑکوں کو خیر و عافیت کہو اور پوچھو کہ شہاب الدین خان
(خلف نواب ضیاء الدین احمد خان) نے اکتوبر کے مہینے کی تنخواہ کے پچاس
روپے پہنچا دیے یا نہیں۔

یہاں اسی تنخواہ کی طرف اشارہ ہے۔

استادِ نوابِ رام پور

اس ہنگامے سے تھوڑے ہی دن پہلے میرزا کا دربارِ رام پور سے تعلق قائم ہوا۔ اگرچہ یہ رشتہ بہت پرانا تھا یعنی جب بچپن میں نواب محمد یوسف علی خان تعلیم کی خاطر دلی تشریف لائے ہیں، تو انھوں نے میرزا غالب سے فارسی پڑھی تھی[1]، لیکن اس کے بعد یہ تعلقات منقطع ہو گئے۔ جب وہ ۱۸۵۵ء میں تخت نشین ہوئے، تو میرزا نے قطعۂ تاریخِ جلوس کے ذریعے دوبارہ میل جول پیدا کرنا چاہا[2]، مگر یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ جس زمانے میں مولانا فضلِ حق خیر آبادی رام پور میں تھے، انھوں نے میرزا کو آمادہ کیا کہ وہ نواب صاحب کی خدمت میں قصیدہ بھیجیں۔ اس پر میرزا نے ایک عریضہ لکھا اور قصیدہ بھی بھیجا[3]۔ مولانا فضلِ حق نے بھی سفارش کی۔ چنان چہ اس کے جواب میں نواب فردوس مکان نے ۵ فروری ۱۸۵۷ء کو ایک خط میں چند شعر اصلاح کے لیے میرزا کے پاس بھیجے[4]؛ اور اس طرح وہ باقاعدہ دربارِ رام پور سے وابستہ ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب نے اپنے اس ابتدائی کلام میں تخلص یوسف استعمال کیا تھا۔ میرزا نے ان کی خدمت میں لکھا[5]:

۱۔ اردوے معلیٰ: ۸۹ (تفتہ)؛ خطوطِ غالب (۱): ۳۰۷؛ یادگارِ غالب: ۴۴ (حاشیہ) نیز مکاتیبِ غالب ۳۰ (دیباچہ)

۲۔ مکاتیبِ غالب: ۳ (مکاتیب)

۳۔ قصیدہ: ۸۵ (کلیاتِ نظم)؛ یہ قصیدہ ایک رات میں لکھا گیا۔

۴۔ مکاتیبِ غالب: ۸۰، ۷ (دیباچہ)؛ نیز ص ۱۲۰ (حواشی)

۵۔ ایضاً: ۶ (مکاتیب)

میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اسمِ سامی اور نامِ نامی تخلص رہے۔ ناظم، عالی، انور، شوکت، نیساں، ان میں سے جو پسند آئے، وہ رہنے دیں۔ مگر یہ نہیں کہ خواہی نخواہی، آپ ایسا ہی کریں۔ اگر وہی تخلص منظور رہو، تو بہت مبارک!

اس پر نواب صاحب نے لکھا کہ ہم نے ناظم تخلص پسند کیا![1]

یہ جدید تعلق پیدا ہوئے تین ماہ سے کچھ اوپر ہوئے تھے کہ غدر کا ہنگامہ ہو گیا۔ ابھی تک رام پور سے کوئی تنخواہ مقرر نہیں ہوئی تھی۔ البتہ نواب صاحب انھیں روپیہ گاہے ماہے بھیجتے رہتے تھے۔ چنانچہ پہلے ہی خط کے ساتھ انھوں نے ڈھائی سو روپے بھیجے تھے، اور اس کے بعد بھی مسلسل امداد فرماتے رہے۔

سفرِ پٹیالہ کی تجویز

غالب کو توقع تھی کہ جونہی امن و امان قائم ہو گیا، میری پنشن بھی بحال ہو جائیگی۔ لیکن خلافِ امید ایک مدت تک یہ جاری نہ ہوئی۔ پہلے تو گھر کے کپڑے لتے بیچ بیچ کر دن کاٹے[2] مگر کب تک! آخر انھوں نے تنگ آ کر دلی سے کہیں باہر جانے کا فیصلہ کیا۔ نواب امین الدین احمد خان اور ضیاء الدین احمد خان اور ان کی والدۂ ماجدہ بیگم جان نے بھی اس شرط پر ان کی تجویز سے اتفاق کیا کہ ان کی بیوی امراؤ بیگم اور بچے لوہارو چلے جائیں۔ چنانچہ وہ نواب علاء الدین احمد خان کو جو لوہارو میں تھے، اس امر کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں[3]:

> اپنا مقصود تمہارے والد ماجد سے اور تمہاری جدۂ ماجدہ سے اور تمہارے عمِ عالی مقدار سے کہہ چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میری بی بی اور بچوں کو کہ یہ تمہاری قوم کے ہیں، مجھ سے لو کہ میں اب اس بوجھ کا متحمل ہو نہیں سکتا۔ انھوں نے بھی بشرط ان لوگوں کے لوہارو جانے کے اس خواہش

۱۔ مکاتیبِ غالب: ۱۲۱ (حواشی)

۲۔ کلیاتِ نثر: ۴۰۹

۳۔ اردوے معلّی: ۴۳۱؛ خطوطِ غالب (۱): ۳۷۰

کو قبول کیا۔ میرا قصد سیاحت کا ہے۔ پنشن اگر کھل جائیگا، تو وہ اپنے
صرف میں لایا کرونگا، جہاں جی لگا وہاں رہ گیا۔ جہاں سے دل اکھڑا،
چل دیا۔

سیر و سیاحت تو خیر کیا ہونا تھی، در اصل وہ مالی تنگی اور خانگی ذمہ داریوں سے بہت گھبرا گئے تھے۔ ایسے حالات میں عموماً انسان اپنی ناکامی کے لیے کسی اور کو ذمّہ دار ٹھہرانے لگتا ہے، اور "نزلہ بر عضوِ ضعیف" کے مصداق سب سے پہلے بیوی بچے اس کی نظر میں کھٹکتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ یہ ساری مصیبت اہل و عیال کے باعث نازل ہوئی ہے؛ اگر میں اکیلا دم ہوتا تو مزے سے گذران ہوتی؛ "نے غمِ دزد دنے غمِ کالا"۔ اب یہ "بیڑی" اور "ہتھکڑیاں" ایسی ہیں کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔
میرزا نے بھی یہی خیال کیا کہ ان تمام مشکلوں کے لیے میری خانگی زندگی ذمّہ دار ہے، اور اس مصیبت سے رہائی کی یہی صورت ہے کہ بیوی بچوں سے چھٹکارا کراؤں اور خود تنِ تنہا "رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو"
جو لاابالیانہ طبیعت انھوں نے پائی تھی، اس کے پیشِ نظر وہ کسی قید اور پابندی کو بھی پسند نہیں کر سکتے تھے اور ازدواجی زندگی سے بڑھ کر اور کون سی پابندی ہوگی۔
اس لیے اگرچہ "شادی" اور "بیوی" کے خلاف لطیفہ بازی تو، وہ ہمیشہ سے کرتے رہتے تھے، لیکن ان کے کلام میں بیوی اور گرہستی کے موضوع پر جتنی جلی کٹی ہیں، وہ بیشتر اسی زمانے کی چیزیں ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کی تہ میں یہی جذبہ کام کر رہا ہے۔ یہ گویا اس "پابندی اور فقدانِ آزادی" کے خلاف احتجاج ہے، جو "بیوی" کا لازمی نتیجہ ہے۔ ورنہ وہ عورت کے مخالف نہیں۔
تجویز یہ ہوئی تھی کہ بیوی بچوں کو لوہارو بھیج کر میرزا خود پٹیالے چلے جائیں اور وہاں گھریلو پریشانیوں سے آزاد ہو کر چندے عافیت سے رہیں۔
شریف خانی خاندان کے تین افراد یعنی حکیم محمود خان اور حکیم مرتضیٰ خان اور حکیم غلام اللہ خان کو مہاراجا نرندر سنگھ والیِ پٹیالہ سے ملازمت کا تعلق تھا؛ حکیم محمود خان تو دتی

میں رہتے تھے، لیکن دوسرے دونوں بھائی پٹیالے میں مقیم تھے۔ میرزا دس برس تک گویا دیوار بدیوار اس خاندان کے پڑوس میں رہتے تھے اور ان کے آپس میں گہرے تعلقات تھے۔ انھیں حضرات نے کوشش کی کہ میرزا اگر پٹیالے چلے جائیں تو وہاں اطمینان سے رہینگے۔ میرزا نے بھی ہامی بھرلی اور جانے پر رضامند ہو گئے اور مہاراجا نرندر سنگھ کی مدح میں قصیدہ[1] بھی بھیجا۔

لیکن بعد کو انھوں نے یوں بیوی بچوں کو چھوڑ کر چلے جانے میں اپنی ذلت اور سُبکی دیکھی اور جانے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ حکیم غلام نجف خان کو لکھتے ہیں[2]:

> بھائی، میرا دُکھ سنو۔ ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے۔ ایک تنہائی سے نفور رہے، ایک کو تنہائی منظور رہے۔ تاہل میری موت ہے۔ میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔ پٹیالے جانے میں ایک ذلت اور سُبکی تھی، اگرچہ مجھ کو دولتِ تنہائی میسر آجاتی؛ اس تنہائی چند روزہ اور تجریدِ مستعار کی کیا خوشی!

عین ممکن ہے کہ پٹیالے جانے میں ایک اور بات بھی حائل ہوئی ہو۔ رامپور کا تعلق ابھی تازہ بات تھی۔ وہ نواب فردوس مکان کے استاد مقرر ہو چکے تھے۔ پس پٹیالے جانے میں صرف ان کی اپنی ہی "ذلت اور سُبکی" نہیں تھی، بلکہ اس سے نواب رام پور پر بھی حرف آتا تھا، جواب ان کے شاگرد تھے

رام پور کا مشاہرہ

لیکن اس سے اصلی مشکل تو حل نہیں ہوسکتی تھی۔ سوال یہ نہیں تھا کہ "رہیں کہاں؟" بلکہ یہ کہ "کھائینگے کیا؟" اس کا ایک ہی علاج تھا کہ رام پور سے انھیں ایک مقررہ رقم باقاعدہ ہر مہینے ملتی رہے۔ اخیر مجبور ہو کر انھوں نے نواب یوسف علی خان کی خدمت میں

۱۔ قصیدہ نمبر ۵۹ کلیاتِ غالب (نظم فارسی) یہ پہلے بہادر شاہ ظفر کی مدح میں تھا۔ گمانِ غالب ہے کہ اسی زمانے میں اس کی بیتِ اہم تبدیل کر کے انھوں نے اسے مہاراجا کی خدمت میں بھیجا ہوگا۔

۲۔ اردوے معلیٰ: ۱۶۸؛ خطوطِ غالب (۱): ۲۷۹

لکھا کہ میرا کچھ مستقل وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔ اس پر نواب صاحب نے ۱۶ جولائی ۱۸۵۹ء کو جواب دیا کہ آیندہ آپ کو سو روپیہ تنخواہ ہر ماہ پہنچتی رہیگی![1]

پنشن کی بندش

دلّی میں شورش ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو شروع ہوئی اور دیسی فوج میرٹھ سے آکر شہر پر قابض ہوگئی۔ انھوں نے جو تباہی مچائی، اس کا کچھ حال میرزا نے دستنبو میں لکھا ہے۔ انھوں نے انگریزوں کے قتل اور ان کے اموال لوٹنے ہی پر بس نہیں کی، بلکہ ہندستانی امرا، اور ان کی املاک پر بھی ہاتھ صاف کیا۔ ۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دلّی پر دوبارہ انگریزی قبضہ مکمل ہوگیا جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ گرفتاریوں اور سزاؤں کا بازار نئے سرے سے گرم ہو، چناںچہ جو کالوں کے ہاتھ سے بچا تھا، وہ گوروں کا شکار رہوا۔ جس شخص کے بارے میں معمولی سا شبہہ بھی ہوا کہ وہ باغیوں سے ہمدردی رکھتا تھا، انگریزوں نے اسے پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا۔

غالب نے "غدر" کے زمانے میں انگریزوں کی کوئی خاص خیر خواہی نہیں کی تھی، کہ انھیں کسی نئے انعام کی توقع ہوتی۔ لیکن ان کے خیال میں ان سے کوئی بیوفائی بھی نہیں ہوئی تھی جو پرانے تعلقات کو درہم برہم کرنے والی ہو[2]۔ اسی لیے انھیں یقین تھا کہ امن قائم ہوتے ہی میری پنشن اور دربار بحال کر دیے جائینگے۔ مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

انھوں نے اپنی داستانِ غدر "دستنبو" بہت عجلت سے نومبر ۱۸۵۸ء میں چھپوا کر اس کے نسخے چند اعلیٰ افسروں کے پاس بطور ہدیہ خود بھیجے تھے، اور بعض دوسرے حکام کو ناشر سے کہہ کر بھجوائے تھے۔ وہ اس کتاب کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا "ذریعہ" سمجھتے تھے[3]۔ دراصل اس کے جابجا بھیجنے سے ان کا مقصود یہ تھا کہ اس

۱۔ مکاتیبِ غالب: ۸۲ (دیباچہ)؛ اردوے معلّیٰ: ۱۳۰؛ خطوطِ غالب (۱): ۲۴۲

۲۔ مکاتیبِ غالب: ۱۶ (مکاتیب)

۳۔ اردوے معلّیٰ: ۳۷ (تفتہ)؛ خطوطِ غالب (۱): ۸۴

طرح سرکاری حلقوں سے تعلقات پھر سے قائم ہو جائیں اور انھیں غالب کی بیگناہی کا علم ہو جائے؛ اسی میں اپنی خستہ حالی کا ذکر کر کے پنشن کے اجرا کے لیے بھی حسن طلب تھا۔ لیکن یہ تمام کوششیں بیکار گئیں اور کسی نے توجہ نہ کی۔ نہ صرف یہی، بلکہ جب انھوں نے براہِ راست حکّام سے ملاقات کے لیے سلسلہ جنبانی کی، تو جواب ملا کہ "ایّامِ غدر میں باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔ اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو!" غرض کہ نہ پنشن جاری ہوئی، نہ دربار ہی کھلا۔

سکّے کا الزام

غالب پر سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ جب باغیوں نے بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت کا اعلان کیا ہے، تو تم نے ان کے لیے سکّہ کہہ کر دیا تھا۔ میرزا کے اردو خطوں میں کئی جگہ اس کا ذکر آیا ہے۔[1]

قصّہ یوں ہے کہ غدر کے ایام میں ایک جاسوس گوری شنکر نے انگریزوں کو خفیہ اطلاع دی[2] کہ ۱۸ جولائی ۱۸۵۷ء کو جب بہادر شاہ نے دربار کیا تو میرزا غالب نے یہ سکّہ کہہ کر ایک پرچے پر لکھا اور حضور میں گزرانا:

بزر زد سکّۂ کشور ستانی — سراج الدّین بہادر شاہِ ثانی

غدر کے بعد جب میرزا صاحب کمشنر بہادر کی ملاقات کو گئے، تو انھوں نے ان سے اس سے متعلق پوچھا؛ غالب نے جواب دیا[3]:

> (یہ شخص) غلط لکھتا ہے۔ بادشاہ شاعر، بادشاہ کے بیٹے شاعر، بادشاہ کے نوکر شاعر، خدا جانے کس نے کہا، اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔ اگر میں نے کہہ کر گزرانا ہوتا، تو دفتر سے وہ کاغذ میرے ہات کا لکھا ہوا گزرتا۔

بعد کو کسی دوست نے انھیں بتایا کہ جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں، تو یہ سکّہ ذوق

۱۔ اردوے معلّیٰ: ۲۶ (بنام خواجہ غلام غوث خاں بیخبر)

۲۔ فاران (متفرق)، فروری ۱۸۶۶ء (۳۰-۳۴)

۳۔ علی گڑھ میگزین (غالب نمبر ۱۹۴۹ء) بلاک ۵ مقابل صفحہ

نے کہہ کر پیش کیا تھا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا! چونکہ یہ بات عین ممکن تھی، اس لیے وہ اسے مان گئے۔ پھر چوں کہ بہادر شاہ ۳۰ ستمبر ۱۸۳۷ء کو تخت پر بیٹھے تھے، اس لیے انھوں نے دوستوں سے ۱۸۳۷ء کے اخبار اور خصوصاً مولوی محمد باقر (والد مولانا محمد حسین آزاد) کا اخبار مسمّٰی بہ دہلی اردو اخبار مہیّا کرنے کی فرمایش کی![1] ذوق اور مولوی محمد باقر میں گہری ملّت تھی، اس لیے انھیں یقین تھا کہ یہ سکّے ان کے اخبار میں ضرور شائع ہوتے ہونگے۔

لیکن اگر یہ پرچے دستیاب ہو جاتے، تو بھی ان کے مفید مطلب نہیں ہو سکتے تھے، کیوں کہ اگرچہ اس وقت میرزا کو اس بات کا علم نہ ہو سکا، یہ سکّہ ذوق کا کہا ہوا تھا ہی نہیں؛ اس لیے پرچے مل جاتے، جب بھی یہ سکّہ ان میں موجود نہیں تھا۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ مخبر کی یہ اطلاع محض افترا تھا۔ نہ یہ سکّہ میرزا نے کہا تھا، نہ انھوں نے اسے بہادر شاہ ظفر کے سامنے پیش کیا، بلکہ یہ سکّہ جیسا کہ صادق الاخبار (دہلی) کی اشاعت ۱۳ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ (۶ جولائی ۱۸۵۷ء) سے عیاں ہے[2]، حافظ غلام رسول ویران (تلمیذ ذوق) نے کہا تھا اور انھوں نے بھی اسے ۱۸ جولائی ۱۸۵۷ء سے پہلے لکھا، جیسا کہ اس کی ۶ جولائی ۱۸۵۷ء کے اخبار میں اشاعت سے ثابت ہوتا ہے۔[3]

رام پور کا پہلا سفر

نواب یوسف علی خان نے میرزا کو رام پور آنے کے لیے متعدد بار دعوت دی تھی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ پہلی مرتبہ انھوں دِلّی پر دوبارہ انگریزی قبضہ ہونے کے ساتھ ہی انھیں رام پور آنے کے لیے لکھا تھا، لیکن یہ کسی وجہ سے نہ جا سکے۔ دوسری بار انھوں

۱۔ اردوے معلّٰی: ۹۹، ۱۰۲ (سرور)؛ ایضاً: ۲۴۹؛ علی گڑھ میگزین (غالب نمبر) بلاک ص ۶؛ خطوطِ غالب: ۲۱۸ (یوسف میرزا)۔

۲۔ غدر کے اخبارات، صادق الاخبار کا فائل، مجموعہ نمبر ۴-۶ (قومی دفتر خانۂ ہند، نئی دہلی)

۳۔ دیکھیے میرا مضمون: "غالب پر سکّے کا الزام اور اس کی حقیقت" (شمولۂ نسانۂ غالب) جہاں میں نے اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں دوسرا مضمون: "غالب سے منسوب دوسرا سکّہ" (ایضاً) بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

نے ۲۵ نومبر ۱۸۵۸ء کو بلایا، تو میرزا نے جواب دیا:[1]

میرے حاضر ہونے کو جو ارشاد ہوتا ہے، میں وہاں نہ آؤنگا تو اور کہاں جاؤنگا؟ پنشن کے وصول کا زمانہ قریب آیا ہے، اس کو ملتوی چھوڑ کر کیوں کر چلا آؤں۔ سنا جاتا ہے، اور یقین بھی آتا ہے کہ جنوری آغاز سال ۵۹ عیسوی یہ قصہ انجام پائے۔ جس کو روپیہ ملنا ہے، اس کو روپیہ؛ جس کو جواب ملنا ہے، اس کو جواب، مل جائے۔

مگر جنوری ۱۸۵۹ء آیا اور گذر گیا اور پنشن کا فیصلہ ہونا تھا، نہ ہوا۔ اس پر نواب فردوس مکان نے ۲ فروری اور ۱۳ اپریل ۱۸۵۹ء کو تجدید دعوت کی؛ اس کے جواب میں غالب نے ۱۸ اپریل کو لکھا:[2]

پہلے خط میں یہ عرض کیا کہ مجموعۂ پنسنداروں کی مثل مرتب ہے، اور ہنوز صدر کو روانہ نہیں ہوئی۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر نے کلکتے سے میرے پنسن کے کاغذ طلب کیے اور وہ کاغذ فہرست میں سے الگ ہو کر لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں ارسال ہوئے۔ وہاں سے کلکتے کو بھیجے جائینگے۔ پھر وہاں سے حکم منظوری پنجاب ہوتا ہوا یہاں آئیگا اور یہاں مجھ کو روپیہ مل جائیگا۔ آج روپیہ ملا، کل میں نے آپ سے سواری اور بار برداری مانگی۔ آج سواری اور بار برداری پہنچی، اور کل میں نے رام پور کی راہ لی۔

۱۸۵۹ء کا سارا سال گذر گیا اور میرزا کو روپیہ نہ ملا، لیکن امید ابھی قائم تھی۔ جنوری ۱۸۶۰ء کے شروع میں گورنر جنرل لارڈ کیننگ میرٹھ میں دربار کر کے دلّی پہنچے۔ جب یہ قیامگاہ پر ملنے کو گئے، تو جواب ملا کہ ہم ملاقات نہیں کرنا چاہتے۔[3] اس سے میرزا

۱- مکاتیب غالب: ۱۲ (مکاتیب) نواب فردوس مکان کی دعوت کے خط دیباچے کے ص ۸۸-۹۰ پر دیکھیے۔

۲- مکاتیب غالب: ۱۳-۱۴ (مکاتیب)

۳- اردوے معلّیٰ: ۲۱۱ (بنام منشی غلام غوث خان بیخبر)

میرزا بالکل مایوس ہو گئے اور اب انھوں نے رام پور جانے کا فیصلہ کر لیا۔ نواب صاحب بھی انھیں پھر وسطِ دسمبر ۱۸۵۹ء میں رام پور آنے کے لیے لکھ چکے تھے[۱]۔ جب حکومت کی طرف سے انھیں یہ آخری جواب ملا، تو وہ ۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء کو دلّی سے روانہ ہو کر[۲]، ۲ جنوری کو رام پور پہنچ گئے[۳]۔

قیام رامپور

میرزا اس سفر میں زین العابدین خان عارف مرحوم کے دونوں خُرد سال صاحبزادوں، باقر علی خان اور حسین علی خان کو بھی اپنے ساتھ لیتے گئے تھے۔ نواب صاحب نہایت تعظیم و تکریم سے پیش آئے۔ میرزا نے لڑکوں سے بھی نذر دلوائی[۴]۔ پہلے نواب صاحب نے اپنی "خاص کوٹھی" قیام کے لیے دی، چوں کہ ان کے ساتھ بچّے تھے، اس لیے یہ ڈر رہے کہ کہیں شوخی اور نادانی سے یہ ساز و سامان وغیرہ نہ توڑ پھوڑ دیں۔ چنانچہ چار دن کے بعد ان کی اپنی درخواست پر محلہ راج دوارہ میں ایک وسیع مکان دے دیا گیا[۵]۔ شروع میں کھانا دونوں وقت سرکار سے آتا رہا[۶]۔ بعد کو سو روپیہ ماہانہ دعوت کا مقرر ہو گیا یعنی دلّی میں رہیں، تو صرف سو روپیہ تنخواہ؛ اور رام پور میں رہیں، تو سو روپیہ دعوت کا ملا کر دو سو روپیہ ماہانہ[۷]۔ رام پور کی آب و ہوا وغیرہ سب کچھ میرزا کے خاطر خواہ تھا اور ان کا ارادہ تھا کہ گرمی اور برسات کا موسم رام پور ہی میں رہیں گے مگر صاحبزادوں نے واپس دلّی آنے کے لیے ضد کی۔ میرزا نے انھیں تنہا بھیجنا مناسب نہ سمجھا کہ خدانخواستہ کہیں راستے میں کوئی حادثہ پیش آ جاتے، تو عمر بھر کی بدنامی

۱۔ مکاتیبِ غالب: ۹۱ (دیباچہ)

۲۔ اردوے معلّیٰ: ۶۲-۶۳ (بنام تفتہ)؛ ایضاً: ۱۷۳ (بنام غلام نجف خان)

۳۔ ایضاً: ۱۷۰ (بنام غلام نجف خان)؛ خطوطِ غالب (۱): ۲۶۱

۴۔ اردوے معلّیٰ: ۱۲۰؛ خطوطِ غالب (۱): ۲۱۴ (بنام میر مہدی مجروح)

۵۔ مکاتیبِ غالب: ۹۷ (دیباچہ) اب یہ مکان مع یادگاری پتھر کے مسمار کر دیا گیا ہے۔

۶۔ اردوے معلّیٰ: ۱۷۰ (بنام حکیم غلام نجف خان)

۷۔ اردوے معلّیٰ: ۱۲۰ (بنام میر مہدی مجروح)؛ خطوطِ غالب: ۲۱۴

رہے کہ دیکھو، اپنے عیش و آرام کی خاطر بچوں کا خیال نہ کیا اور اکیلے بھیج دیا۔ اس لیے انھوں نے خود بھی ان کے ساتھ چلے آنے کا فیصلہ کر لیا۔ آخر نواب صاحب سے اجازت لے کر ۱۷ مارچ ۱۸۶۰ء کو روانہ ہوئے اور سنیچر کے دن ۲۴ مارچ (۳۰ شعبان ۱۲۷۶ھ) کو دلّی پہنچے۔ جس دن یہاں پہنچے، اسی دن روزوں کا چاند ہوا۔[1]

پنشن کی بحالی

مارچ ۱۸۵۹ء میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ جو لوگ غدر سے پہلے سرکاری خزانے سے وظیفہ یا پنشن پاتے تھے، انھیں مدد کے طور پر ایک ایک سال کی رقم فوراً دے دی جائے؛ جب تحقیقات مکمل ہو جائیگی، تو بقیہ ادا کر دیا جائیگا۔ اس زمانے میں غالب کو صرف سو روپے ملے تھے۔ جب انھوں نے شکایت کی کہ صاحب، دوسروں کو سال بھر کا وظیفہ دیا جا رہا ہے، میں صرف سو روپے نہیں لیتا؛ دینا ہے، تو مجھے بھی سال بھر کے ساڑھے سات سو دلوایئے، تو انھیں جواب ملا کہ نہ معلوم ہم دوسروں کے بقیے کا فیصلہ کب تک ہو، آپ کو تو جلدی ہی مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر آج تک، کا تمام چڑھا ہوا روپیہ ملنے والا ہے۔ اس پر انھوں نے وہ سو روپے لے لیے۔[2] مگر نہ معلوم کیا پیچ پڑا کہ اس کے بعد نہ صرف بقایا ہی نہ ملا، بلکہ جنوری ۱۸۶۰ء میں وہ مایوس کُن جواب ملا، جس سے گھبرا کر وہ رام پور چلے گئے۔ اگرچہ وہ نواب صاحب کی دعوت پر وہاں گئے تھے، مگر جیسا کہ انھوں نے منشی شیو نرائن کو لکھا ہے، وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ نواب صاحب کے ذریعے سے حکومت سے اپنی صفائی کرا لیں۔[3] نواب صاحب نے بھی وقتاً فوقتاً انگریز افسروں سے اپنی ملاقاتوں میں ان کا ذکر کیا تھا۔ وہ غالب کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔[4]

۱- ایضاً: ۲۵۸؛ خطوطِ غالب (۱): ۲۲۸ (بنام یوسف میرزا)۔

۲- اردوئے معلّیٰ: ۱۳۵؛ نیز ص ۱۴۳ (مجروح)؛ خطوطِ غالب: ۲۹۹ - ۳۰۰

۳- اردوئے معلّیٰ: ۲۸۱ (بنام شیو نرائن) نیز دیکھو، ص ۱۷۱ (بنام حکیم غلام نجف علی خاں) یہ خط انھوں نے رام پور سے لکھا تھا اور اس میں کہتے ہیں کہ نواب یوسف علی خاں کے ساتھ گورنر غرب و شمال کی ملاقات کے لیے مراد آباد جاؤنگا۔

۴- مکاتیبِ غالب: ۶۰ (دیباچہ)

مشفقا! ہنگام ملاقات کے اکثر، بعضے صاحبان بہادر ذی شان سے تذکارِ محامدِ اوصافِ ذاتی اور صفاتی آپ کا عمل میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور قدردانیٔ سرکارِ دولت مدار سے یقینِ واثق ہے کہ جو مدارج شریف آپ کے قدیم سے ہیں، پیشگاہِ گورنمنٹ بہادر سے بھی اُنھی مطابق ظہور میں آویگا، کس واسطے کہ اہالیٔ سرکار ابد قرار قدرداں و قدرشناس ہیں۔

اس سے قطعی ثابت ہوتا ہے کہ واقعی نواب صاحب بھی کوشش کر رہے تھے۔ خود میرزا نے بھی نواب صاحب کی اس مدد کا اعتراف کیا ہے۔ لکھتے ہیں[1]:

عالم دو ہیں: ایک عالم شہادت، ایک عالم غیب۔ جس طرح عالم شہادت میں آپ میری دستگیری کر رہے ہیں، عالم غیب میں بھی آپ کا اقبال مجھ کو مدد پہنچا رہا ہے۔

یہاں عالم شہادت کی دستگیری سے مراد سو روپیہ ماہانہ کا وظیفہ ہے، جو انھیں رام پور سے ملتا تھا؛ اور عالم غیب سے مراد یہ سفارشیں تھیں، جو نواب صاحب ان کی سرکاری پنشن کی بحالی کے لیے کر رہے تھے۔ پس جب بعد کو غالب نے یوسف میرزا کو لکھا[2]: "والیٔ رامپور کو اس پنشن کے اجراء میں کچھ دخل نہیں، یہ کام خدا ساز ہے، بہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام" تو یہ محض شاعرانہ مبالغہ تھا۔ بہرحال سبب کچھ ہو، پنشن کا تمام بقایا روپیہ مئی ۱۸۶۰ء میں مل گیا۔ جب ۱۱ مئی کو غدر ہوا ہے، تو وہ اپریل ۱۸۵۷ء کی پنشن وصول کر چکے تھے۔ مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر اپریل ۱۸۶۰ء تک تین برس کے ساڑھے سات سو سال کے حساب سے دو ہزار دو سو پچاس ہوتے۔ سو روپے "مدد خرچ" کے وہ مارچ ۱۸۵۹ء میں لے چکے تھے۔ باقی دو ہزار ایک سو پچاس انھیں ۴ مئی ۱۸۶۰ء کو ملے۔ ان میں سے ڈیڑھ سو انھوں نے عملہ و فعلہ کو بطورِ انعام دے دیا، باقی رہ گئے دو ہزار۔ اصل اور سود ملا کر ان کو پندرہ سو روپے اپنے مختار کار کے دینا تھے۔ ان کے

۱۔ مکاتیبِ غالب: ۱۷ (مکاتیب)

۲۔ اردوئے معلیٰ: ۲۴۶ (بنام یوسف میرزا)؛ خطوطِ غالب (۱): ۲۲۹۔ مجروح کو بھی کچھ اسی طرح لکھا ہے: "ان پیسوں کا ہاتھ آنا عطیۂ ید اللّٰہی ہے" (اردوئے معلیٰ: ۳۶)

علاوہ گیارہ سو متفرق قرض تھا[1]۔ ظاہر ہے کہ پنشن کی جو رقم ملی تھی، اس سے سارے قرض کی ادائی ناممکن تھی۔ اس لیے انھوں نے مجبوراً سب سے پہلے بہت ضروری قرض ادا کر دینے کا فیصلہ کیا۔ پھر بھی چار سو روپیہ ان کے ذمے واجب الادا رہا، اور ان کے پاس صرف ستاسی روپے گیارہ آنے بچے۔

بظاہر تعجب ہوتا ہے کہ انھیں پنشن کے اجرا کی اتنی تشویش کیوں تھی! ساڑھے باسٹھ روپیہ مہینا، یعنی بس اتنا کہ ان کے بقول اس سے "چولھے دلدر" نہیں ہوگا۔ اصلی بات یہ ہے کہ ان کی بسر اوقات کا یہی ایک یقینی ذریعہ تھا۔ باقی فتوحات تو حسنِ اتفاق کی بات تھی؛ مل تو مل گئی، نہیں تو نہ سہی۔ انسان ایسی عارضی آمدنی پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر پنشن کا اجرا ان کے جذبۂ خودداری اور عزتِ نفس کے لیے اہم اور ضروری تھا۔ یقین ہے کہ مخالف چشمکیں کرتے ہونگے اور ان کی پریشانی اور بیکسی پر خوشیاں مناتے ہونگے۔ اسی لیے جب پنشن کی بحالی کا حکم صادر ہوا، تو وہ میر مہدی کو لکھتے ہیں[2]:

> خزانے سے روپیہ آگیا ہے۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ بات رہ گئی، پت رہ گئی، حاسدوں کو موت آگئی، دوست شاد ہو گئے۔ میں جیسا ننگا بھوکا ہوں، جب تک جیونگا، ایسا ہی رہونگا۔ میرا دار و گیر سے بچنا معجزۂ اسد اللّٰہی ہے؛ ان پیسوں کا ہات آنا عطیۂ ید اللّٰہی ہے۔

جب پنشن بحال ہوتی ہے، تو اس کے ساتھ ہی جون ۱۸۶۰ء میں یہ حکم ہوا کہ پنشن ماہانہ تقسیم کرنے کا دستور صرف چھ مہینے اور یعنی نومبر تک رہیگا، اس کے بعد دسمبر ۱۸۶۰ء سے پنشن دار عموماً ششماہی پایا کرینگے، پنشن ماہ بماہ تقسیم نہیں ہوگی[3]۔ دوسرا حکم یہ کہ آیندہ چار روپیہ سینکڑہ سالانہ وضع ہوا کریگا۔ اس حساب سے چاہیے تھا کہ اس کے بعد انھیں ساڑھے باسٹھ

۱۔ اردوے معلّیٰ: ۲۲ (بنام میرزا تفتہ)؛ ایضاً: ۱۳۵ (بنام مجروح)؛ عودِ ہندی: ۸۲ (مجروح)

۲۔ اردوے معلّیٰ: ۱۳۵-۱۳۴؛ خطوطِ غالب (۱): ۳۱۵

۳۔ اردوے معلّیٰ: ۲۹۸-۲۹۷ (بنام علائی)؛ ایضاً: ۱۰۳ (سرور)؛ ایضاً: ۵۵ (تفتہ)؛ خطوطِ غالب (۱): ۷۵۔

کی جگہ صرف ساٹھ روپیہ مہینا ملتے رہے ہوں[۱]۔ لیکن سب سے بڑی مشکل چھ ماہی ادائی کی تھی، کیوں کہ صرف رام پور کے سو روپیوں پر ان کا گزارا ناممکن تھا۔ اس لیے ناچار وہ ہر مہینے ساہوکار سے سود کاٹ کر قرض لیتے اور اسے رام پور کی آمد میں ملا کر صرف میں لاتے۔ یہ سود اسی طرح چھ مہینے تک کٹوا دینا پڑتا اور یوں ایک معقول رقم گھاٹے میں جاتی[۲]۔

یہاں ہم ایک ناقابلِ فہم معمّے سے دوچار ہوتے ہیں۔ غالب نے غدر سے پہلے ۲۹ مئی ۱۸۵۲ء کو ایک خط حقیر کے نام لکھا ہے۔ اس میں انھیں اطلاع دیتے ہیں[۳]:

> ایک نئی بات سنو، شہر میں ایک وبا آئی ہے، یعنی وکیلِ کمپنی نے سنینِ ماضیہ کے کاغذ دیکھ کر رسومِ سرکاری جس شخص پر نکلتی تھیں، اس کا مطالبہ کیا ہے، اور مطالبہ کیا، مواخذہ یعنی بہت شدّت۔ از انجملہ مجھ پر بھی بابت رسومِ سرکاری پانسو روپیہ آٹھ آنے نکلے اور اس کی طلب بقیدِ حکم قید ہوئی۔ میں آٹھ آنے کو محتاج، پانسو کہاں سے لاؤں! بارے حضرت، انگریزی تنخواہ میں سے پانچ روپے مہینا بطریقِ قسط مقرر کر دیا۔ باسٹھ روپے آٹھ آنے مہینا پاتا تھا، ستاون روپے آٹھ آنے رہ گئے۔ پانچ روپے مہینا کا ساٹھ روپے سالیانہ ہوا۔ اب یہ توقع کہاں کہ پوری تنخواہ پاؤں گا۔ یوں سمجھیے کہ ستاون روپے کا پنشن دار ہوں۔

ان کے کسی خط سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ غدر سے پہلے کبھی انھیں ساڑھے باسٹھ سے کم ملے ہوں۔ اگر یہ پانچ روپے مہینا کی کاٹ مستقل تھی تو پانسو واجب الادا کہیں دس برس میں جا کر ختم ہوتا اور انھیں اب بھی ساڑھے باسٹھ نہیں مل سکتے تھے۔ اس کے ایک ہی

۱۔ عودِ ہندی: ۲۱ (بنام چودھری عبدالغفور سرور)

۲۔ اردوے معلّیٰ: ۵۵ (بنام ہرگوپال تفتہ)؛ خطوطِ غالب: ۱۲۸

۳۔ خطوطِ غالب: ۱۲۸

اس سلسلے میں دیکھیے اردوے معلّیٰ: ۸۱ (بنام تفتہ)؛ خطوطِ غالب (۱): ۲۲ بعض اصحاب نے خیال کیا ہے کہ یہاں انھوں نے تفتہ کے کسی قرض کی ادائی سے متعلق لکھا ہے۔ یہ غلط ہے؛ یہاں کمپنی کے اِنکم ٹیکس کی طرف اشارہ ہے۔

معنی ہو سکتے ہیں کہ غدر سے پہلے کہیں سے کوئی فتوح آ گئی اور انھوں نے یہ ٹیکس کا تمام روپیہ یک مشت ادا کر دیا، اور اس کے بعد پنشن پہلے کی طرح پوری ملنے لگی۔ بہرحال میرزا کے کسی دوسرے خط میں ان رسومِ سرکاری کے ختم ہونے کا کہیں ذکر نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حکومت ہی نے یہ حکم بعد کو منسوخ کر دیا ہو۔ لیکن اس کا بھی کہیں ذکر نہیں ملتا۔

دربار و خلعت کی بحالی

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے[1]۔ میرزا کی عمر تیس برس کی تھی، جب ۱۸۲۸ء میں لارڈ بنٹنک کے زمانے میں انھیں دربار کا اعزاز ملا۔ خلعت لارڈ ایلن برا کے عہد (۱۸۴۲-۴۴ء) میں جاری ہوا۔ اس میں سات پارچہ اور تین رقم جواہر (یعنی جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید) ہوا کرتے تھے۔ وہ ۷ نومبر ۱۸۵۹ء کو نواب یوسف علی خان کو لکھتے ہیں[2]:

> میں انگریزی سرکار میں علاقہ ریاستِ دودمانی کا رکھتا ہوں۔ معاش اگرچہ قلیل ہے، مگر عزت زیادہ پاتا ہوں۔ گورنمنٹ کے دربار میں داہنی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید خلعت مقرر ہے۔
>
> لارڈ ہارڈنگ صاحب کے عہد تک پایا۔ لارڈ ڈلہوسی یہاں آئے نہیں (مراد یہ کہ میں ان کے کسی دربار میں شامل نہیں ہوا؛ اور خلعت بھی نہیں پایا)

میرزا جب کسی دربار میں شریک ہوتے، تو نقد رقم کی جگہ نذر میں قصیدہ یا مدحیہ قطعہ یا کوئی نظم پیش کیا کرتے تھے[3]۔ سرکاری خطوں میں ان کا القاب "خان صاحب بسیار مہربانِ دوستاں" ہوتا تھا۔ ایک بار اڈمنسٹن صاحب چیف سکتر نے یہ القاب بڑھا کر "خان صاحب مشفق بسیار مہربانِ مخلصان" لکھا، تو اس پر میرزا نے احسان مندی کا اظہار کیا[4]۔ تمام

۱۔ دیکھیے اوپر: ۸۷-۸۸

۲۔ مکاتیبِ غالب: ۱۵ (مکاتیب)؛ نیز اردوئے معلیٰ: ۴۰۶ (بنام قدر بلگرامی)؛ خطوطِ غالب (۱): ۲۰

۳۔ اردوئے معلیٰ: ۸۱ (بنام میرزا تفتہ)؛ خطوطِ غالب (۱): ۸۷

۴۔ اردوئے معلیٰ: ۱۹۶ (بنام حاتم علی مہر)؛ خطوطِ غالب (۱): ۳۵۱-۳۵۲

سرکاری خط و کتابت افشانی کاغذ پر ہوا کرتی تھی![1]

جب مئی ۱۸۶۰ء میں پنشن بحال ہوگئی، تو اب انھوں نے دربار اور خلعت کی بحالی کے لیے کوشش شروع کی چناں چہ یکم جون ۱۸۶۲ء کی درخواست میں انھوں نے لکھا کہ مجھے لارڈ ولیم بنٹنک کے عہد سے دربار کا اور لارڈ ڈالن برا کے عہد سے خلعتِ ہفت پارچہ و سہ رقومِ جواہر کا اعزاز حاصل تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ اس عزّت و توقیر میں اضافہ ہوتا۔ مگر اب کہ میری عمر ۶۷ برس ہے (بحسابِ قمری) اس کے برخلاف وہ پہلا دربار اور خلعت بھی چھن گیا ہے۔ میں غدر کے دنوں میں بھی وفادار رہا؛ پنشن کا اجرا ہی میری بیگناہی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ پھر نہ معلوم، مجھ سے دربار کا حق کیوں چھین لیا گیا ہے۔ بس میرے معاملات کی تفتیش کی جائے اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ میں بےقصور ہوں، تو میرا دربار اور دوسرے اعزاز و اکرام بحال کیے جائیں۔

بارے یہ کوششیں پروان چڑھیں اور ۳ مارچ ۱۸۶۳ء کو دربار خلعت بھی پھر سے جاری ہوگیا۔[2]
میرزا اس کی تفصیل ایک خط میں یوں لکھتے ہیں[3]:

> غدر کے بعد پنشن جاری ہوگئی، لیکن دربار اور خلعت بند۔ اب کے جو لارڈ صاحب یہاں آئے، تو اہلِ دفتر نے بموجب حکم کے مجھ کو اطلاع دی کہ تمھارا دربار اور خلعت واگزاشت ہوگیا؛ مگر دلّی میں دربار نہیں، انبالے آؤ گے، تو دربار میں طلب اور خلعت معمولی پاؤ گے۔ میں نے خبر میں وجدان کا مزہ پایا اور انبالے نہ گیا۔ رابرٹ منٹگری صاحب لفٹننٹ گورنر بہادر قلمروِ پنجاب یہاں آئے؛ دربار کیا، میں دربار میں نہ گیا۔ دربار کے بعد ایک دن بارہ بجے چپراسی آکر مجھ کو بلا لے گیا۔ بہت عنایت فرمائی اور اپنی طرف سے خلعت عطا کیا۔

لیکن اس خط میں ان سے غلطی ہوگئی ہے۔ دوسری جگہ منشی ہرگوپال تفتہ کے خط میں انھوں

۱- اردوئے معلّیٰ: ۹۶ (سرور) نیز مکاتیبِ غالب: ۲۵ (مکاتیب)
۲- مکاتیبِ غالب: ۲۴ (مکاتیب)
۳- اردوئے معلّیٰ: ۶-۳۴-۳۵ (بنام قدر بلگرامی)؛ خطوطِ غالب (۱): ۲۷۰

نے درست لکھا ہے کہ لارڈ الگن گورنر جنرل کے دربارِ انبالہ کی خبر اور اس میں شمولیت کی صلاح خود سر رابرٹ منٹگمری نے دی تھی،[1] لیکن وہ ہاتھ پر پھوڑا نکل آنے کے سبب انبالے نہ جا سکے۔[2] اور قصیدہ ڈاک سے بھیج دیا۔[3]

مولانا ابو الکلام آزاد لکھتے ہیں:[4]

> جن لوگوں نے میرزا مرحوم کی صفائی کے لیے خاص طور پر کوشش کی تھی، مجھے معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ ان میں سر سید مرحوم بھی تھے۔ اس واقعہ سے سید صاحب اور میرزا مرحوم میں صفائی بھی ہو گئی، جن کے باہمی تعلقات تدمیانہ آئینِ اکبری کی تقریظ کے قصے سے کچھ مکدر ہو گئے تھے۔

مولانا حالی کے بیان کے مطابق یہ کشیدگی اس سے بہت پہلے اُس زمانے میں دور ہوئی، جب میرزا رام پور کے پہلے سفر سے واپس آتے ہوئے مارچ ۱۸۶۰ء میں مراد آباد میں ٹھہرے ہیں؛ سر سیدؔ ان دنوں یہاں صدر الصدور تھے۔ وہ انھیں سرائے سے اپنے یہاں اٹھوا لے گئے۔ یہیں وہ لطیفہ پیش آیا کہ سر سیدؔ نے میرزا کی شراب کی بوتل (جو گھر میں داخل ہوتے وقت ان کے ہاتھ میں تھی) اٹھا کر اسباب کی کوٹھری میں رکھ دی۔ میرزا نے جب بوتل موجود نہ پائی تو گھبرا کر پوچھا، میری بوتل کیا ہوئی؟ سر سید نے اطمینان دلایا۔ لیکن میرزا نہ مانے اور اس کے دیکھنے پر اصرار کیا۔ اس پر سر سیدؔ نے انھیں کوٹھری میں لے جا کر بوتل دکھائی۔ میرزا نے بوتل ہاتھ میں

۱۔ اردوے معلیٰ: ۸۰-۸۱ (اس خط کے آخر میں میرزا تاریخ میں غلطی کر گئے ہیں، جیسا کہ مہینے کے شروع میں بعض اوقات پچھلا مہینہ لکھا جاتا ہے؛ یہاں بھی ۱۳ رمضان مطابق ۴ فروری ۱۸۶۳ء میں فروری کی جگہ مارچ ہونا چاہیے) نیز دیکھیے ایضاً ص ۲۸۳ – ۲۸۴، اور مکاتیبِ غالب: ۲۴ (مکاتیب)

۲۔ اردوے معلیٰ: ۱۱۲ (مرزا حسین)؛ ایضاً: ۲۸۴ (آرام)؛ ایضاً: ۳۶۸ (تفتہ)؛ خطوطِ غالب (۱): ۸۷ (تفتہ)

۳۔ یہ قصیدہ سبدِ چین میں موجود ہے۔ قصیدہ ۱۔ نیز دیکھیے مکاتیبِ غالب: ۲۵ (مکاتیب)۔

۴۔ الہلال، ۱۷ جون ۱۹۱۴ء (مضمون "میرزا غالب کا غیر مطبوعہ کلام")

لی اور کہا: "اس میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے۔ سچ سچ بتاؤ، کس نے پی ہے؟ شاید اسی لیے تم نے یہ کوٹھری میں لا رکھی تھی۔ حافظ نے سچ کہا ہے:

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بہ خلوت می روند، آں کارِ دیگر می کنند"

یہ واقعہ بیان کر کے حالی مرحوم لکھتے ہیں[1]:

سر سید ہنس کے چپ ہو رہے اور اس طرح وہ رکاوٹ جو کئی برس سے چلی آتی تھی، رفع ہو گئی۔ میرزا دو ایک دن وہاں ٹھیر کر دلی چلے آئے۔

اگر چہ یہاں مولانا حالی سے یہ غلطی ہو گئی ہے کہ انھوں نے مراد آباد کے قیام کا زمانہ دو تین دن قرار دیا ہے۔ کیوں کہ میرزا غالباً اسی دن وہاں سے روانہ ہو گئے تھے، لیکن اس سے بہرحال یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ سر سید سے ان کی صفائی مارچ ۱۸۶۰ء میں ہو گئی تھی، نہ کہ ۱۸۶۲ء میں، جب ان کا دربار و خلعت بحال ہوتے ہیں اور چوں کہ حالی نے یہ واقعہ خود سر سید کی زبانی بیان کیا ہے، اس لیے ان کا بیان قابلِ ترجیح ہے۔ البتہ مولانا ابوالکلام مرحوم کی یہ اطلاع ٹھیک ہو سکتی ہے کہ سر سید نے بھی دربار اور خلعت کی بحالی کے سلسلے میں میرزا کی صفائی کے لیے کوشش کی ہو[2]۔

شاعرِ دربار کی تجویز

لارڈ ڈالہوزی گورنر جنرل اپنے عہدِ حکومت میں غالب پر خاص مہربانی فرماتے رہے تھے۔ میرزا کو سرکارِ انگریزی کی طرف سے خلعت کا اعزاز بھی انھی کے زمانے میں عطا ہوا تھا۔ ان سابقہ عنایتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میرزا نے ۹ نومبر ۱۸۵۵ء کو ایک قصیدہ لارڈ ڈالہوزی کی خدمت میں ولایت بھیجا کہ وہ اسے جنابِ ملکۂ معظمہ کی خدمت میں پیش کر دیں۔ تین ماہ بعد انھیں لارڈ ڈالہوزی

۱۔ حیاتِ جاوید (۱): ۶۶ (حاشیہ)

۲۔ مولانا آزاد کو اس مضمون میں ایک اور بھی سہو ہوا ہے جس قصیدے سے متعلق ان کا یہ مضمون ہے، انھوں نے اس کی تاریخ ۱۸۶۰ء متعین کی ہے۔ یہ قصیدہ ۱۸۶۳ء سے پہلے کا نہیں ہو سکتا، کیوں کہ اسی برس ان کے دربار و خلعت پر سے بندش رفع ہوئی تھی۔

کا خط (۹ جنوری ۱۸۵۶ء) ملا کہ قصیدہ ملکۂ عالیہ کی بارگاہ میں پیش کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے ایک ماہ بعد مسٹر رڈنگٹن سکتّر کا خط (یکم اپریل ۱۸۵۶ء) ملا کہ قاعدے کے مطابق آیندہ تمام ایسی چیزیں گورنر جنرل حال کے توسّط سے بھیجی جائیں۔ اس پر انھوں نے دوبارہ وہی قصیدہ لارڈ کیننگ گورنر جنرل کو بھیج دیا، جہاں سے یہ ۱۷ مئی ۱۸۵۶ء کو ولایت گیا[1]۔ گورنر جنرل کی خدمت میں قصیدہ بھیجتے وقت انھوں نے یہ درخواست بھی پیش کی[2] کہ جیسے روم و ایران کے بادشاہ اور دوسرے ملکوں کے حکمران اپنے مدح خوان شعرا کو بخشش و بخشایش کے مختلف طریقوں سے نوازتے ہیں، ان کے مُنہ موتیوں سے بھرواتے، اور انھیں سونے چاندی میں تُلواتے اور انعام عطا کرتے ہیں، میری درخواست یہ ہے کہ اس ثنا خوانِ قدیم کو بھی ملکۂ عالیہ کے دربار سے خطاب عطا ہو، اور میرے موجودہ خلعت اور پنشن میں بھی اضافہ کیا جائے۔ اس درخواست پر اگرچہ انھیں کوئی قطعی امید تو نہیں دلائی گئی تھی لیکن مسٹر رسل کلرک[3] کی طرف سے ۱۷ دسمبر ۱۸۵۶ء کا لکھا ہوا جو خط انھیں جنوری ۱۸۵۷ء کے اخیر میں موصول ہوا، وہ بالکل مایوس کرنے والا بھی نہیں تھا۔ میرزا انھیں امیدوں میں بیٹھے تھے، کہ فساد ہو گیا اور وہ بساط ہی الٹ گئی[4]۔

۱۔ پولٹیکل، ۲۳ مئی ۱۸۵۶ء (۸۳-۸۵)؛ نیز احوالِ غالب: ۲۸، ۱۸۵۔ یہ کلیاتِ نظم فارسی کا قصیدہ نمبر ۲۹ ہے۔ میرزا نے کلیاتِ نثر میں جہاں اس واقعے کا ذکر کیا ہے (ص ۳۹۴)، وہاں سکتّر کا نام "زرنگٹن بہادر" چھپا ہے۔ اس دستاویز سے معلوم ہوا کہ ان کا نام زرنگٹن نہیں، بلکہ رڈنگٹن ہے۔ (T.N. Redington) بیرورڈ آف کمشنرس کے سکتّر تھے۔ (زرنگٹن سہوِ کتابت بھی ہو سکتا ہے)

۲۔ کلیاتِ نثر: ۳۹۲-۳۹۴۔

۳۔ غالب نے کلیاتِ نثر (ص ۳۹۵) میں ان کا نام "مسٹر رسل کلرک بہادر" لکھا ہے۔ سرکاری خط و کتابت میں مجھے ایک سر جارج کلارک (Sir George Clark) کا نام ملا ہے (مثلاً انڈیا بورڈ، ۲۵ جولائی ۱۸۵۶ء) اور غالباً یہی درست بھی ہے۔ شروع میں یہ یہاں ہندستان میں بھی پنجاب اور سرحدی صوبے میں ملازم رہے تھے۔ لیکن چوں کہ اس کا بھی امکان ہے کہ میرزا نے جو نام لکھا ہے یہ کوئی اور صاحب ہوں، اس لیے میں نے متن میں وہی نام رہنے دیا ہے۔

۴۔ کلیاتِ نثر (فارسی): ۳۹۴-۳۹۵؛ اردوے معلّیٰ: ۴۲۱ (مجلس)

فساد کے دوران میں میرزا نے فارسی رسالہ دستنبو لکھا تھا، اور اس کے چند نسخوں کی جلدیں خاص اہتمام سے تیار کروا کے انھیں ہندستان اور انگلستان کے بڑے بڑے انگریز افسروں کو بھیجا تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ غلام غوث خاں میر منشی کو لکھتے ہیں[1]:-

اب بیٹھیے اور دھر کی ؛ ۱۸۵۶ء سے بموجب تحریرِ وزیر عطیۂ شاہی کا امیدوار ہوں۔ تقاضا کرتے ہوئے شرماؤں۔

یہ ۳۰ جنوری ۱۸۵۹ء کو لکھا تھا اس سے اگلے ہی دن ۳۱ جنوری کو انھوں نے خواجہ صاحب موصوف ہی کو ایک اور خط لکھا۔ اس میں خاص اس بات کو ذرا تفصیل سے لکھتے ہیں[2]:

۱۷ دسمبر ۱۸۵۶ء کا لکھا ہوا حکم وزیرِ اعظم کا ولایت کی ڈاک میں مجھ کو آیا ہے کہ قصیدہ کے صلہ اور جائزہ کے واسطے کہ جو بتوسط لارڈ ڈالن برا[3] سائل نے بھجوایا ہے، خطاب اور خلعت اور پنشن کی تجویز ضرور ہے، جو حکم صادر ہوگا، سائل کو بتوسط گورنمنٹ اس کی اطلاع دینی ضروری ہے۔ یہ حکم مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۸۵۶ء آخر جنوری ۱۸۵۷ء میں، مَیں نے پایا۔ فروری، مارچ، اپریل خوشی اور توقع میں گذرے مئی ۱۸۵۷ء میں فلک نے یہ فتنہ اٹھایا۔ اب اس کتاب (دستنبو) اور دوسرے قصیدے (شاملِ دستنبو) کی جابجا نذر کرنے کا یہ سبب ہے کہ سائل محکمۂ ولایت کو یاددہی کرتا ہے، اور گورنمنٹ سے تحسین طلب ہے۔

میرزا کو ان یاددہانیوں سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ مزید خطاب و خلعت تو درکنار، پہلا دربار و

۱۔ اردوے معلّیٰ: ۲۰۵

۲۔ اردوے معلّیٰ: ۲۱۴

۳۔ یہاں میرزا غلطی سے لارڈ کیننگ کی جگہ لارڈ ڈالن برا لکھ گئے ہیں چونکہ انھوں نے پہلے قصیدہ لارڈ ڈالن برا کے توسط سے بھیجا تھا، وہی نام ان کے ذہن میں رہا؛ صحیح لارڈ کیننگ ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا پہلے جو قصیدہ لارڈ ڈالن برا کے ذریعے سے بھیجا گیا تھا، اس کی رسید رڈنگٹن نے یکم اپریل کو بھیج دی تھی۔ ۱۷ دسمبر ۱۸۵۶ء کا خط کلرک نے لکھا تھا، اور یہ کیننگ والے قصیدے کی رسید تھی۔

خلعت اور پنشن بھی جاری نہ ہوتے۔ اور اگلے تین برس انھیں کے واگزار کرانے کی دوڑ دھوپ میں گذر گئے۔ آخر جب مئی ۱۸۶۰ء میں پنشن اور مارچ ۱۸۶۳ء میں دربار و خلعت جاری ہو گئے، تو انھیں پھر اپنا پرانا مطالبہ یاد آیا۔ اس پر انھوں نے ۱۸۶۵ کے آغاز میں دوبارہ درخواست دی کہ (۱) مجھے ملکۂ عالیہ کا شاعرِ دربار مقرر کیا جائے؛ (۲) دربار میں پہلے سے اونچی جگہ دی جائے؛ اور (۳) میری کتاب دستنبو حکومت اپنے خرچ پر شائع کرے۔ اس پر گورنر جنرل نے لفٹننٹ گورنر پنجاب سے ان کے بارے میں رپورٹ طلب کی چیف سکتر گورنمنٹ پنجاب نے لکھا کہ میرے خیال میں کمشنر دہلی کی یہ سفارش معقول ہے کہ علیا حضرت ملکۂ معظمہ کا تو نہیں، لیکن انھیں وایسرائے کا درباری شاعر مقرر کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ بھی لازم نہیں کہ عہدے کے ساتھ کوئی تنخواہ مقرر ہو، ہاں؛ سالانہ خلعت ضرور دیا جائے اور اگر سال کے دوران میں بھی کسی خاص تقریب پر وہ قصیدہ پیش کریں، تو بیشک اس موقع پر بھی خلعت دیا جا سکتا ہے۔ اس سے میرزا غالب کی بھی اشک شوئی ہو جائیگی اور علومِ شرقیہ کی حوصلہ افزائی بھی، جو اس وقت بہت کم نگاہی کا شکار ہو رہے ہیں۔

اس پر مزید تحقیقات کا حکم ہوا کہ غدر کے دنوں میں ان کے رویّے کی تفتیش کی جائے۔ نیز ان سے دستنبو کا ایک نسخہ طلب کر کے اس پر بھی رائے لکھی جائے۔ جب میرزا سے دستنبو کا نسخہ طلب کیا گیا ہے، اس وقت وہ رام پور میں تھے۔[1]

رام پور کا دوسرا سفر

دوسرے سفرِ رام پور کی تقریب یہ تھی کہ ۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء کو نواب محمد یوسف علی خان نے بعارضۂ سرطان انتقال کیا اور ان کی جگہ ان کے فرزندِ اکبر نواب کلب علی خان مسند نشین ہوئے۔ میرزا نواب فردوس مکان کی تعزیت اور نوابِ حال کی تہنیت کے لیے ۷ اکتوبر ۱۸۶۵ء کی صبح کو دلّی سے روانہ ہوئے۔[2] ملازموں کے علاوہ اس سفر میں بھی باقر علی خان اور حسین علی خان ان کے ساتھ تھے۔ چھ دن کے سفر کے بعد وہ ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۵ء جمعرات کے دن رام پور

۱۔ فارن، ستمبر ۱۸۶۵ء (۳، ۷-۵)؛ نیز فارن (عمومی)، فروری ۱۸۶۶ء (۳۰-۳۴)

۲۔ اردوے معلّیٰ: ۱۸۱ (بنام حکیم احمد حسین مودودی)

پہنچے[۱]۔ نواب کلب علی خان خلد آشیان نے "تعظیم، تواضع اخلاق کسی بات میں کمی نہیں کی"[۲]۔ جرنیلی کوٹھی اقامت کے لیے عطا ہوئی[۳]۔ پہلے صبح و شام دونوں وقت کا پر تکلف کھانا شاہی مطبخ سے آتا رہا، بعد کو سب کی نقدی ہو گئی[۴]۔

دستنبو کا دوسرا ایڈیشن

میرزا یہاں نواب کلب علی خان کی تخت نشینی کے "جشن جمشیدی" سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ حکومت پنجاب کی طرف سے انھیں دستنبو کا ایک نسخہ بغرض ملاحظہ چیف سکرٹری کے پاس بھیجنے کا حکم ملا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ رام پور میں میرزا کو غالباً پہلے ایڈیشن کا کوئی اچھا نسخہ دستیاب نہیں ہوا اور جو ملا، وہ اس قابل نہیں تھا کہ اسے حکومت کو بھیجا جا سکے۔ چوں کہ حکومت کی طرف سے مطالبہ ہوا تھا اور میرزا کی اس سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں، اس لیے انھوں نے پہلے ایڈیشن کا یہ نسخہ صحیح کر کے اسے لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ، بریلی کے مطبع میں دوبارہ طبع کرایا اور اس دوسرے ایڈیشن کا ایک نسخہ حکومت پنجاب کو بھیج دیا۔

درخواست کا فیصلہ

حکومت کے میر منشی نے دستنبو دیکھ کر رپوٹ کی کہ اس کتاب کی زبان پرانی پارسی ہے۔ قدرتی طور پر اس میں ایسے لفظ آ گئے ہیں جو اب بہت کم استعمال ہوتے ہیں اور عام طور پر رائج نہ ہونے کی وجہ سے نامانوس اور بعید الفہم ہیں۔ اس صورت میں حکومت کا اسے اپنے خرچ پر شائع کرنا کچھ ضروری نہیں۔ اس کے ساتھ ہی غدر کے دوران میں غالب کے رویے کی بھی تحقیق ہو رہی تھی۔ اس پر پھر وہی گوری شنکر کی بدبخت رپوٹ برآمد ہوئی جس میں میرزا سے سکہ منسوب کیا گیا تھا۔ قصہ کوتاہ، ان سب باتوں پر غور کر کے حکومت نے ۶ جنوری ۱۸۶۶ء کو یہ فیصلہ کیا کہ میرزا کو درباری شاعر بنانا مناسب نہیں، البتہ گورنر جنرل کو اس پر کوئی

۱۔ ایضاً: ۱۵۵ (بنام جنون)؛ خطوط غالب: ۱۹۲

۲۔ ایضاً: ۱۶۴ (بنام غلام نجف خان) بانیز خطوط غالب (۱): ۸۵؛

۳۔ مکاتیب غالب: ۱۱۷ (دیباچہ)

۴۔ اردوئے معلیٰ: ۱۶۴-۱۶۷؛ خطوط غالب (۱): ۹۶؛ (بنام غلام نجف خان)

اعتراض نہ ہوگا، اگر لفٹننٹ گورنر پنجاب انھیں خلعت دیں، یا دربار میں پہلے سے اونچی جگہ عطا کردیں[۱]۔

رام پور سے واپسی

باقر علی خاں اور حسین علی خاں رام پور سے ملازموں کے ساتھ ۲۲ دسمبر ۱۸۶۵ء کو چلے آتے تھے۔ میرزا خود اس کے چند روز بعد ۲۸ دسمبر کو روانہ ہوئے[۲]۔ راستے میں ایک افسوسناک حادثہ پیش آیا۔ برسات کے دن تھے، اور رام گنگا میں سیلاب تھا۔ میرزا خود پالکی میں تھے؛ اور شاگرد پیشہ پیدل یا سواریوں پر۔ دریا پر کشتیوں کا عارضی اور کمزور سا پل تھا۔ جونہی ان کی پالکی دریا کے اس پار پہنچی، پانی کے ایک زوردار ریلے میں پُل بہ گیا۔ ملازم تمام اسباب اور زادِ راہ سمیت اُس کنارے پر رہ گئے، اور یہ اکیلے اِس کنارے پر۔ گرتے پڑتے مشکل سے مراد آباد کی سرائے میں پہنچے اور ایک کمبل میں رات بسر کردی۔ بڑھاپا اور کمزوری، دسمبر کا جاڑا اور بارش، اس پر ناکافی کپڑوں کی مصیبت؛ قدرتاً بیمار ہوگئے۔ اگلی صبح مولوی محمد حسن خاں صدر الصدور مراد آباد کو خبر ملی، تو وہ اپنے ہاں لِوالے گئے، اور تیمارداری کی[۳]۔ یہیں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ رام پور جاتے ہوئے ان سے ملے۔ شیفتہ نے رام پور پہنچ کر نواب خلد آشیان سے اس حادثے کا ذکر کیا، تو نواب صاحب نے فوراً ایک خاص آدمی کے ذریعے سے میرزا صاحب کو خط بھیجا، کہ اگر طبیعت زیادہ ناساز ہو اور آپ کا ارادہ پوری صحت ہوجانے تک مراد آباد میں ٹھہرنے کا ہو، تو رام پور تشریف لے آیئے؛ یہاں علاج معالجہ بخوبی کیا جائیگا[۴]۔ میرزا اس خط کے پہنچنے سے پہلے ہی مراد آباد سے روانہ ہوچکے تھے۔ دلی پہنچنے کے بعد انھوں نے ایک خط نواب کلب علی خاں کی خدمت میں

۱- فارن (عمومی)، فروری ۱۸۶۶ء (۳۰-۳۴)

۲- اردوے معلّیٰ: ۲۹۲ (بنام نواب علائی)؛ خطوطِ غالب (۱): ۴۱۳

۳- ایضاً: ۷۸؛ ایضاً: ۹۹

۴- مکاتیبِ غالب: ۱۵۸-۱۵۹ (حاشیہ (۳) متعلقہ ص ۴۹)

لکھا، جس میں حادثے کی تفصیلات سے انھیں اطلاع دی ہے[1]۔

بعد تسلیم معروض ہے۔ مراد آباد پہنچنا، بعد پالکی کے اتر آنے کے پل کا ٹوٹ جانا، گاڑی اسباب، یہاں تک کہ رخت خواب کا مع آدمیوں کے، اس زہریر کے میدان میں رہنا، بغیر جاڑے کے کچھ نہ کھانا، بخیر جو اُن پر گذری، وہ جانیں، میں مراد آباد کی سرا میں ایک چھوٹی سی حویلی میں ٹھیرا۔ بھوکا پیاسا، کمل اوڑھ کر پڑ رہا۔ یہ شعر اپنا پڑھ پڑھ کر صبح کی:

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

صبح کو خستہ و رنجور اٹھا، صاحبزادہ ممتاز علی خان بہادر کے بھیجے ہوئے دو فرشتے آئے، اٹھا کر سعید الدین خان صاحب کے ہاں لے گئے۔ صاحب زادہ صاحب نے وہ تعظیم و تکریم اور سعید الدین صاحب نے وہ تکریم و تعظیم کی کہ میری آرزش سے زیادہ تھی۔ ناگاہ مولوی محمد حسن خان بہادر صدر الصدور آئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے۔ پانچ دن وہاں رہا۔ بھائی نواب مصطفیٰ خان بہادر وہیں آکر مجھ سے ملے۔ دوسرے دن وہ رہ گرائے دار السرور رام پور ہوئے، اور میں جادہ نورد ستم آبادِ دہلی ہوا۔ دوشنبہ ۲ شعبان ۱۲۸۲ھ، ۸ جنوری ۱۸۶۶ء، در غم کدہ پر پہنچا۔ حضور کے اقبال کی تائید تھی، ورنہ میں، اور جیتا دلی پہنچتا!

مولوی محمد حسن خان کو لکھتے ہیں[2]:

قبلہ! آپ سے رخصت ہو کر بھیگتا، بھاگتا، بھوکا، جاڑا کھاتا، پرسوں ۱۱ بجے دن کو اپنے گھر پہنچا۔ اقربا و احبا کو زندہ و صحیح و سالم پایا۔ الشکر للہ۔

۱۔ ایضاً: ۸۰ھ (مکاتیب)

۲۔ عکس خط اورینٹل کالج میگزین (لاہور)، فروری ۱۹۴۰ء۔ اس خط کے آخر میں تاریخ ۱۱ جنوری درج ہے۔ چونکہ اوپر لفظ "پرسوں" لکھا ہے، اس سے خیال ہو سکتا ہے کہ وہ ۹ جنوری کو دہلی پہنچے۔ یہاں انھوں نے سہل انگاری سے "پرسوں" لکھ دیا ہے، دلی میں ورود ۸ جنوری ہی کو ہوا تھا۔

> اب میں تندرست ہوں۔ اس سفر میں سراسر خستہ و رنجور رہا۔ اتمام سفر، اختتام رنج تھا گویا، کیا عرض کروں۔ غازی آباد شہر سے سات کوس ہے، شب کو وہاں مقام تھا۔ وہیں سے طبیعت اصلاح پر آنے لگی۔ قبض و انقباض رفع ہو گیا۔ صحت مع اعادۂ طاقت حاصل ہے۔

میرزا کا یہ سفر مالی اعتبار سے بہت ناکام اور مایوس کُن رہا۔ جب وہ نواب کلب علی خان کی تاجپوشی کے جشن میں شرکت کے لیے "جوانانہ" گئے ہیں، تو انھیں توقع تھی کہ نواب صاحب اس مبارک تقریب پر روایتی جُود و سخا سے کام لیتے ہوئے دربارِ رام پور کے شاعر کو خاص طور پر نوازینگے۔ وہ جن پریشانیوں میں گھرے ہوئے تھے، ان سے نکلنے کے لیے انھیں خاصی بڑی رقم کی ضرورت تھی، اور یہ رام پور کے سوا اور کسی جگہ سے مل نہیں سکتی تھی۔ وہ رام پور اسی عطیۂ خاص کے لیے گئے تھے۔ ورنہ ان ایام میں ان کی صحت کی جو حالت تھی، وہ اس سفر کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ دیکھیے، تفتہ کو رام پور سے کیسا معنی خیز خط لکھا ہے:[^۱]

> میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا، بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا، سرکار سے ملتی ہے۔ وقتِ رخصت میری قسمت، اور منعم کی ہمّت۔ نواب صاحب از روے صورت، روحِ مجسّم اور باعتبارِ اخلاق، آیتِ رحمت ہیں۔ خزانۂ فیض کے تحویلدار ہیں، جو شخص دفترِ ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے، اُس کے پانے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپیہ سال غلّے کا محصول معاف کر دیا، ایک اہلکار پر ساٹھ ہزار کا محاسبہ معاف کر دیا اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا، منشی نولکشور صاحب کی عرضی پیش ہوئی، خلاصۂ عرضی کا سن لیا، واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ، بتقریبِ شادی صُبیہ تجویز ہو رہا ہے، مقدار مجھ پر نہیں کھلی۔

لیکن میرزا کی قسمت یاور نہیں تھی۔ دورِ جام ان تک پہنچتے پہنچتے خم خالی ہو گیا اور انھیں

[^۱]: اردوے معلّیٰ: ۱۱۰، خطوطِ غالب (۱): ۹۸-۹۹ تقریباً یہی باتیں حکیم غلام رضا خان کو بھی لکھی ہیں (اردوے معلّیٰ: ۳۴۳)

"دُردِ تہِ جام" سے سوا کچھ نہ ملا۔ اگرچہ میرزا کے کسی خط یا تحریر سے معلوم نہیں ہوتا کہ انھیں کیا عطیہ ملا، لیکن مولانا عرشی لکھتے ہیں[1]۔ کہ نواب خلد آشیاں نے ان کے رام پور پہنچنے کے بعد انھیں ایک ہزار روپے "بتقریبِ جشنِ تخت نشینی" عطا فرمائے تھے اور رخصت ہوتے وقت مزید دو سو بطور "زادِ راہ" مرحمت فرمائے یعنی کل بارہ سو روپیے۔ بھلا کہیں اُس سے پیاس بجھتی ہے! جیسا کہ خود غالب نے ایک خط میں تفتہ کو لکھا ہے، اور کسی چیز میں ہو نہ ہو، احتیاج میں ان کا پایا بہت بلند تھا۔ ان کی ضرورت اور توقع کے مقابلے میں یہ بارہ سو بہت کم تھے۔ رام پور سے رخصت ہونے سے دو چار دن پہلے نواب علاء الدین احمد خان کو ایک خط لکھا ہے[2]۔ اس میں ایک نہایت پہلو دار شعر ہے:

اولِ ما، آخرِ ہر منتہی، در اکرام و عزت آخرِ ما، جیبِ تمنا تہی، از مال و دولت

دلّی واپس پہنچنے پر کس حسرت سے منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں[3]:

لو صاحب، کچڑی کھائی، دن بہلائے، کپڑے پھاٹے، گھر کو آئے۔

۸ جنوری، ماہ و سالِ حال، دو شنبہ کے دن، غضبِ الٰہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا۔

جس موقع پر یہ ضرب المثل استعمال ہوتی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

افسوس کہ اس کے بعد جلد ہی ان کے تعلقات نواب کلب علی خان سے بگڑ گئے۔ اس کی ابتدا میرزا کی طرف سے ہوئی؛ انھوں نے ایک خط میں حسبِ عادت ہندستانی فارسی نویسوں کے خلاف طعنہ زنی کی تھی[4]۔ لیکن اس میں بہت کچھ نواب خلد آشیاں کی "نازک مزاجی" بلکہ "تنک مزاجی" کو بھی دخل تھا۔ انھوں نے اس خط کے بعض الفاظ کے ایسے معنی لیے، جو یقیناً میرزا کا مقصود نہیں تھا۔ اس کے بعد میرزا نے ہزار جتن کیے کہ کسی طرح نواب صاحب کا دل ان کی طرف سے صاف ہو جائے، لیکن بدقسمتی سے ان کی یہ تمام کوششیں ناکام رہیں، بلکہ ان سے حالت

۱۔ مکاتیبِ غالب: ۱۲۵ (دیباچہ) و ص ۱۳۷ (دیباچہ)

۲۔ اردوے معلیٰ: ۲۹۲؛ خطوطِ غالب (۱): ۱۳۴

۳۔ ایضاً: ۷۰؛ خطوطِ غالب (۱): ۹۹

۴۔ مکاتیبِ غالب: ۹۰-۹۱ (مکاتیب)

بد سے بدتر ہوتی چلی گئی![1]

آخری ایام

غالب ایک مدت سے بیمار چلے آتے تھے۔ سلسلِ بول اور قبض کی شکایت انھیں شروع سے تھی اور ان موذی امراض سے وہ ہمیشہ نالاں رہے۔ مئی ۱۸۵۸ء میں ان پر قولنج کا پہلا حملہ ہوا اور اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے یہ دورے آخر تک ہوا کیے۔ ۱۸۶۱ء میں وہ اتنے کمزور تھے کہ جب اس سال جون میں نواب محمد یوسف علی خان نے اپنے منجھلے صاحبزادے حیدر علی خان کی رسمِ نکاح میں شمولیت کے لیے انھیں رام پور آنے کی دعوت دی، تو انھوں نے کمزوری اور علالت کا عذر کر کے حاضری سے معافی چاہی اور تہنیت کے دو قطعے لکھ کر بھیج دیے[2]۔ ۱۸۶۲ء اور ۱۸۶۳ء کا بیشتر حصہ پھوڑوں اور زخموں کی تکلیف میں بسر ہوا "جتنا خون بدن میں تھا، بے مبالغہ آدھا اس میں سے پیپ بن کر نکل گیا۔ سن کہاں، جواب تولیدِ دمِ صالح ہو۔" اگرچہ اس بیماری سے وہ اچھے ہو گئے مگر صحت اس حد تک بحال نہیں ہوئی تھی کہ تندرست کہے جا سکیں۔ ۱۸۶۳ء ہی میں انھیں پہلے پہل فتق کی شکایت بھی محسوس ہوئی۔ یہ صورت تھی، جب رام پور سے واپسی پر یہ حادثہ جانکاہ پیش آیا۔ اس نے گویا رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اس کے بعد انھیں صحت کا ایک دن بھی نصیب نہیں ہوا۔ ۱۲ مئی ۱۸۶۶ء کو مولوی حبیب اللہ خان ذکا کو لکھتے ہیں[3]:

> میرے محب، میرے محبوب! تم کو میری خبر بھی ہے۔ آگے ناتوان تھا، اب نیم جان ہوں۔ آگے بہرا تھا، اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رام پور کے سفر کا رہ آورد ہے: رعشہ و ضعفِ بصر۔ جہاں چار سطریں لکھیں، انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں، حروف سوجھنے سے رہ گئے۔ اکہتر برس جیا، بہت جیا۔ اب زندگی برسوں کی نہیں، مہینوں اور دنوں کی ہے۔

۱۔ اس سلسلے میں دیکھیے میرا مفصل مضمون "دربارِ رام پور سے تعلقات" مشمولہ فسانۂ غالب"

۲۔ کلیاتِ غالب، قطعات (۳۶) اور (۳۷)

۳۔ اردوئے معلیٰ: ۲۸

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اوائلِ عمر کی بداعتدالیوں اور شراب نوشی نے ان کی تندرستی کی بنیادیں کھوکھلی کردی تھیں۔ لیکن جب تک قویٰ مضبوط اور درست رہے، یہ خرابیاں ظاہر نہیں ہونے پائیں۔ جب کہولت کے بعد بڑھاپا شروع ہوا تو یک لخت مصیبتوں نے انھیں آ گھیرا۔ آمدنی کم ہوگئی اور وہ اپنی خوراک اور آسایش کا پہلا سا معیار قائم نہ رکھ سکے۔ اس سے وہ مخفی اثرات ابھر کر سطح پر آ گئے اور طرح طرح کی بیماریوں نے انھیں آ دبایا۔ اس پر بھی ممکن تھا کہ وہ ابھی اور کچھ دن زندہ رہ جاتے، مگر رام پور کے سفر میں جو ناگہانی افتاد پیش آئی، اس نے ان کی موت کو قریب سے قریب تر کردیا اور اس کے بعد وہ مستقل طور پر صاحبِ فراش ہوگئے۔

۴ دسمبر ۱۸۶۶ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں[1]:

> اس مہینے یعنی رجب کی آٹھویں تاریخ سے بہتّرواں برس شروع ہوا۔ غذا، صبح کو سات بادام کا شیرہ، قند کے شربت کے ساتھ؛ دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی؛ قریبِ شام کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب؛ چھ گھڑی رات گئے پانچ روپیہ بھر، شرابِ خانہ ساز اور اسی قدر عرقِ شیر۔ اعصاب کے ضعف کا یہ حال کہ اٹھ نہیں سکتا۔ اور اگر دونوں ہاتھ ٹیک کر، چارپایہ بن کر اٹھتا ہوں، پنڈلیاں لرزتی ہیں۔ مع ہذا دن بھر میں دس بارہ بار، اور اسی قدر رات بھر میں پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے۔ اٹھا اور پیشاب کیا اور پڑ گیا۔ اسبابِ حیات میں سے یہ بات ہے کہ شب کو بدخواب نہیں ہوتا۔ بعدِ اراقۂ بول بے توقف نیند آجاتی ہے۔ ایک سو ساٹھ روپیے کی آمد، تین سو کا خرچ، ہر مہینے میں ایک سو چالیس کا گھاٹا۔ کہو، زندگی دشوار ہے یا نہیں؟ مردنِ ناگوار بدیہی ہے؛ مرنا کیوں کر گوارا ہوگا۔

قریب قریب یہی حالت ان ایام کی مولانا حالی نے بیان کی ہے[2]۔ آخری دو سال میں انھوں نے

۱۔ اردوئے معلیٰ، ص ۳۲ (بنام مولوی حبیب اللہ خان ذکا)

۲۔ یادگارِ غالب: ۱۱۶

۱۸۶۷ء میں تو ان کی وفات تک کی افواہ پھیل گئی تھی۔ اس پر مولوی حبیب اللہ خان ذکا نے تاریخ کہی:

کہیں باہر جانا آنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ دن رات کے اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ اگرچہ کسی حد تک کمزور حالت میں بینائی آخر تک قائم رہی، لیکن کانوں سے بالکل بہرے ہو گئے تھے۔ اگر کوئی تکلّف کا ملاقاتی آجاتا، تو جوں توں کر کے اٹھ بیٹھتے، ورنہ لیٹے رہتے۔ ثقلِ سماعت کے باعث بات لکھ کر کرتے تھے۔ پہلے کچھ مدّت تک خطوں کے جواب لیٹے لیٹے لکھ لیتے تھے، لیکن جب ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہو گیا اور قلم پکڑنے اور لکھنے سے انگلیوں میں تکلیف ہونے لگی، تو اس حالت میں قدرتاً خطوں کا لکھنا بھی ترک ہو گیا۔ اگر کوئی ملنے والا آجاتا، تو باہر کے دوستوں کے خطوں کا جواب اس سے لکھوا لیتے تھے؛ خود بولتے جاتے اور وہ لکھتا جاتا۔

غرض کہ وہ صحیح معنوں میں اپنے ہی اس شعر کا مصداق بن گئے تھے:

بہار پیشہ جوانے کہ غالبش نامند
کنوں ببیں کہ چہ خوں می چکد ز ہر نَفَسَش

اعتذار کا اعلان

شعر لکھنا اور کلام پر اصلاح دینا حواس کا کام ہے۔ جب انسان کے قواء اپنا معمولی کام بھی نہ کر رہے ہوں، تو شعر و شاعری کیسے سوجھ سکتی ہے! چناں چہ جب ان کے ہاتھوں میں رعشہ شروع ہو گیا اور بینائی میں بھی فرق آگیا، تو انھوں نے فروری ۱۸۶۶ء میں دلّی کے دو اخباروں، اکمل الاخبار اور اشرف الاخبار میں اعلان چھپوایا[1]۔ اس کے آخر میں لکھتے ہیں:

میرے احباب میرے حال سے اطلاع پائیں۔ اگر خط کا جواب یا اصلاحی غزل دیر

(صفحہ ۱۳۱ کا بقیہ) گذشت از جہاں آں جہانِ سخن / کہ می گفتمش عرفی و طالب است
خرد گفت سالش، ریاضِ جناں / کراں تا کراں مسکنِ غالب است
(ماش و خماش: ۲۰۹)

("ریاضِ جناں" کا اوّل و آخر یعنی ر (۲۰۰) اور ن (۵۰) لے کر اس میں غالب کے اعداد (۱۰۳۳) جمع کرنے سے مطلوبہ تاریخ (۱۲۸۳) حاصل ہوتی ہے)

[1] سہ ماہی اردو، اپریل ۱۹۲۹ء: ۱۷۷-۱۷۹؛ نیز دیکھیے اردوئے معلّیٰ: ۳۸۳ (بنام سیّاح)

میں پہونچے، تو تقاضا، اور اگر نہ پہونچے تو شکایت نہ فرمائیں، میں دوستوں کی خدمت گزاری میں کبھی قاصر نہیں رہا اور خوشی خوشنودی سے کام کرتا رہا۔ جب بالکل نکما ہو گیا، نہ حواس باقی، نہ طاقت؛ پھر اب کیا کروں۔ بقول خواجہ وزیر:

میں وفا کرتا ہوں، لیکن دل وفا کرتا نہیں

اگر کسی صاحب کو میری طرف سے کچھ رنج و ملال ہو، تو خالصاً للہ معاف فرمائیں۔ اگر جوان ہوتا، تو احباب سے دعائے صحت کا طلب گار ہوتا؛ اب جو بوڑھا ہوں، تو دعائے مغفرت کا خواہاں ہوں۔

ان کی تندرستی کی جو حالت تھی، اس کے پیشِ نظر ان کی یہ معذرت بالکل حق بجانب تھی۔ لیکن اس کے باوجود کسی نے ان کی مجبوریوں کا خیال نہ کیا اور آخر تک وہ دوستوں کے خطوں کے جواب لکھتے یا لکھواتے رہے۔ اور کلام بھی اصلاح کے لیے بدستور آتا رہا[1]۔

وفات

آخر وہ دن آ گیا جس کی انھیں ایک مدت سے تمنا تھی۔ چوں کہ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ اب میں پورے طور پر صحت یاب نہیں ہو سکتا، اس لیے اکثر اپنا یہ مصرع پڑھا کرتے:

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے؟

یہ شعر بھی عموماً وردِ زبان رہتا تھا:

عزیزو! اب، اللہ ہی اللہ ہے ۔۔۔ دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے

مرض کی شدت کے باعث موت سے چند دن پہلے متواتر غشی کے دورے پڑتے رہے۔ اب وہ مستقل طور پر دیوان خانے ہی میں رہتے تھے۔ کھانا پینا بالکل چھوٹ گیا تھا۔ بگا بیگم فرماتی تھیں کہ موت سے ایک دن پہلے کچھ افاقہ ہوا تو کھانے کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ پھر ملازم سے کہا کہ میرزا جیون بیگ (یعنی میرزا باقر علی خان اور بگا بیگم کی سب سے بڑی صاحب زادی) کو بلا لاؤ۔ یہ عموماً انھیں کے پاس کھیلتی رہتی تھیں۔ کلو ملازم انھیں بلانے کے لیے محلسرا میں آیا تو وہ آرام کر رہی تھیں۔ بگا بیگم نے کہا کہ سو رہی ہے، جونہی جاگتی ہے بھیجتی ہوں۔ ملازم

---

[1] اردوے معلی، ص ۱۵ (بنام سیاح)

نے واپس آکر یہی کہہ دیا۔ اس پر فرمایا کہ بہت اچھا، جب وہ آئیگی ہم کھانا کھائینگے، اس کے بعد جونہی گاؤ تکیے پر سر رکھا، بے ہوش ہو گئے۔ فوراً حکیم محمود خاں[1] اور حکیم احسن اللہ خاں کو اطلاع دی گئی۔ انھوں نے تشخیص کی کہ دماغ پر فالج گرا ہے۔ تمام کوششیں اور علاج کیے گئے، مگر بےسود۔ انھیں ہوش نہیں آیا، نہ اس کے بعد انھوں نے کوئی بات ہی کی۔ اسی حالت میں اگلے دن ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء (مطابق ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ) روز دوشنبہ دوپہر ڈھلے[2] (بوقت ظہر[3]) اس باکمال کا انتقال ہوگیا، جس نے اگر ایک طرف اس ملک میں علم و ادبِ فارسی کو نقطۂ معراج تک پہنچا دیا، تو دوسری طرف اردو نظم و نثر کو تقلید کی زنجیروں سے آزاد کر کے ایک نئے رنگ کی بنیاد ڈالی، جس کی پیروی تو بہت نے کی، مگر کامیابی کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ اِلّا ماشاء اللہ۔

جنازے کی نماز دلّی دروازے کے باہر ہوئی۔ بعض شیعی حضرات نے کہا کہ مرحوم شیعی تھے، اس لیے ہمیں اپنے مسلک کے مطابق ان کی تجہیز و تکفین کی اجازت دی جائے؛ لیکن نواب ضیاء الدّین احمد خاں اور حکیم محمود خاں نہیں مانے۔ دونوں صاحبوں کا دلّی میں بہت اثر و رسوخ تھا، خصوصاً حکیم محمود خاں کا۔ اگرچہ میرزا کی شیعیّت اور اثنا عشریت کسی سے مخفی نہ تھی، لیکن کوئی ان دونوں کے سامنے دم نہ مار سکا اور تمام رسوم اہلِ سنّت ہی کے طریقے پر ادا ہوئیں۔ سلطان جی میں، چونسٹھ کھمبا کے متّصل، اپنے سسرال کے قبرستان میں دفن ہوئے، جہاں اس خاندان کے اور افراد بھی محوِ خواب تھے۔ میرزا حیرت نے لکھا ہے[4] کہ اس احاطے کی پختہ چار دیواری میرزا غالب کے کسی ہندو شاگرد نے بنوائی تھی۔ میں نہ اس بیان کی کہیں سے تصدیق کر سکا، نہ مجھے اس ہندو شاگرد کا نام ہی معلوم ہوا۔

مرورِ زمانہ سے قبر بلکہ قبرستان ہی کی حالت بہت خستہ ہوگئی تھی۔ کئی مرتبہ ملک میں تحریک ہوئی کہ اس مایۂ ناز شاعر کا مقبرہ تعمیر کیا جائے، جو خود اس کی شان کے بھی شایاں ہو،

۱۔ بروایت بگّا بیگم

۲۔ اکمل الاخبار دہلی، ۱۷ فروری ۱۸۶۹ء بحوالہ اردو اپریل ۱۹۳۵ء: ۲۴۷ (میر مہدی مجروح کا خط)

۳۔ مکاتیبِ غالب: ۱۸۹ (حواشی) (شاداں کا خط بنام کلب علی خاں بہادر) ۴۔ چراغ دہلی: ۳۶

اور اس کے مداحوں اور مرتبہ شناسوں کے لیے بھی باعثِ فخر۔ دو تین مرتبہ کچھ روپیہ بھی اکٹھا ہوا، لیکن عملی کام زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھا۔ آخر کار بعض اصحابِ علم و ذوق نے "غالب سوسائٹی" کی تشکیل کی، چندہ جمع کیا اور موجودہ سنگِ مرمر کی چوکھنڈی تعمیر کرادی۔ اس کا افتتاح ۱۵ فروری ۱۹۵۵ء کو ہوا تھا، جو میرزا کا یومِ وفات ہے[1]۔

متعدد حضرات نے مرثیے اور تاریخیں لکھیں۔ ان میں سے حالی اور مجروح اور سالک کے مرثیے زیادہ مشہور ہیں۔ ایک تاریخ جس میں اکثر اصحاب کو توارد ہوا، "آہ غالب بمرد" ہے۔ یہ دراصل خود میرزا کے ایک قطعے سے ماخوذ ہے۔ انھوں نے از راہِ تفنن ایک مدت پہلے اپنی تاریخِ وفات کا یہ قطعہ لکھا تھا:

من کہ باشم کہ جاوداں باشم   چوں نظیری نماند و طالب مُرد
در بگویند، در کدامیں سال   مُرد غالب، بگو کہ "غالب مُرد"

لوحِ مزار پر میر مہدی مجروح کا یہ قطعۂ تاریخ کندہ ہے:

یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد   اسد اللہ خانِ غالب مرد

کل میں غم و اندوہ میں با خاطرِ محزوں
تھا تربتِ استاد پہ بیٹھا ہوا غم ناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح
ہاتف نے کہا: "گنجِ معانی ہے تہِ خاک"[2]
(۱۲۸۵ھ)

۱۔ پوری تفصیل کے لیے دیکھیے میرا مضمون "غالب سوسائٹی" مشمولہ "فسانۂ غالب"

۲۔ اکمل الاخبار کی محولہ فوق اشاعت میں میرزا کی وفات سے متعلق میر مہدی مجروح کا جو خط چھپا ہے، اس کے آخر میں یہ قطعہ یوں ہے: کل مرقدِ استاد پہ افراطِ الم میں   ہاتف نے جو بیٹھے ہوئے دیکھا مجھے غم ناک
بولا، ہے اگر فکر میں تاریخ کی، مجروح!   کہہ دے یہی، "گنجِ معانی ہے تہِ خاک"
ظاہر ہے کہ نظرِ ثانی میں یہ قطعہ اس طرح ہو گیا، جیسا اب لوحِ قبر پر موجود ہے۔

اولاد اور خاندان

میرزا کے اپنے سات بچے پیدا ہوئے، لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی، لیکن کوئی پندرہ مہینے سے زیادہ نہیں جیا![1]

میرزا الٰہی بخش خان معروف کی دو صاحبزادیاں تھیں، بڑی کا نام بنیادی بیگم تھا اور چھوٹی کا امراؤ بیگم۔ چھوٹی میرزا غالب کے نکاح میں آئیں؛ بڑی شرف الدّولہ غلام حسین خان سرور[2] سے منسوب تھیں۔ اس بیوی سے مسرور کے دو صاحبزادے ہوئے: زین العابدین خان اور حیدر حسین خان۔ جب میرزا غالب کا اپنا کوئی بچہ زندہ نہ رہا، تو انھوں نے زین العابدین خان کو متبنٰی کر لیا۔ زین العابدین خان نہایت خوش فکر شاعر تھے؛ اپنے نانا الٰہی بخش خان معروف کے تخلص کی رعایت سے عارف تخلص اختیار کیا۔ ابتدا میں شاہ نصیر سے اصلاح لی اور بعد کو میرزا سے مشورہ کرتے رہے۔ شاہ نصیر سے تلمّذ کے زمانے میں ایک دیوان بھی انہی کے رنگ میں مرتب کر لیا تھا۔ لیکن غالب کی شاگردی کے بعد اسے نظری کر دیا اور طرزِ سخن میں میرزا کی پیروی کرنے لگے اور دوسرا دیوان "مطلع مہر سعادت" مرتب کیا۔ عارف خطِ نسخ کے بھی ماہر تھے اور اس فن میں مشہور خوشنویس میر جلال الدّین یاقوت رقم ثانی کے شاگرد تھے۔ اُستاد کی توجہ اور اپنی محنت سے ایک سال کے اندر ہی اتنی مشق بہم پہنچالی کہ استاد نے اصلاح دینا چھوڑ دی اور سند لکھ دی۔ انہی خوبیوں کے باعث میرزا کو بہت عزیز تھے۔ مگر افسوس کہ انھیں عارف کی جوانا مرگی کا داغ اٹھانا پڑا۔ اس جوانِ صالح کا جسے وہ "راحتِ روحِ ناتواں" اور "شمعِ دودماں" کہتے تھے، عین عالمِ شباب میں نکسیر سے بکثرت خون ضائع ہو جانے اور اسہال کے مرض سے اپریل ۱۸۵۲ء (جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ) میں انتقال ہوا۔ انتقال کے وقت عمر صرف ۳۶ برس کی تھی۔

۱۔ اردوئے معلّیٰ: ۱۵۱ (بنام میاں داد خان سیاح)

۲۔ نواب غلام حسین خان بیٹے تھے شرف الدولہ نواب فیض اللہ خان بہادر سہراب جنگ ابن نواب قاسم جان کے، اور قاسم جان بھائی تھے نواب عارف جان کے جن کی اولاد میں نواب احمد بخش خان اور الٰہی بخش خان معروف ہوئے۔

میرزا کو عارف کی موت کا قدرتاً سخت صدمہ ہوا۔ اسی موقع پر انھوں نے وہ مشہور پُر درد نوحہ لکھا جس کا پہلا شعر ہے:

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں، اب رہو تنہا کوئی دن اور

میرزا قربان علی بیگ خان سالک نے تین شاعروں کی جو اسی سال آگے پیچھے فوت ہوئے تھے، ایک ساتھ تاریخ لکھی:

برس دن میں موئے یہ تین شاعر | کہ جو تھے حضرتِ دہلی کے ساکن
نہ ہاتھ آئی کوئی تاریخِ رحلت | رہی فکر اس کی سالک کو بہت دن
کہا دل نے کہ داخل ہو گئے سب | ارم میں عارف و تسکین و مومن

(۱۲۶۸ = ۲۴۱ + ۳۵۱ + ۵۴۰ + ۱۳۶)

عارف کی اولاد

عارف نے دو نکاح کیے۔ پہلا، نواب شمس الدین احمد خان کی سگی ہمشیرہ نواب بیگم سے ہوا۔ نواب بیگم شادی کے دو برس بعد ستوانسا بچہ پیدا ہونے سے زچگی میں فوت ہو گئیں۔ اس کے بعد ان کا دوسرا نکاح میرزا محمد علی بیگ بخارائی کی صاحب زادی بستی بیگم عرف نواب دُلھن سے ہوا۔ نواب دُلھن کے بطن سے ان کے دو لڑکے ہوئے: باقر علی خان اور حسین علی خان۔ بستی بیگم کی وفات عارف سے تین چار ماہ پہلے دردِ گردہ سے ہوئی۔ عارف کو بیوی سے بہت محبت تھی۔ اس کی بے وقت موت کا انھیں بہت قلق ہوا اور دراصل یہی غم ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ نواب دُلھن کی وفات کے بعد دونوں بچے اپنی دادی بنیادی بیگم اور عارف کے پاس رہنے لگے تھے۔ لیکن جب ۱۸۵۲ء میں عارف کی بھی وفات ہو گئی، تو میرزا غالب چھوٹے لڑکے حسین علی خان کو اپنے گھر لے آئے، جو اس وقت صرف دو برس کے تھے۔ بڑے باقر علی خان بدستور اپنی جدّہ ماجدہ بنیادی بیگم کے پاس رہے۔ لیکن بنیادی بیگم بھی عارف کی موت کے بعد زیادہ دن زندہ نہیں رہیں، اور اس کے بعد باقر علی خان بھی میرزا کے پاس آ گئے۔

باقر علی خان

میرزا باقر علی خان اپنے والد کی وفات کے وقت پانچ برس کے تھے۔ ان کا نکاح میرزا غالب

کی زندگی ہی میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی صاحبزادی معظّم زمانی بیگم عرف بگّا بیگم سے ہو گیا تھا۔٭ شادی کے وقت میرزا باقر علی خاں سترہ برس کے تھے اور بگّا بیگم بارہ برس کی۔ اولاد میں پانچ صاحبزادیاں ہوئیں، فرزندِ نرینہ کوئی نہیں ہوا۔ سب سے بڑی صاحبزادی نواب بیگم تھیں، جو نو ماہ کی ہو کر فوت ہو گئیں۔ اس کے بعد محمد سلطان بیگم عرف جُنّدو، ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۵ء) میں پیدا ہوئیں۔ میرزا غالب انھیں لڑکے کی طرح پیار کرتے اور میرزا جیون بیگ کہہ کر پکارتے تھے۔ سبدِ چین میں ان کی ولادت کا قطعۂ تاریخ موجود ہے:

بمن ز مقدمِ فرزندِ میرزا باقر سروشِ تہنیت زبدۂ مطالب گفت
چو "قصد" شد متعلق بہ گفتنِ تاریخ طریقِ تعمیہ ورزید و "جانِ غالب" گفت
(۱۹۴)
(۱۰۸۷ = ۱۲۸۱)

اس قطعے سے ظاہر ہوتا ہے گویا یہ کسی فرزندِ نرینہ کی تاریخ ہو، لیکن دراصل یہ اسی صاحبزادی کی تاریخ ولادت ہے۔ ان کا نکاح نواب ضیاء الدّین احمد خاں کے پوتے یعنی میرزا شہاب الدّین احمد خاں کے صاحبزادے میرزا شجاع الدّین احمد خاں تاباں مرحوم سے ہوا تھا۔ ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ طویل علالت کے بعد ۹۰ برس کی عمر میں، ۲۹ مارچ ۱۹۵۴ء کو دلی میں وفات پائی اور اسی شام اپنی خاندانی ہڑواڑ (سلطان جی) میں سپردِ خاک ہوئیں۔ تیسری صاحبزادی جناب فاطمہ سلطان بیگم عرف پندو تھیں۔ ان کا نکاح نواب علائی کے صاحبزادے میرزا بشیر الدّین احمد خاں مرحوم سے ہوا تھا۔ صاحبِ اولاد تھیں۔ ۲۰ اپریل ۱۹۳۲ء کو انتقال ہوا۔

ان سے چھوٹی ایک اور صاحبزادی رابعہ بیگم تھیں، جو ڈیڑھ برس کی ہو کر فوت ہوئیں۔ سب سے چھوٹی رقیہ سلطان بیگم عرف چھٹّن تھیں۔ ان کا نکاح کرنیل زیڈ احمد (ذوالنور علی احمد) صاحب سے ہوا تھا۔ ان کا انتقال ۸۱ برس کی عمر میں بروز جمعہ ۲۲ جون ۱۹۵۶ء کو ہوا اور قطب میں دفن ہوئیں۔ ان کی اولاد بھی موجود ہے۔

میرزا باقر علی خاں اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں باقر اور

٭ بگّا بیگم نے ۳ مئی ۱۹۴۵ء کو ۹۳ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ صندل خانہ میرزا بابر، قطب صاحب میں آسودۂ خواب ہیں۔

اردو میں کامل تخلص تھا۔ غالب کے شاگرد قربان علی بیگ خان سالک سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ میرزا ابھی زندہ تھے کہ یہ بیس برس کی عمر میں مہاراجہ الور کے ہاں مصاحبوں میں ملازم ہو کر چلے گئے۔ وہاں سے ساٹھ روپیہ درماہہ پاتے تھے، مگر وفات سے دو تین برس پہلے ملازمت ترک کر کے دلی چلے آئے اور گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔ حیدر آباد سے بھی بلاوا آیا تھا۔ مگر افسوس کہ وہاں جانا نصیب نہ ہوا اور موت کا بلاوا آ گیا۔ ان کا انتقال یکم جمادی الاوّل ۱۲۹۳ھ[1] (۲۵ مئی ۱۸۷۶ء) کو تپ دق سے ہوا۔ وفات کے وقت عمر صرف ۲۸ برس اور چھ ماہ تھی۔

ان کا مدفن سلطان جی میں حضرت محبوب الٰہی کی پائینتی قاسم جانیوں کی ہڑوار میں ہے۔ لوحِ قبر پر ان کے چھوٹے بھائی حسین علی خان شاداں کی کہی ہوئی یہ تاریخ کندہ ہے:

هُوَ الغَفُور

چو زیں غم خانۂ دنیا سفر کرد
سوے باغِ جناں باقر علی خان
بسالِ رحلتش تحریر گردید
"بود مینو مکاں باقر علی خان"
(۱۲۹۳ھ)

حسین علی خان

میرزا حسین علی خان اپنے بھائی سے تین برس چھوٹے تھے؛ ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے۔ غالب انھیں بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کی ہر طرح کی لاڈ چاؤ برداشت کرتے تھے۔ حسین علی خان کا نکاح غالب کی زندگی میں نہیں ہوا، البتہ نسبت قرار پا چکی تھی۔ فخر الدولہ نواب احمد بخش خان کے ایک چھوٹے بھائی نبی بخش خان تھے، ان کے پوتے میرزا اکبر علی خان نے جرنیل سرڈیوڈ اختر لونی کی لے پالک[2] بیٹی صاحب خانم سے نکاح کر لیا تھا۔ اس نکاح کا نتیجہ

۱۔ بہ روایت بگا بیگم۔

۲۔ جنرل اختر لونی نے ایک عورت مبارک بیگم سے شادی (؟) کر لی تھی۔ میں نے پہلے لکھا تھا کہ

(باقی ص ۱۴۰ پر)

ایک لڑکی خورشید بیگم عرف حسن جہاں بیگم تھی جو میرزا حسین علی خاں سے منسوب ہوئی۔ میرزا غالب اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس شادی کے انتظام کے لیے نواب کلب علی خان خلد آشیاں سے مدد مانگ رہے تھے اور نواب خلد آشیاں نے مدد کا وعدہ فرمایا تھا، لیکن اس کے پورا ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ ادھر میرزا کی صحت روز بروز اس حد تک گرتی جا رہی تھی کہ قرضخواہوں کو اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں یہ چل ہی نہ بسیں۔ اس لیے انھوں نے اپنی رقم کی واپسی کا تقاضا شروع کیا اور تقاضا بھی شدید۔ ان کا سہارا لے دے کے ایک دربار رام پور ہی تھا۔ انھیں اس میں شرم محسوس ہوئی کہ قرض ادا کرنے کے لیے بھی مدد مانگوں اور حسین علی خان کی شادی کے لیے بھی۔ اس لیے انھوں نے درخواست کی کہ میں فی الحال حسین علی خان کا نکاح نہیں کرنا چاہتا، مجھے صرف آٹھ سو روپیہ عطا کیا جائے تاکہ میں قرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔ مگر افسوس کہ ان کی کوئی آرزو بھی پوری نہ ہوئی۔ ابھی وہ قرض بھی ادا نہیں کر پائے تھے کہ پیامِ اجل آ پہنچا۔[۱]

میرزا حسین علی خاں بھی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ غالباً شروع

(صفحہ ۱۳۹ کا بقیہ) یہ صاحب خانم ان کی بیٹی تھی تحقیق سے معلوم ہوا کہ بیٹی نہیں، گود لی ہوئی تھی۔ مبارک بیگم کی حویلی "رودگراں" کے محلے میں تھی اور اسی کی بنوائی ہوئی وہ مسجد ہے، جو دلّی میں حوض قاضی کے پاس بازار سرکی والان میں تھانے کے متصل موجود ہے۔ یہ پوری عمارت سنگِ سرخ کی بنی ہے اور اسی لیے لال مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ پیش طاق پر یہ قطعہ سنگِ مرمر کی تختی پر کندہ کیا ہوا موجود ہے:

مبارک بیگم ایں مسجد بنا کرد ۔۔۔ کہ باشد بر تراز چرخ مقوس
کم از بیت المقدس نیست شانش ۔۔۔ بگو ایں ثانیِ بیت المقدس

پہلے لوگ اس مسجد میں نماز نہیں پڑھتے تھے، لیکن اب بازار کے دکاندار وغیرہ پڑھ لیتے ہیں۔ اس مسجد کے علاوہ کابلی دروازہ (دلّی) کے باہر تین چار میل کے فاصلے پر مبارک بیگم کا ایک باغ بھی تھا، جو مبارک باغ کے نام سے مشہور تھا۔ بعض لوگ اسے اخترلونی کا باغ بھی کہتے تھے۔

[۱] مکاتیبِ غالب: ۸۳؛ (مکاتیب) نیز اس سلسلے میں دیکھیے میرا مضمون "دربار رام پور سے تعلقات" مشمولہ فسانۂ غالب۔

یں تخلص راقم تھا؛ بعد کو اردو میں شاداں اور فارسی میں خیالی کرنے لگے۔ غالب کی
وفات کے بعد وہ بزمرۂ شعراء ملازم ہو کر رام پور چلے گئے؛ وہاں پچیس روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر
ہو گیا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں ملازمت چھوڑ، واپس دلّی چلے آئے۔ بڑے بھائی کی وفات
کا انھیں بہت صدمہ ہوا تھا، اس کے بعد تندرستی متواتر خراب رہنے لگی۔ آخر ۶ ستمبر ۱۸۸۰ء
(یکم شوال ۱۲۹۶ھ) کو ان سے جا ملے۔ تاریخ ہوئی: "شادانِ فرخ نہاد" وفات کے وقت
عمر تیس برس کے قریب تھی۔

امراؤ بیگم کی وفات

میرزا کی وفات کے بعد امراؤ بیگم پر گویا غم والم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ پنشن جو انگریزی
خزانے سے ملتی تھی، وہ بند ہو گئی؛ رام پور کا وظیفہ بھی بند ہو گیا؛ بیوگی کا غم جدا۔ گزر اوقات
کے تمام ذرائع کا مسدود ہونا، اس کے علاوہ اور میرزا مرحوم کے قرضخواہوں کے تقاضوں کی
کوفت سب پر مستزاد۔ آخر انھوں نے یکم اگست ۱۸۶۹ء کو نواب خلد آشیاں کی خدمت
میں لکھا کہ آٹھ سو روپیہ میرزا مرحوم کا قرض باقی ہے، اس کی ادائی کے لیے مدد فرمائی جائے۔
جب ایک ماہ تک اس درخواست پر کوئی حکم صادر نہ ہوا تو انھوں نے ۲ ستمبر ۱۸۶۹ء کو
دوبارہ لکھا۔ اس پر ۹ ستمبر کو نواب میرزا خان داغ کو تحقیق کر کے رپورٹ کرنے کا حکم ہوا۔
آخرکار نواب خلد آشیاں نے ۳۰ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو حکم دیا کہ امراؤ بیگم کو چھ سو روپے کی
ہنڈی بھیج دی جائے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جب قرض آٹھ سو روپیہ تھا، میرزا بھی
اپنی زندگی میں اسی کی درخواست کرتے رہے، اور امراؤ بیگم نے بھی یہی رقم طلب کی تھی، تو
چھ سو کیوں بھیجے گئے۔[۲]

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں[۳]:

نواب سر امیر الدین احمد خان مرحوم فرماتے تھے کہ نواب ضیاء الدین احمد خان

۱- بہ روایت بگا بیگم

۲- مکاتیب غالب: ۵ تا ۷ (دیباچہ)

۳- غالب: ۴۲

نے قرض خواہوں سے کچھ رقم معاف کرا کے باقی رقم اپنے پاس سے ادا کردی تھی اور امراؤ بیگم کے لیے پچیس یا پچاس روپے ماہوار لوہارو سے مقرر ہو گئے، جو تا دمِ وفات انھیں باقاعدہ ملتے رہے۔

یہ کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ قرض کی رقم ہی ساری آٹھ سو روپیہ تھی، اس میں سے چھ سو تو نواب صاحب رام پور نے عطا کر ہی دیے تھے۔ اس صورت میں "قرض خواہوں سے کچھ رقم معاف کرا کے باقی" کے ادا کرنے کا سوال ہی کہاں رہا تھا! رہا لوہارو سے وظیفہ مقرر ہونا تو پچاس روپے انھیں، ۱۸۵۷ء کے زمانے سے مل ہی رہے تھے!

امراؤ بیگم نے سرکارِ انگریزی میں بھی درخواست دی تھی کہ میرزا صاحب مرحوم کی پنشن ان کے تبنیٰ[۱] میرزا حسین علی خاں کے نام منتقل کر دی جائے۔ "ڈپٹی کمشنر دہلی نے رپورٹ خاطر خواہ کی، مگر کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ متبنیٰ کی پنشن نہیں ہو سکتی ہاں زوجہ کے واسطے مبلغ دس روپیہ تجویز ہوں گے...... بشرطِ اینکہ وہ کچہری میں حاضر ہوں[۲]۔" یہ شرط بیگم صاحب نے منظور نہ کی، مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوشش اس کے بعد بھی جاری رہی۔

معظم زمانی بیگم کا بیان تھا کہ ان کی وفات عین میرزا صاحب مرحوم کی برسی والے دن (۲ ذیقعدہ ۱۲۸۶ھ مطابق ۴ فروری، ۱۸۷۰ء) ہوئی۔ فرمایا: "ہم لوگ برسی کے انتظام میں لگے تھے کہ انھوں نے دس گیارہ بجے دن کو انتقال کیا۔ پنشن کا حکم آ چکا تھا، مگر لینے کی نوبت نہیں آئی تھی"۔ غالب کے مقبرے کی شرقی دیوار کے باہر مدفون ہیں۔ اللہ بس باقی ہوس ؛

رباعی

بنگر کہ عزیزاں ہمہ در خاک شدند
در صید گہِ فنا بفتراک شدند
آخر ہمہ را خاک نشیں باید شد
گیرم کہ برفعت ہمہ افلاک شدند

۱۔ دیکھیے اوپر ص ۱۰۴۔

۲۔ مکاتیبِ غالب (دیباچہ) : ۶۔

دوسرا باب

تصنیفات

(الف) فارسی

کلیاتِ نثر

کلیاتِ نثر فارسی میں تین کتابیں ہیں: پنج آہنگ، مہر نیم روز؛ اور دستنبو۔ اکٹھی شائع ہونے سے پہلے بھی مختلف اوقات میں ان کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔

۱۔ پنج آہنگ

پنج آہنگ، پانچ حصوں پر مشتمل ہے: آہنگِ اوّل، القاب و آداب اور ان سے متعلقہ مراتب؛ آہنگِ دوم، مصادر، مصطلحات و لغاتِ فارسی؛ آہنگِ سوم، اشعارِ مکتوبی منتخب از دیوانِ غالب (فارسی)؛ آہنگِ چہارم، خطب کتب و تقاریظ و عباراتِ متفرقہ؛ آہنگِ پنجم، مکاتیب۔

میرزا علی بخش خاں پنج آہنگ کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ میں ۱۸۳۵ء میں نواب شمس الدین احمد خاں کی وفات کے بعد جے پور سے دلّی پہنچا۔ انہی ایام میں میرزا غالب کا دیوانِ فارسی موسوم بہ "میخانۂ آرزو سرانجام" مرتب ہوا تھا۔ اس میں کی نثر کو میں نے میرزا سے پڑھا، تو میرے جی میں آئی کہ یہ نثر اور ان کی دوسری متفرق فارسی تحریریں جمع کر دینا چاہییں۔ مگر مکروہات سے فرصت نہ ملی، حتیٰ کہ حکیم رضی الدین حسن خاں بہادر نے تحریک کی کہ ان اوراق کو ضرور یکجا کر دیا جائے۔ میرے ہم سبق میر محمد حسین خاں صاحب بھی میرا ہاتھ بٹانے کو تیار ہو گئے۔ میں نے خیال کیا کہ اگر یہ جمع ہو جائیں تو میرا ثر کا غلام فخر الدین خاں بھی ان سے مستفید ہو گا۔ لہٰذا میں نے اس کام پر کمر ہمت کس کے باندھ لی۔

آہنگِ اوّل و دوم و سوم کا زمانۂ تصنیف ۱۸۲۵ء ہے۔ جب اس سال انگریزوں نے

بھرت پور کے قلعے پر چڑھائی کی، تو فخر الدّولہ نواب احمد بخش خان بھی انگریزوں کی طرف سے شریکِ جنگ تھے۔ اس معرکے میں غالب اور میرزا علی بخش خان دونوں ان کے ہم رکاب تھے۔ میرزا علی بخش خان نے غالب سے کہا کہ اگر آپ تمام ایسے کلمات جمع کر دیں، جو رسمی خطوں میں "القاب و آداب اور شکر و شکوہ و شادی و غم" کے اظہار کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں، تو یہ میری رہنمائی کے لیے بہت مفید ہوگا۔ اس پر میرزا نے آہنگِ اوّل و دوم تحریر کیے۔ بعد کو آہنگِ سوم لکھا۔ اس میں اپنے دیوان سے انتخاب کر کے وہ اشعار جمع کر دیے، جو خطوط و مکتوب وغیرہ میں استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

یوں تو مختلف حیثیتوں سے پانچوں حصے ہی قابلِ قدر ہیں، لیکن آہنگِ پنجم خصوصاً بہت اہم چیز ہے، کیوں کہ اس میں میرزا کے وہ فارسی خطوط ہیں، جو انھوں نے غدر سے پہلے اپنے احباب کو لکھے تھے۔ اس سے ان کی زندگی کے اس زمانے کے حالات معلوم ہوتے ہیں، جس کے لیے ہمارے پاس اور کوئی ماخذ نہیں۔

پنج آہنگ دو مرتبہ علیحدہ چھپی۔ پہلی مرتبہ قلعے کے مطبع سلطانی میں اور دوسری دفعہ، منشی نورالدین احمد کے مطبع دار السّلام دہلی (حوض قاضی) میں[۵]۔ مطبع سلطانی دہلی والے نسخے پر تاریخِ طباعت ۴ اگست ۱۸۴۹ء (۱۳ رمضان ۱۲۶۵ھ) درج ہے۔ یہ حکیم غلام نجف خان بہادر کی تصحیح و ترتیب اور اہتمام سے شائع ہوا تھا۔ اس میں ۱۳ سطری مسطر پر متوسط تقطیع کے ۴۹۳ صفحے ہیں اور اس کی قیمت چار روپے مقرر ہوئی تھی۔

مطبع دار السّلام والا دوسرا ایڈیشن اپریل ۱۸۵۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں چھوٹی تقطیع کے ۴۴۴ صفحے ہیں۔ مسطر یکساں نہیں، ۲۰۴ صفحے تک ۱۴ سطریں ہیں اور اس کے بعد آخر تک ۱۵ سطریں۔ طبعِ اوّل سے اس میں مواد زیادہ ہے۔ پہلے تینوں آہنگ شروع سے آخر تک یکساں رہے؛ ان میں حذف و اضافہ نہیں ہوا۔ چوتھے اور پانچویں آہنگ میں البتہ متواتر اضافے ہوتے رہے۔ پہلے ایڈیشن میں چوتھے آہنگ میں سولہ نثریں اور پانچویں آہنگ میں ۱۲۶ خط تھے۔ دوسرے ایڈیشن میں اوّلاً آہنگِ چہارم میں دو نثریں زائد ہیں:

۵۔ اردوئے معلیٰ: ۲۶۹ (بنام منشی شیو نرائن)؛ خطوطِ غالب (۱): ۴۳۰

(۱) دیباچہ دیوانِ ریختہ نواب حسام الدین حیدر خان بہادر اور (۲) دیباچہ تذکرۂ موسوم بہ طلسمِ راز فراہم آوردۂ میر مہدی؛ دوم، آہنگِ پنجم میں ۲۵ خطوں کا اضافہ ہوا ہے یعنی اس کل ۱۵۱ خط ہیں۔

پنج آہنگ الگ سے صرف یہی دو مرتبہ شائع ہوئی[۱]۔

۲۔ مہرِ نیم روز

میرزا ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو خاندانِ تیموری کی تاریخ لکھنے پر مقرر ہوئے تھے[۲]۔ شروع میں ان کا ارادہ تھا، اور بہادر شاہ ظفر کا بھی یہی حکم تھا کہ صرف خاندانِ تیموری کی تاریخ یعنی صاحبقران امیر تیمور سے لے کر حکمرانِ عہد تک کے حالات قلم بند کیے جائیں[۳]۔ چناں چہ انھوں نے امیر تیمور کے حالات سے کتاب کا آغاز کیا، اور جنوری ۱۸۵۱ء تک تیمور سے لے کر ظہیر الدین بابر بادشاہ تک کی سرگذشت مکمل کر دی[۴]، اور مارچ ۱۸۵۱ء کے اواخر تک ہمایوں بادشاہ کی جلاوطنی اور واپسی تک کی داستان لکھ لی[۵]۔

لیکن کام ہمایوں کے حالات تک پہنچ کر رک گیا، اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۲ء تک یہی صورت رہی۔ ارسطو جاہ مولوی رجب علی خان نے اس کی نقل بغرضِ ملاحظہ منگوا بھیجی، تو میرزا نے مارچ ۱۸۵۲ء میں انھیں لکھا[۶]:

فرمان رفتہ است کہ جزوے از تاریخِ تاجدارانِ تمر خانیہ، بہ نظرگاہِ آں والی

۱۔ پنج آہنگ میں سے صرف آہنگِ پنجم (خطوط) کچھ مدت کے لیے سلطنتِ آصفیہ (دکن) کے امتحاناتِ علومِ شرقیہ کے نصاب میں شامل رہا ہے۔ اس لیے طلبہ کی سہولت کے لیے صرف یہ حصہ ۱۳۲۸ھ میں مطبع انوار الاسلام، حیدر آباد دکن میں چھپا تھا۔

۲۔ کلیاتِ نثر (غالب): ۱، ۲؛ نیز دیکھیے اوپر ص ۹۷ (حاشیہ ۱)

۳۔ کلیاتِ نثر (غالب): ۲، ۲

۴۔ خطوطِ غالب: ۱۰۵؛ نادراتِ غالب: ۸ (مکتوبات)

۵۔ خطوطِ غالب: ۱۰۷؛ نادراتِ غالب: ۱۱، ۱۸ (مکتوبات)

۶۔ کلیاتِ نثر (غالب): ۲۳۷

ولایت، ولائے مرتضوی نرستم۔ ذرہ پرورا، مہر گسترا، آں سوادِ جزوے چند بیش نیست۔ بعد حمد و نعت و منقبت و مدحِ والیِ عصر و سببِ تالیفِ کتاب کہ آیینِ نامہ طرازانِ ہنگامہ آراست، از کشور کشایان تا نصیر الدین سلطان ہمایون سخن راندہ ام؛ باقی داستان بہ فرداست۔[1]

اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مارچ ۱۸۵۲ء تک بھی کتاب تیمور سے ہمایون تک کے حالات سے متجاوز نہیں ہوئی تھی۔

کتاب اس مرحلے پر تھی کہ بہادر شاہ نے حکم دیا کہ تاریخ دنیا کے آغاز سے لکھی جائے، اور آیندہ کے لیے احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خان کو ان کی مدد اور مشورے کے لیے مقرر فرما دیا۔ اب تک میرزا خود ہی کتبِ تاریخ سے واقعات کا انتخاب کرتے اور انھیں فارسی میں لکھتے رہے تھے۔ اس نئے حکم کے بعد انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ واقعات کے اقتباس و انتخاب کا کام حکیم صاحب موصوف اپنے ذمّے لے لیں اور اردو مسودہ تیار کر کے میرے پاس بھیج دیا کریں، میں اسے فارسی میں منتقل کر دونگا۔ اب چوں کہ کتاب کی وہ صورت نہیں رہی، جو غالب کا مقصود تھا، تو انھوں نے اسے دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ پوری کتاب کا نام "پرتوستان" رکھا اور فیصلہ کیا کہ پہلے حصّے کا نام "مہرِ نیم روز" ہو اور اس میں "آغازِ روزگار" سے لے کر ہمایون بادشاہ کی جہاں گردی اور جہاں گیری تک کے حالات اجمال سے لکھے جائیں۔ دوسرے حصّے میں جلال الدین اکبر بادشاہ سے لے کر بادشاہِ عصر ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ کے عہد تک کے حالات نسبتاً زیادہ تفصیل سے قلمبند ہوں اور اس دوسرے حصّے کا نام "ماہِ نیم ماہ" تجویز کیا۔[2]

جب حکیم احسن اللہ خان نے "ابتدائے آفرینشِ عالم ظہورِ آدم" سے لے کر چنگیز خان تک کے حالات پر مشتمل مضمون مہیا کر دیا، تو میرزا نے اس کے شروع میں ایک نئے دیباچے کا اضافہ کیا اور اس مسوّدے کو فارسی کا جامہ پہنا دیا۔ یہ کام بھی جون ۱۸۵۲ء میں

۱۔ کلیاتِ نثر: ۲/۲؛ خطوطِ غالب: ۲۵ ؛ نادراتِ غالب: ۳۴-۳۵

۲۔ کلیاتِ نثرِ فارسی: ۲/۲-۳/۲؛ اردوئے معلّیٰ: ۱۰۶ (بنام سرور)

ختم ہو چکا تھا[1]۔

اس کے بعد حکیم احسن اللہ خان نے آج کل کرتے دس گیارہ مہینے گزار دیے اور کوئی اردو مسودہ ان کے پاس نہیں بھیجا، جس سے کام کھٹائی میں پڑا رہا۔ اب کسر صرف اتنی تھی کہ چنگیز خان سے امیر تیمور تک کے حالات لکھے جائیں، تاکہ تاریخ کا پہلا حصہ مکمل ہو جائے۔ بارے، خدا خدا کرکے "مہرِ نیم روز" اگست ۱۸۵۴ء میں ختم ہوئی۔ عیدِ قربان پر جو ستمبر میں ہوئی تھی، میرزا نے حضورِ شاہ میں قصیدے کی جگہ تاریخ کا مسودہ نذر گزارنا اور سندِ خوشنودی حاصل کی[2]۔

میں نے اب کے عید کو قصیدہ نہیں لکھا۔ ایک مجلد اوس تاریخ کا تمام کر کردہ نذر کیا۔ اوس کا حال سنیے کہ وہ صورت جو پہلے تھی، وہ نہیں رہی۔ آگے آغاز امیر تیمور کے حال سے تھا۔ اب شروع تحریر آفرینشِ عالم وظہورِ آدم سے ہے۔ میں نے کتاب کا نام "پرتوستان" رکھا اور دو مجلد پر منقسم کیا۔ پہلا مجلد ابتدائے عالم سے حضرت نصیر الدین ہمایون تک۔ اوس کا نام "مہرِ نیم روز" رکھا۔ دوسرا مجلد جلال الدین اکبر کے حال سے حضرت والیِ عصر تک، اوس کا نام "ماہِ نیم ماہ"۔ سو وہ "مہرِ نیم روز" تمام ہوا اور نذرِ حضور کیا۔ اب اگر زیست وفا کریگی، تو "ماہِ نیم ماہ" لکھا جائیگا۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو توقع تھی کہ جب تاریخ تمام ہو گی، تو بہادر شاہ اس کے انعام میں خاص قدر دانی فرمائینگے۔ کس حسرت سے لکھتے ہیں[3]:

توقیعِ خوشنودی مجھ کو مل گیا یعنی شقہ مشتمل تحسین واظہارِ عنایت پر۔ اسی کو خلعتِ فاخرہ اور جاگیر تصور کرتا ہوں۔ مجھ میں کہیں جانے کا دم نہیں؛ اگر بادشاہ کا توسل نہ ہوتا، تو گھر ہیں پڑا رہتا۔ بس میں اسی کو غنیمت جانتا ہوں۔ میرا قدر دان کون کہ میں اس پر ناز کروں۔ بقول ڈوم کے، جو سمجھے، وہ ہمارا

۱۔ خطوطِ غالب: ۱۲۵؛ نادراتِ غالب: ۳۵ (مکتوبات)

۲۔ خطوطِ غالب: ۱۴۶؛ نادراتِ غالب: ۶۳

۳۔ نادراتِ غالب: ۶۳ (مکتوبات)؛ خطوطِ غالب: ۱۴۶

غلام، جو نہ سمجھے ہم اس کے غلام:

زندگی برگردنم افتاد، بیدل! چارہ نیست چار باید زیستن، ناچار باید زیستن

منشی نبی بخش حقیر کے نام کے متعدد خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا لکھنے کے ساتھ ہی اپنے مضمون کی ایک نقل حقیر کو بھیجتے رہے تھے، بلکہ ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا پورا مسوّدہ منشی جواہر سنگھ کو بھی بھیجا گیا تھا۔ جوہر کو لکھتے ہیں:[1]

مسوّدۂ روزنامۂ رُوداد اورنگ نشینانِ چغتائیہ بدستِ ہیراسنگھ رواں داشتہ ایم و ہنوز از رسیدنش نشاں نہ یافتہ ایم۔ اگر رسیدہ است بنویسند، ورنہ از ہیراسنگھ باز پُرس کنند۔ (نوشتہ ۱۱ جون ۱۸۵۲ء)

یہ کتاب مکمل ہونے کے تھوڑے دن بعد میرزا فخرو ولی عہدِ ظفر کے حکم سے ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء–۱۸۵۵ء) میں بارِ اوّل فخر المطابع سے شائع ہوئی۔ اس کی قیمت ایک روپیہ مقرر ہوئی تھی۔ پوری کتاب ۱۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

اگرچہ میرزا نے دوسرے حصے کا نام "ماہِ نیم ماہ" تجویز کر لیا تھا، لیکن اس کے لکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہوئی کہ حکیم احسن اللہ خان بہادر سے مضمون نہ پہنچا اور مئی ۱۸۵۷ء میں ہنگامہ ہو گیا، جس میں خاندانِ تیمور کا نام و نشان ہی مٹ گیا، تاریخ کا کیا ذکر، کون لکھتا اور کس کے لیے لکھتا!

نومبر ۱۸۵۸ء میں دستنبو کا چھاپا مکمل ہو چکا، تو منشی شیونرائن نے مہرِ نیم روز کو بھی دوبارہ چھاپنے کی خواہش ظاہر کی تھی، لیکن میرزا نے انھیں لکھا کہ اب یہ کتاب چھپانے کے لائق ہے، نہ کہ چھپوانے کے[2]۔ یہ اس لیے کہا کہ یہ خاندانِ تیمور کی تاریخ تھی، اور غدر کے بعد یہ خاندان انگریزوں کا معتوب تھا۔ اگر کوئی اسے چھاپتا، تو اندیشہ تھا کہ انگریز اسے بھی شک و شبہہ کی نظر سے دیکھتے۔

۱- کلیاتِ نثر (غالب): ۲۵۰

۲- اردوئے معلّیٰ: ۲۶۸؛ خطوطِ غالب (۱): ۲۹۴

۳۔ دستنبو

دستنبو، ۱۸۵۷ء کے پُر آشوب ہنگامے کے دوران میں لکھی گئی۔ اس میں انھوں نے ٹھیٹ پارسی زبان لکھنے کی کوشش کی ہے جس میں عربی کا کوئی لفظ استعمال نہ ہو سوائے ناموں کے انھیں جوں کا توں لکھنے پر وہ مجبور تھے۔ پھر بھی بعض عربی لفظ آ گئے ہیں، مثلاً زمزمہ، صاحب، ماتم، ہوا، نواب، نادر، شکوہ، وغیرہ۔

میرزا جو کچھ لکھتے جاتے، ساتھ کے ساتھ اس کی نقل میر مہدی مجروح کو بھی بھیج دیتے۔ ممکن ہے کہ وہ ابھی اور زیادہ لکھتے، لیکن منشی امید سنگھ اندور والے ان کی ملاقات کو آئے، تو انھوں نے دستنبو کا مسوّدہ دیکھ کر اسے چھاپنے کا قصد کیا۔ اس لیے میرزا نے یکم اگست ۱۸۵۸ء کے حالات لکھ کر کتاب ختم کر دی۔ میر مہدی کو لکھتے ہیں:[1]

> صاحب ہم نے گھبرا کر اوس تحریرِ فارسی کو تمام کیا۔ دفتر بند کر دیا اور یہ لکھ دیا کہ یکم اگست ۱۸۵۸ء تک میں نے ۱۵ مہینے کا حال لکھا، در آیندہ لکھنا موقوف کیا۔ تم کو آگے اس سے لکھا تھا کہ تم اپنے اوراق کا نقرہٴ اخیر لکھ بھیجو۔ اب پھر تم کو لکھا جاتا ہے کہ جلد لکھو، تا کہ میں اوس کے آگے کی عبارت تم کو لکھ کر بھیج دوں۔

میرزا نے کتاب کا مسوّدہ چھپنے کے لیے ستمبر میں منشی ہرگوپال تفتہ کے پاس آگرے بھیج دیا۔ وہاں تفتہ کے علاوہ غالب کے دو اور مخلص دوست، منشی نبی بخش حقیر اور میرزا حاتم علی مہر بھی تھے۔ مطبعِ مفیدِ خلائق کے مالک منشی شیو نراین خود میرزا کے شاگرد اور قدر دان تھے۔ ان چاروں حضرات نے دستنبو کی اشاعت کے تمام مراحل کی نگرانی کی۔ پہلا ایڈیشن مطبعِ مفیدِ خلائق سے نومبر ۱۸۵۸ء کے پہلے ہفتے میں چھپ کر بازار میں آیا۔ اس میں صرف پانسو نسخے چھپے تھے اور فی نسخہ ۸ آنے قیمت تھی۔ کتاب کی ضخامت ۸۰ صفحے ہے اور ہر صفحے پر تیرہ سطریں ہیں۔ اس کی ترتیب یوں ہے:

سرورق کے بعد پہلے چھ صفحوں میں ملکہ وکٹوریہ کی مدح کا قصیدہ ہے:

---

[1] اردوے معلیٰ: ۱۴۱؛ خطوطِ غالب (۱): ۲۹۲

در روزگار ہا نتواند شمار یافت ۔۔۔ خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت

اور پھر نئے سرے سے صفحوں کا شمار شروع کر کے صفحہ ۷۹ پر کتاب ختم ہو گئی ہے یہیں آخر میں "تمام شد" کے بعد اردو میں یہ تنبیہ لکھی ملتی ہے: "اس کتاب کو بغیر اجازت مہتمم مفیدِ خلائق کے کوئی صاحب چھاپنے کا ارادہ نہ کریں"۔

صفحہ ۸۰ پر تاریخ کے دو قطعے ہیں، پہلا میرزا حاتم علی بیگ مہر کا اور دوسرا میرزا تفتہ کا۔

یہ پورا ایڈیشن پانچ ماہ کی مدت میں ختم ہو گیا۔ زیادہ بکری پنجاب میں ہوئی۔ میرزا منشی شیونرائن کو اپریل ۱۸۵۹ء میں لکھتے ہیں[1]:

دیکھو صاحب تم گھبراتے تھے۔ آخر یہ جنس پڑی نہ رہی اور بک گئی۔

اس کے بعد دوسرا ایڈیشن ۱۸۶۵ء میں چھپا۔ میرزا ان دنوں رام پور میں تھے۔ انھوں نے درخواست دی تھی کہ حکومت دستنبو کو اپنے خرچ پر شائع کرے۔ اس لیے حکومتِ پنجاب نے ملاحظہ کے لیے ان سے کتاب کا نسخہ طلب کیا۔[2] میرزا نے پہلے ایڈیشن کا ایک نسخہ صحیح کر کے لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ بریلی کے مطبع میں چھپنے کو بھیجا۔ بریلی میں خان بہادر قاضی عبدالجمیل جنون میرزا کے شاگرد اور عزیز موجود تھے۔ میرزا خیال ہے کہ یہ ایڈیشن انھیں کی نگرانی میں شائع ہوا ہو گا۔ اس نسخے کے خاتمے کی عبارت ہے:

الحمد للہ کہ کتاب افادت انتساب، بفرہنگ و دانش مرسوم و بدستنبو ی موسوم چکیدۂ قلم جادو رقم، نجم الدولہ، دبیر الملک، اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب عرف میرزا نوشہ[3] مد اللہ ظلال فیوضہ باہتمام

۱۔ اردوے معلیٰ ۳: ۲۷؛ خطوطِ غالب (۱): ۲۳۶

۲ دیکھو اوپر ص ۱۲۵

۳۔ لطیفہ یہ ہے کہ جن دنوں دستنبو کا پہلا ایڈیشن مطبع مفید خلائق آگرہ میں چھپ رہا تھا، چھاپے خانے کے مالک منشی شیونرائن نے میرزا کو ایک خط لکھا، جس کے لفافے پر پتے میں "میرزا نوشہ صاحب غالب" لکھ دیا۔ اس پر میرزا نے فوراً تفتہ کو لکھا کہ خدا کے لیے، کہیں "میرزا نوشہ" کے الفاظِ کتاب پر بھی نہ چھپ جائیں! اس "نالائق عرف" کو نہ کلکتے کے اعلیٰ سرکاری حلقوں میں کوئی جانتا

(باقی ۱۵۱ پر)

منشی پھندن لال صاحب در قالب طبع آمد و از نسخۂ صحیحہ مرسلۂ مصنف صاحب نقل شد و بتصحیح تمام در ۱۸۶۵ء حسن اختتام یافت۔

یہ دوسرا ایڈیشن ۱۵ سطری سطر کے ۶۱ صفحات کو محیط ہے۔ تیسرا ایڈیشن بھی اسی مطبع سے ۱۸۷۱ء میں شائع ہوا تھا۔

ان آخری دونوں ایڈیشنوں میں ترتیب بدل گئی ہے۔ پہلے ایڈیشن کے شروع کے چھ صفحوں میں مکۂ معظمہ کی مدح میں قصیدہ تھا: شمار یافت، روزگار یافت؛ اور اس کے بعد پھر صفحہ اول سے دستنبو۔ دوسرے اور تیسرے ایڈیشن میں پہلے دستنبو کی نثر اور آخر میں یہ قصیدہ ہے اور اس کے علاوہ وہ قطعہ بھی: روزگار چراغاں، اشتہار چراغاں، جو انھوں نے دلی کی فتح کے بعد چراغاں کے موقع پر اواخر اکتوبر ۱۸۵۸ء میں لکھا تھا۔[ہ]

کلیاتِ نثر کی اشاعت

جیسا کہ میرزا نے کلیاتِ نثر میں پنج آہنگ کے خاتمے میں لکھا ہے، ۱۲۸۰ھ میں منشی نول کشور صاحب دلی آئے، اور میرزا کی ملاقات کے لیے گئے۔ انھوں نے کلیاتِ نثر چھاپنے کی اجازت چاہی۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں پنج آہنگ کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۳ء میں مہرِ نیم روز ۱۸۵۴ء میں اور دستنبو طبعِ ثانی ۱۸۶۵ء میں شائع ہوئے تھے، پہلی دو کتابیں اب عام طور پر دستیاب بھی نہیں ہوتی تھیں، اس لیے میرزا نے منشی صاحب کی درخواست منظور کر لی اور تینوں کتابیں نواب ضیاء الدین احمد خان نیر رخشاں سے لے کر ان کے حوالے کر دیں۔ انھیں وہ اپنے

ہ۔ اردوے معلیٰ: ۲۸۰؛ خطوطِ غالب (۱): ۲۶۴

(صفحہ ۱۵۰ کا بقیہ) ہے، نہ ولایت میں (اردوے معلیٰ: ۸۹) لیکن ان کا یہ خیال غلط تھا، دونوں جگہ کے حاکم ان کے اس عرف سے خوب واقف تھے۔ بہر حال جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہے، انھوں نے دوسرے ایڈیشن کے آخر میں اس عرف کی موجودگی میں کوئی قباحت یا اعتراض نہیں دیکھا۔ غالباً اس لیے کہ ساتھ نام اور تخلص بھی موجود ہیں؛ یا شاید سبب ہو کہ وہ اب اسے حکام بالا کو تحفے کے طور پر نہیں بھیج رہے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ عبارت لکھتے وقت ان سے استصواب کیا ہی نہ گیا ہو۔

ساتھ لکھنؤ لے گئے، یہاں ان کے مشہور مطبع سے یہ کلیات پہلی بار جنوری ۱۸۶۸ء (رمضان ۱۲۸۴ھ) میں شائع ہوا۔

یہ ایڈیشن بڑے سائز کے ۲۱۲ صفحوں کو محیط ہے اور اس کے ہر صفحے پر ۲۹ سطریں ہیں۔
اس کلیات میں مہر نیم روز اور دستنبو کی شکل تو وہی ہے جس طرح یہ دونوں کتابیں الگ سے شائع ہوئی تھیں؛ البتہ پنج آہنگ میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کے طبع دوم میں آخری نثر (آہنگِ چہارم) میر مہدی کے تذکرۂ طلسم راز کا دیباچہ تھا۔ کلیات میں اس کے بعد تین اور نثریں ملتی ہیں۔ اسی طرح آہنگ پنجم میں بھی ۱۲ خط زیادہ ہیں۔
اس کے دو اور ایڈیشن بھی اس مطبع سے بالترتیب ۱۸۷۱ء اور ۱۸۸۴ء میں شائع ہوئے؛ ایک ایڈیشن ۱۸۷۵ء میں اسی مطبع کی کانپور والی شاخ میں بھی چھپا۔

۴۔ قاطع برہان

میرزا جب غدر کے دنوں میں دروازہ بند کرکے بیٹھ گئے۔ تو ان کے پاس دساتیر اور برہان قاطع کا ایک ایک نسخہ تھا۔ برہان قاطع مولوی محمد حسین تبریزی ثم دکنی کی لکھی ہوئی لغتِ فارسی کی مشہور کتاب ہے میرزا نے جب فرصت کے اوقات میں اس کی ورق گردانی کی، تو دیکھا کہ اس میں بیشمار غلطیاں ہیں۔ وہ کتاب کے حاشیے پر اپنے اعتراض لکھتے گئے[۱] اور بعد کو انھیں مرتب کر کے قاطع برہان کے عنوان سے لکھوالیا۔ اگرچہ کتاب ۱۸۶۰ء میں مکمل ہو چکی تھی، لیکن اس کے چھپنے کا سامان دو سال تک نہ ہو سکا۔ اس کا پہلا ایڈیشن بھی مطبع نولکشور لکھنؤ سے ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۲۳ سطری سطر کے صرف ۹۷ صفحے ہیں۔ آخر میں ایک صفحہ (۹۸) صحت نامہ کا ہے۔ بلکہ میرزا نے اس کا ایک دوسرا صحت نامہ تیار کروا کے دوستوں کو بھیجا تھا۔ اس کی قیمت ایک روپیہ فی نسخہ تھی۔ خود میرزا نے اس کی پچاس

۱۔ میرزا نے "برہان قاطع" کا یہ نسخہ جو ایام غدر میں ان کے مطالعے میں رہا تھا اور جس کے حاشیے پر انھوں نے اپنے اعتراضات لکھے تھے، بعد کو نواب علاء الدین احمد خان کو دے دیا تھا (اردوے معلیٰ: ۳۲۲) یہ بھی لوہارو کے کتابخانے کے ساتھ رضا لائبریری رام پور میں منتقل ہو گیا ہے

جلدیں خرید کر دوستوں میں تقسیم کی تھیں۔[۱]

دُرفشِ کاویانی

قاطع برہان میں مزید مطالب و اعتراضات کا اضافہ کر کے میرزا نے اسے دوسری مرتبہ دسمبر ۱۸۶۵ء میں چھپوایا، اور اس کا نام دُرفشِ کاویانی رکھا۔ قطعاتِ تاریخ اور غلط نامہ سمیت پوری کتاب میں ۱۵۴ صفحے ہیں۔ یہ ایڈیشن اکمل المطابع دہلی میں چھپا تھا اور اس کی چھپائی کے لیے میر غلام باباخان رئیسِ سورت نے انھیں مدد دی تھی۔ پہلے ایک گھڑی بھیجی[۲]، پھر نقد سو روپے[۳]۔ اس ایڈیشن میں صرف تین سو نسخے چھپے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ ان میں سے ڈیڑھ سو میر صاحب موصوف کی نذر کریں[۴]، مگر انھوں نے لکھ دیا کہ اتنے نسخے بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ یہ اطلاع ملنے سے پہلے میرزا انھیں ۲۰ نسخے بھیج چکے تھے؛ اس کے بعد پھر انھوں نے کوئی کتاب نہیں بھیجی۔[۵]

۵۔ کلّیاتِ نظمِ فارسی

جیسا کہ میرزا علی بخش خاں نے کلّیاتِ نثر فارسی کے دیباچے میں لکھا ہے، میرزا کا فارسی کلام ۱۸۳۵ء میں "میخانۂ آرزو سر انجام" کے نام سے مرتّب ہو چکا تھا۔ لیکن اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا۔ یہ نواب ضیاءالدّین احمد خاں کی تصحیح و ترتیب کے بعد مطبع دارالسّلام، دہلی میں چھپا تھا۔ اس میں پندرہ سطر کے مسطر کے ۴۰۰ صفحے ہیں اور آخر میں تین صفحے کا تتمہ ہے۔ دو میں غلط نامہ ہے، تیسرے پر نیّر رخشاں کے لکھے ہوئے تاریخ کے دو قطعے ہیں۔ اس کے خاتمے میں میں لکھا ہے کہ اس میں ۲،۶۶ شعر ہیں، لیکن یہ درست نہیں؛ شمار کرنے سے معلوم ہوا کہ اشعار کی تعداد ۶۶۹۴ ہے۔

۱۔ اردوئے معلّیٰ: ۹۲؛ نیز ص ۱۲۲؛ نیز ص ۸۰۴

۲۔ اردوئے معلّیٰ: ۹ (بنام میر غلام باباخان)؛ نیز ص ۱۶ (بنام میاں داد خاں سیّاح)

۳۔ اردوئے معلّیٰ: ۲۲ (سیّاح)

۴۔ اردوئے معلّیٰ: ۲۳ (سیّاح)

۵۔ اردوئے معلّیٰ: ۱۸ (سیّاح)

اس کے بعد جتنا کلام ہوا، وہ نواب ضیاء الدین احمد خاں اور ناظر حسین میرزا کے پاس جمع ہوتا رہا، مگر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ان صاحبوں کے گھر لٹے تو اس میں یہ بھی ضائع ہو گیا۔ ۱۸۶۲ء تک جو کچھ دوبارہ جمع ہو سکا، وہ منشی نول کشور نے نواب ضیاء الدین احمد خاں کے صاحبزادے میرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب سے منگوا لیا اور اسے اپنے مطبع میں چھاپنا شروع کر دیا۔ لیکن مصحح کی بیماری اور کاپی نویس کی غیر حاضری کے سبب چھپائی کا کام بہت آہستہ آہستہ ہوا۔ بہر حال کلیات کا یہ ایڈیشن مئی یا جون ۱۸۶۳ء میں تیار ہو کر مطبع سے باہر آیا۔

اس میں ۵۶۲ صفحے ہیں؛ ۵۵۲ تک کلام ہے، اس کے بعد میرزا کی اپنی تقریظ (تین صفحے) اور پھر متعدد تاریخیں ہیں۔ ہر صفحے میں اکیس سطریں ہیں۔ میرزا نے اپنی تقریظ میں تصریح کی ہے کہ اس میں ۱۰۴۲۴ شعر ہیں۔ یہ تعداد بھی ٹھیک نہیں؛ اس میں ۱۰۴۴۰ شعر ہیں۔

چھپنے سے قبل منشی نول کشور نے میرزا سے اقرار کیا تھا کہ آپ کو کتاب سوا تین روپے جلد کے حساب سے دی جائیگی لیکن بعد کو انھوں نے (شاید لاگت کی زیادتی کی وجہ سے) اس کی قیمت پانچ روپیہ کر دی۔ میرزا پانچ بھی ادا کرنے کو تیار تھے، لیکن منشی صاحب موصوف نے انھیں سوا تین ہی کے نرخ سے دینا منظور کر لیا اور میرزا اور نواب علاء الدین احمد خاں نے دس دس نسخے اسی قیمت پر خریدے۔

میرزا کی زندگی میں کلیاتِ نظم فارسی کے صرف یہی دو ایڈیشن شائع ہوئے۔

۶۔ سبدِ چین

۱۸۶۴ء (۱۲۸۰ھ) میں میرزا نے حکیم غلام رضا خاں صاحب کے اصرار پر انھیں مثنوی "ابرِ گہر بار" الگ سے چھاپنے کی اجازت دے دی، حال آں کہ یہ کلیات میں شامل تھی۔ یہ نسخہ میر فخر الدین کے اہتمام میں اکمل المطابع، دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس میں صرف ۴۱ صفحے ہیں؛ ۴۰ صفحوں میں متن اور غالب کی اپنی تقریظ، اور تاریخیں، اور اخیر میں ایک صفحے کا غلط نامہ۔ مثنوی کے آخر میں دو قصیدے اور دو قطعے جو کلیات کی اشاعت کے بعد کہے گئے تھے اور چند رباعیاں بھی ہیں جو کلیات میں چھپنے

۱؎ البتہ اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ دیوان کی بہ نسبت اس اشاعت میں اشعار کم ہیں۔ نہ معلوم کیوں کچھ اشعار حذف کر دیے گئے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حادثہ کاتب کے سہو کے باعث ہوا ہو۔

سے رہ گئی تھیں، شامل کر دی گئی تھیں۔ بعد کو یہ قصائد و قطعات وغیرہ کچھ دوسرے کلام کے ساتھ سبدِ چین کے عنوان سے ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ (اگست ۱۸۶۷ء) میں مطبع محمدی، دہلی سے شائع ہوئے۔ اس میں مختلف اصناف میں ۷۵۴ شعر ہے۔

یہ مختصر مجموعہ دوبارہ کہیں سے نہیں چھپا، نہ اسے کلیات ہی کے کسی ایڈیشن میں شامل کیا گیا، اس لیے نایاب ہو چکا تھا۔ میں نے اس کا دوسرا ایڈیشن مرتب کیا؛ یہ اپریل ۱۹۳۸ء میں مکتبۂ جامعہ کی طرف سے جید برقی پریس، دلی میں چھپ کر شائع ہوا۔ پہلے ایڈیشن میں ترتیبِ کلام کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا تھا، اس میں یہ نقص دور کر دیا گیا ہے۔ نیز میرزا کا بہت سا اور کلام بھی جو ادھر ادھر منتشر حالت میں پڑا تھا، اکٹھا کر کے اس میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس ایڈیشن میں ۱۴۲۸ شعر ہیں

باغِ دودر

اس کا اصلی قلمی نسخہ سید وزیر الحسن عابدی ایم اے (سابق ریڈر اورینٹل کالج لاہور) کے پاس ہے۔ یہ در اصل سبدِ چین کا بعد کا ایڈیشن ہے، جس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ کتاب دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلا حصہ شائع شدہ سبدِ چین (پہلا ایڈیشن) پر مشتمل ہے، جس میں چند نظموں کا اضافہ ہے۔ دوسرے حصے میں بعض نثریں ہیں، جو کلیاتِ نثر میں نہیں چھپی تھیں۔ اس کتاب کے کوائف سید وزیر الحسن عابدی نے اپنے ایک مضمون میں یوں بیان فرمائے تھے[۱]:۔

> میرے پاس اس مجموعے کا اصل نسخہ ہے۔ جس کی کتابت، طباعت کی غرض سے مصنف (یعنی غالب) کی زندگی میں ۱۲۸۳ھ (۶۷-۱۸۶۶ء) میں شروع ہوئی تھی اور مصنف کی وفات کے ایک سال چار مہینے بائیس دن بعد ۷ ربیع الآخر ۱۲۸۷ھ (مطابق ۷ جولائی ۱۸۷۰ء) کو ختم ہوئی۔ مگر اس مجموعے کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ "سبدِ باغِ دو در" غالب کا رکھا ہوا تاریخی نام ہے جس سے آغازِ کتابت کا سال ۱۲۸۳ھ حاصل ہوتا ہے جیسا

---

[۱] رسالہ "آج کل" (۱۵ فروری ۱۹۴۷ء) : ۷

کہ خاتمے کی عبارت میں درج ہے۔ کاتب نے یہ نسخہ غالب کے شاگرد منشی
ہیرا سنگھ کھتری کی فرمایش پر لکھا تھا۔ یہ منشی ہیرا سنگھ حوض قاضی کے قریب
گندی گلی میں رہتے تھے۔ اس نسخے میں بعض اشارات سے قیاس ہوتا ہے
کہ اس کا بیشتر حصہ غالب کی نظر سے گذرا تھا۔

"باغ دودر" میں "سبد چین" سے ۱۴۶ شعر زیادہ ہیں۔ اگرچہ یہ تمام زائد کلام مختلف رسائل، مطبوعات وغیرہ میں متفرق طور پر شائع ہو گیا تھا، لیکن ابھی تک اس کتاب کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی تھی، اس لیے وزیر الحسن عابدی صاحب نے پہلے اورنٹیل کالج میگزین، لاہور کی اگست ۱۹۶۰ء اور اگست ۱۹۶۱ء کی دو اشاعتوں میں اس کے نظم اور نثر کے حصے علی الترتیب چھپوائے، اور بعد کو انھیں الگ کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ پوری جلد میں صفحات کے نشان مسلسل نہیں۔ پہلے ۱۹۸ صفحات میں متن ہے، پھر نئے سرے سے نمبر دے کر ۴۴ صفحات کی فہارس ہیں؛ سب سے آخر میں تحقیق نامہ ہے۔ جس میں سیّد وزیر الحسن عابدی نے اوّلاً نثری خطوط کی تلخیص کی ہے۔ اس کے بعد حصۂ نظم اور منثورات پر تحقیقی حواشی قلم بند کیے ہیں۔ یہ کتاب غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر پنجاب یونیورسٹی، لاہور کی طرف سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی تھی۔

۷۔ دعاء صباح

یہ مثنوی میرزا نے اپنے بھانجے میرزا عباس بیگ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ کی فرمایش پر لکھی تھی۔ دراصل یہ منظوم ترجمہ ہے، عربی دعاء الصباح کا، جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منسوب ہے۔ یہ مثنوی میرزا کی زندگی میں نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی، لیکن مطبوعہ نسخہ کمیاب ہے۔ اس کی طرف سب سے پہلے مولانا امتیاز علی خاں عرشی ناظم کتاب خانۂ رضائیہ، رام پور نے توجہ دلائی۔ خوش قسمتی سے اس کا ایک قلمی نسخہ ان کے ہاں موجود تھا۔ انھوں نے ایک مختصر تمہید کے ساتھ اسے شائع کر دیا۵۔ اس کے بعد حسن اتفاق سے مطبوعہ نسخہ بھی مل گیا، جو غالب کی زندگی میں مطبع نول کشور سے شائع ہوا تھا۔ اس پر سالِ

---

۵ "میرزا غالب کی ایک غیر معروف فارسی مثنوی"، "نگار"، لکھنؤ (مئی ۱۹۴۱ء)

اشاعت درج نہیں[1]۔
اس میں صرف ۲۶ صفحے ہیں۔ ترتیب یہ ہے کہ سب سے پہلے جلی قلم سے عربی دعا کی نثر ہے؛ اس کے نیچے اس کا ترجمہ فارسی نثر میں دیا ہے اور پھر غالب کا فارسی منظوم ترجمہ ہے۔ فارسی نثر غالب کے قلم سے نہیں؛ یہ ترجمہ کسی اور نے کیا ہے۔ ہاں، میرزا نے اس کی نوک پلک درست کی ہو، تو یہ ممکن ہے۔ اسی نثری ترجمے کو انھوں نے نظم کر دیا ہو۔ پہلے ۲۴ صفحوں میں ۱۲۲ شعر دعاء صباح کے ہیں۔ آخری دو صفحوں میں سات شعر حضرت زین العابدین کی ایک دعاء کا ترجمہ ہیں، جس سے متعلق روایت ہے کہ دعاء صباح کے بعد اسے سجدے میں پڑھنا چاہیے۔

۸۔ متفرقاتِ غالب

جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب ایم۔اے کے پاس ایک بیاض تھی جس میں غالب کے وہ فارسی خطوط تھے، جو انھوں نے اپنے کلکتے کے بعض احباب کے نام لکھے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ نظمیں بھی تھیں؛ یہ بھی انھوں نے قیام کلکتہ کے دوران میں کہی تھیں۔ ان میں ایک اردو غزل اور سلام بھی ہے۔ موصوف نے اس بیاض کو بعض اور اضافوں کے اور ایک مقدمے اور متعدد ضمیموں کے ساتھ "متفرقاتِ غالب" کے نام سے شائع کر دیا تھا۔ اس میں ۴۹ خط ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بہت سے خط "پنج آہنگ" میں موجود ہیں لیکن وہاں کہیں کہیں سے عبارت چھوٹ گئی ہے، یا کچھ لفظی تغیر ہو گیا ہے۔ "متفرقات" میں یہ سب خط مکمل ہیں۔ مثنوی بادِ مخالف کی بھی جو غالب نے کلکتے میں کہی تھی، ایک قدیم روایت اس کتاب میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کلیات میں جو مثنوی شامل ہے اس میں کئی جگہ پر لفظی تبدیلی کر دی گئی تھی، اور بعض اشعار حذف بھی کر دیے گئے تھے۔ ۱۸۵۳ء میں غالب نے جو مثنوی بہادر شاہ ظفر کی طرف سے تشیع سے براءت کے لیے لکھی تھی، وہ بھی "متفرقات" میں شامل ہے۔

۱۔ غالب کی مثنوی دعاء صباح کا مطبوعہ نسخہ از فضل اللہ فاروقی۔ نوائے ادب (بمبئی) اپریل، ۱۹۵۰ء۔ میرے علم میں طبعِ اول کا صرف یہی ایک نسخہ ہے، جس کا اس مضمون میں ذکر ہوا ہے۔

یہ کتاب، ۱۹۴۷ء میں ہندوستان پریس، رام پور میں چھپ کر سلسلۂ مطبوعات کتاب خانۂ ریاست رام پور میں شائع ہوئی تھی۔ اشاریے سمیت اس میں ۸۶ صفحے ہیں اور یہ ٹائپ میں چھپی ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن بھی چھپا ہے۔

۹۔ مآثرِ غالب

شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن اخون زادہ احسن مرحوم (ڈھاکہ) کے پاس بھی میرزا غالب کے چند فارسی خطوط تھے، جو انھوں نے اپنے کلکتے اور ڈھاکے کے بعض دوستوں کے نام لکھے تھے۔ یہ خط میرزا کے ایک شاگرد فضل الدین حیدر عرف حیدر جان شائق جہانگیر نگری نے جمع کیے تھے اور حکیم صاحب مرحوم کو انھیں سے ملے تھے۔ جناب قاضی عبد الودود (پٹنہ) نے یہ خط حکیم صاحب مرحوم کے کتابخانے سے حاصل کیے؛ ان کے علاوہ انھوں نے میرزا کی بعض ایسی اردو اور فارسی تحریریں بھی جمع کیں، جو اگرچہ اس سے پہلے شائع ہو چکی ہیں، لیکن اب بہت مشکل سے دستیاب ہوتی ہیں۔ انھوں نے مفید حواشی کے ساتھ، ان سب چیزوں کا مجموعہ جو ۶۰ صفحوں پر مشتمل ہے، "مآثرِ غالب" کے عنوان سے ستمبر ۱۹۴۹ء میں شائع کیا۔ یہ پہلی بار علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر (۱۹۴۹ء) کے ساتھ بطور ضمیمہ چھپا تھا۔

یہ فارسی خط تعداد میں ۳۲ ہیں۔ ان میں سے تین خط اس مجموعے اور "متفرقاتِ غالب" میں مشترک ہیں۔

۱۰۔ رسالۂ فنِ بانک

غالب نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں سبدِ چین کا جدید ایڈیشن مرتب کروا کے اس کا نام "باغِ دودر" تجویز کیا تھا۔ اس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اس کے نثری حصے میں متعدد خط منشی تفضل حسین خان کے نام بھی ہیں۔ ان میں سے دوسرے خط میں لکھتے ہیں:[۵]

ایں بار طالع یار خان کہ دوستِ دیرینۂ منست، بارِ گرانے بر دوشِ من نہاد، بپارسی ترجمہ کردنِ ہندی	اس مرتبہ طالع یار خان نے کہ میرے دیرینہ دوست ہیں، ایک بارِ گراں میرے کندھوں پر رکھ دیا۔ یعنی مجھ سے کہا کہ اردو

---

۵ باغِ دودر: ۱۴۵

عبارتے راکہ برگزارشِ آئینِ پیچہائے بانک مشتمل بود، از من خواست، و سرانجام ایں خدمت را ذریعۂ خوشنودیِ خاطرِ خطیرِ حضرتِ نواب معلیٰ القاب عالی جناب دانود۔ چوں زلّہ خوارِ خوانِ جودِ آں والاجاہ بودم، وسپاس می بایست گزارد، توسنِ خامہ را دراں گزرگاہِ تنگ بجولاں آوردم و سفینۂ کہ دیباچہ و خاتمہ نیز دارد، ترتیب دادہ بہ کارفرما سپردم، و عرضداشتی براں افزودم تا روائیِ آرزوے وردِ توقیع راہانہ تواند بُود۔

کی ایک عبارت کا ترجمہ فارسی میں کردو جو فنِ بانک کے پیچوں اور گُروں پر مشتمل تھی۔ اور اشارہ کیا کہ یہ خدمت نواب معلیٰ القاب عالی جناب (والیِ ٹونک) کی خوشنودی کا باعث ہوگی۔ چونکہ میں اُس والاجاہ کے مائدۂ کرم کا زلّہ خوار ہوں اور شکر گزاری میرا فرض ہے، اس لیے میں نے اپنے توسنِ قلم کو اس تنگ وادی (یعنی ترجمے) میں چلایا، اور ایک رسالہ جس میں (میری طرف سے) دیباچہ اور خاتمہ بھی ہے، تیار کر کے ان کے سپرد کیا، اور اس پر (اپنی طرف سے) ایک درخواست کا اضافہ کر دیا، تاکہ یہ نواب صاحب کی خوشنودی کے اظہار کا ذریعہ بن سکے۔

اس سے معلوم ہوا کہ غالب نے بانک کے فن پر اس رسالے کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اپنی طرف سے اس کے شروع میں دیباچے اور آخر میں خاتمے کا اضافہ کیا۔

طالع یار خان، جن کا نام اس تحریر میں آیا ہے، غالب کے گہرے دوست تھے اور میرا خیال ہے کہ دربارِ ٹونک اور غالب کے درمیان جو تعلق قائم ہوا، اس میں بھی ان کا کسی نہ کسی پہلو سے ضرور ہاتھ رہا ہوگا۔ فارسی اور اردو خطوں میں بھی کئی جگہ ان کا ذکر آیا ہے۔ میں نے بعض احباب کے ذریعے سے ٹونک میں اس کتاب کے مسوّدے کی تلاش کی کوشش کی تھی، لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ ٹونک کا ریاستی کتابخانہ سرکاری طور پر دلّی آچکا ہے، اس میں اس کتاب کو تلاش کرنا چاہیے۔ طالع یار خان کے خاندان میں اگر بقیۃ السّیف کوئی قلمی نسخے رہ گئے ہوں، تو انھیں چاہیے کہ ان میں اس رسالے کی جستجو کریں۔ بہرحال

میرزا کی تحریروں میں اس رسالے کی دریافت سے دلچسپ اضافہ ہوگا۔

(ب) اردو

میرزا کو اپنی فارسی دانی اور فارسی شاعری پر ناز تھا اور وہ اردو کلام کو چنداں وقعت نہیں دیتے تھے۔ اسے وہ اپنے لیے باعثِ ننگ اور اپنے "نخلستانِ فرہنگ" کا "برگِ دژم" کہتے رہے۔ مگر اس میں بھی شبہہ نہیں کہ انھوں نے ابتدا اُردو ہی سے کی تھی اور آج ان کی شہرت کا ایوان، اردو دیوان ہی کی بنیادوں پر قائم ہے۔

گلِ رعنا

اردو میں اپنی "بیدلانہ طرز" وہ غالباً مولوی فضلِ حق کی روک ٹوک پر کلکتے جانے سے پہلے ہی ترک کر چکے تھے۔ یہاں کلکتے میں ان کی ملاقات مولوی سراج الدین احمد سے ہوئی؛ اور ان کی فرمایش پر انھوں نے اپنے اردو اور فارسی کلام کا انتخاب کیا۔ چوں کہ اردو دیوان ان کے سفرِ کلکتہ سے پہلے مرتب ہو چکا تھا، اس لیے اردو انتخاب ردیف وار بھی ہے، اور جن غزلوں سے یہ لیا گیا ہے، ان کی تعداد بھی زیادہ ہے یعنی ۱۱۷۔ اس کے مقابلے میں فارسی کلام کا دائرہ بہت محدود ہے۔ نہ صرف ابھی تک کوئی دیوان ہی مرتب نہیں ہوا تھا، بلکہ کلام کی مقدار بھی زیادہ نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سفر کے زمانے تک انھیں فارسی میں شعرگوئی کی طرف زیادہ توجہ ہوئی ہی نہیں۔ بات یہ ہے کہ دلّی میں اردو ہی کا زیادہ چلن تھا۔ بیشک، یہاں کے بعض اردو شاعر منہ کا ذائقہ بدلنے کو کبھی کبھار فارسی میں بھی کہہ لیا کرتے تھے، لیکن صرف فارسی گو شعرا بہت کم تھے۔ ان دو تین مستثنیات کو چھوڑ کر باقی سب کی خصوصی توجہ اردو ہی پر تھی۔ اس کے مقابلے میں مشرقی اضلاع، خصوصاً بہار اور بنگال میں ابھی فارسی کا رواج عام تھا۔ وہاں کسی شاعر کے لیے اپنا لوہا منوانے کے لیے فارسی شعرگوئی میں مہارت شرطِ اوّل تھی۔ میرزا کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس سفر کے دوران میں انھوں نے فارسی کی طرف خاص توجہ کی۔ مثنوی "چراغِ دیر" بنارس کے

قیام کا ثمرہ ہے۔
بعض قطعات پٹنے میں کہے گئے۔ کلکتے کے جن مشاعروں میں انھوں نے شرکت کی، وہاں بھی فارسی کلام پیش کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انتخاب کی ضرورت پیش آئی تو یہی کلام جو اس سفر میں جمع ہوگیا تھا، تقریباً سارے کا سارا اس میں شامل کرنا پڑا۔ گمانِ غالب ہے کہ فارسی انتخاب میں جو کلام ہے، اس کے علاوہ اور کچھ اشعار تھے بھی، تو ان کی تعداد زیادہ نہیں ہوگی۔
میرزا نے اس انتخاب کا نام "گلِ رعنا" رکھا، چونکہ اس میں دو رنگ (اردو اور فارسی) تھے۔ اس کے اوّل و آخر انھوں نے جو فارسی دیباچہ اور خاتمہ تحریر کیے تھے، بعد کو یہ ان کے کلیاتِ نثر (فارسی) میں شامل ہو گئے۔ اتفاق کی بات کہ "گلِ رعنا" کتاب ناپید ہوگئی۔ اگر یہ نثریں ان کے کلیاتِ نثر میں موجود نہ ہوتیں، تو کسی کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ انھوں نے کبھی یہ انتخاب کیا تھا۔
زمانے کے اتفاقات کہ ۱۹۵۷ء میں میرے ایک دوست نے مجھے ایک قلمی کتاب تحفۃً دی۔ غور سے دیکھنے پر کھلا کہ یہ وہی گوہرِ گم گشتہ، "گلِ رعنا" ہے۔ میں نے اسے مرتّب کرکے مئی ۱۹۷۰ء میں شائع کردیا۔ یہ نسخہ لکشمی پرنٹنگ ورکس، دلّی میں آفسیٹ سے چھپا۔ پوری کتاب میں ۲۰۶ صفحات ہیں۔
حسنِ اتفاق سے اسی اثنا میں "گلِ رعنا" کے دو قلمی نسخے لاہور میں بھی دریافت ہوئے۔ اس سے بھی بڑی خوش بختی یہ کہ ان میں سے ایک خود غالب کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ سیّد وزیر الحسن عابدی (پنجاب یونیورسٹی، لاہور) نے ان دونوں نسخوں (اور میرے مطبوعہ نسخے) کی مدد سے اسے مرتّب کیا؛ ان پر مبسوط مقدّمہ لکھا؛ آخر میں قیمتی تعلیقات کا اضافہ کیا؛ اور اسے "گلِ رعنا" ہی کے عنوان سے شائع کردیا۔ یہ نسخہ نسخ ٹائپ کے دیدہ زیب حرفوں میں مطبع عالیہ، لاہور میں چھپا ہے؛ پوری کتاب (مقدمہ، متن، تعلیقات وغیرہ) ۲۷۶ صفحات کو محیط ہے[۵]۔

---

۵ اگرچہ اس نسخے پر تاریخ "مطبعِ اوّل" دسمبر ۱۹۶۹ء چھپی ہے لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ اگرچہ اس کی طباعت بہت پہلے شروع ہو چکی تھی، یہ شائع اس تاریخ کے بہت بعد کو ہوا۔

(باقی ص ۱۶۲ پر)

۲- دیوانِ اردو (مکتوبۂ غالب)

غالب اس لحاظ سے بہت خوش قسمت ہیں کہ جتنی ان کے ہاتھ کی تحریریں دستیاب ہوئی ہیں، اتنی ان کے کسی پیشرو یا معاصر اردو ادیب کی آج تک نہیں ملی ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں ان کا جشنِ صد سالہ بڑے تزک و احتشام سے ہندستان اور بعض دوسرے ملکوں میں بھی منایا گیا۔ "گلِ رعنا" کی دریافت کا اوپر ذکر ہوا۔ اسی موقع پر ان کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا، ان کے اردو دیوان کا ایک خطی نسخہ بھی بھوپال سے ملا۔ اسے جوں کا توں اکبر علی خاں عرشی زادہ نے ستمبر ۱۹۶۹ء میں برکات آفسیٹ پریس، دلّی میں چھپوا کے شائع کیا۔ یہ نسخہ بڑے اہتمام سے شائع ہوا تھا۔ اس کی دیدہ زیبی، چھپائی کے اعلیٰ معیار اور ظاہری شکل وصورت کی دلکشی کے باعث اسے حکومتِ ہند کی طرف سے بہترین طباعت کی سند بھی عطا ہوئی تھی۔ اس کے بعد یہی دیوان ادارۂ فروغِ اردو، لاہور کی طرف سے ماہنامہ "نقوش" کی خصوصی اشاعت کی شکل میں چھپا۔ اس میں بھی اصلی خطی نسخے کا عکس ہے، اور اس کے مقابل کے صفحے پر اسی کو نستعلیق میں چھاپا ہے۔ دونوں نسخوں میں مفصّل مقدّمے اور حواشی شامل ہیں۔

اب تک کی دریافت کے مطابق یہ قدیم ترین نسخۂ دیوان ہے۔ اس کے آخر میں ترقیمہ ہے:

> بتاریخ چہاردہم رجب المرجّب یوم سہ شنبہ سنہ ہجری وقت دوپہر روز باقی ماندہ۔ فقیر بیدل اسد اللہ خان عرف میرزا نوشہ متخلص بہ اسد عفی اللہ عنہ از تحریرِ دیوانِ حسرت عنوانِ خود فراغت یافتہ بہ فکرِ کاوشِ مضامینِ دیگر رجوع بجناب میرزا علیہ الرحمۃ آورد۔

اس ترقیمے میں تاریخ اور مہینے اور دن کی صراحت ہے، لیکن سال ناقص ہے۔ اس زمانے کی جنتریوں سے یہ متعیّن ہو گیا ہے کہ ۱۴ رجب منگل کے دن، ۱۲۳۱ھ (مطابق ۱۱ جون ۱۸۱۶ء) کو پڑی تھی۔ گویا انھوں نے شمسی تقویم سے ساڑھے اٹھارہ برس کی عمر میں یہ دیوان مرتّب

(صفحہ ۱۶۱ کا بقیہ) "گلِ رعنا" کے ایک مدّت بعد میرزا نے اپنے کلام کا ایک اور انتخاب نواب کلب علی خاں والیِ رام پور کی فرمایش پر ۱۸۶۶ء میں کیا تھا۔ یہ ریاست رام پور کے کتب خانے میں محفوظ رہ گیا۔ اسے مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے ۱۹۴۲ء میں "انتخابِ غالب" کے نام سے شائع کیا تھا۔

کر لیا تھا۔

۳۔ دیوانِ غالب (نسخۂ حمیدیہ)

۱۹۲۱ء میں بھوپال کے شاہی خاندان کے ایک امیر میاں محمد فوجدار خان بہادر کے کتابخانے میں دیوانِ غالب (اردو) کا ایک قلمی نسخہ دریافت ہوا جس میں بہت سا ایسا کلام تھا جو متداول دیوان میں موجود نہیں ہے۔ ظاہر تھا کہ یہ وہ کلام ہے، جو انھوں نے دیوان کو آخری شکل دیتے وقت نظری کر دیا تھا۔ اسی نسخے کے آخر میں ترقیمہ تھا:

دیوان من تصنیف میرزا صاحب و قبلہ المتخلص بہ اسد و غالب سلّمہم ربہم علی یدِ العبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر المظفر، ۱۲۳۷ من الہجرت النبویہ صورتِ اتمام یافت۔

۵ صفر، ۱۲۳۷ھ مطابق ہے یکم نومبر ۱۸۲۱ء کے۔ یہ گویا اُس دیوان کے ساڑھے پانچ برس بعد لکھا گیا۔ (اور اسی لیے اس کی ترقی یافتہ شکل ہے)، جو خود غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اور جس کا اس سے قبل ذکر ہوا۔

اس زمانے میں اس کی دریافت سے جو سنسنی پیدا ہوئی تھی، آج اس کا اندازہ لگانا محال ہے۔ بعد کو اس نسخے کو مفتی محمد انوار الحق (ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم بھوپال) نے مرتب کر کے "دیوانِ غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے شائع کیا (بھوپال ۱۹۲۱ء)

یہاں یہ ذکر بے محل نہیں ہوگا کہ اوّلاً عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم اس نسخے کو مرتب کرنے پر مامور ہوئے تھے۔ اپنی بےوقت رحلت کے باعث وہ یہ کام مکمّل نہ کر سکے۔ البتہ انھوں نے اس کے لیے جو دیباچہ قلمبند کیا تھا، اسے بعد کو انجمن ترقی اردو نے الگ سے "محاسنِ کلامِ غالب" کے عنوان سے شائع کر دیا۔ یہ دیباچہ بھی بجنوری مرحوم کی قبل از وقت وفات کے سبب ان کی نظرِ ثانی سے محروم رہا، جتنا مسودہ ملا تھا، شائع کر دیا گیا۔

لیکن افسوس کہ اس نسخے کی ترتیب و تصحیح میں مختلف قسم کی خامیاں رہ گئیں؛ اس کی کتابت پر بھی پوری توجہ نہیں دی گئی، جس سے یہ بطور مرجع غلطی کے امکان سے خالی نہ رہا۔[۵]

۵۔ اس سلسلے میں دیکھیے، گلِ رعنا (مرتبہ مالک رام) ص ۲۹ (مقدمہ)

اس کی اغلاط کی تصحیح بہت حد تک اوّلاً مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے مرتبہ دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی) سے ہوئی (علی گڑھ ۱۹۵۸ء) - رہی سہی کسر پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم (سابق وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور) نے اپنے مرتبہ نسخۂ حمیدیہ کے ذریعے پوری کر دی (لاہور، جولائی ۱۹۶۹ء) - انھوں نے ۱۹۳۸ء میں اصلی خطی نسخے کا غائر مطالعہ کر کے اس سے مفصل یادداشتیں لے لی تھیں؛ اب انھیں کو مرتب کر کے یہ دیوان چھاپ دیا، چوں کہ اصلی خطی نسخہ بہت دن سے گم ہو چکا ہے، اور اس سے استفادہ ممکن نہیں رہا، اس لیے ان دونوں حضرات کی مساعی بیحد قابلِ قدر ہیں ؂۔

اسی نسخۂ حمیدیہ پر مبنی وہ نسخہ ہے، جو علمی دنیا میں نسخۂ شیرانی کے نام سے معروف ہے اور اب پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے کتابخانے کے ذخیرۂ شیرانی میں محفوظ ہے۔ یہ بھی فوٹو آفسیٹ کے ذریعے سے چھاپ دیا گیا ہے (لاہور، اگست ۱۸۶۹ء)

اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جہاں نسخۂ حمیدیہ کے بارے میں پورے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کبھی خود میرزا کے پاس رہا تھا، وہیں نسخۂ شیرانی سے متعلق ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ غالب نے اسے دیکھا تھا۔ اس میں کم از کم ایک درجن مقامات پر غالب کے قلم سے اصلاحیں ملتی ہیں اور ایک جگہ حاشیے پر ایک پوری غزل ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی موجود ہے۔ افسوس کہ یہ نسخہ ناقص ہے؛ اس کے درمیان سے کچھ ورق ساقط ہو گئے ہیں اور چوں کہ آخر میں کوئی ترقیمہ نہیں ہے اس لیے ممکن ہے کہ یہاں سے بھی کچھ حصہ ضائع ہو گیا ہو۔

۴۔ دیوانِ اردو (متداول)

ان کے ایک خط سے گمان ہوتا ہے کہ کلکتے کے زمانۂ قیام میں انھوں نے صرف "گلِ رعنا" ہی مرتب نہیں کی تھی، بلکہ غالباً اردو کلام کا مفصل انتخاب بھی کیا تھا۔ دلّی سے حکیم احسن اللہ خاں

؂ - یہاں ایک تنبیہ کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا عبدالباری آسی الدنی مرحوم نے کسی زمانے میں کچھ کلام غالب کے نام سے شائع کیا تھا۔ بعد کو انھوں نے اس کی ایک شرح "مکمل شرحِ کلامِ غالب" کے عنوان سے شائع کی تھی۔ (لکھنؤ ۱۹۳۱) اس تمام کلام کا غالب سے کوئی تعلق نہیں ہے؛ یہ آسی نے خود کہہ کر غالب سے منسوب کر دیا تھا۔

نے ان سے فرمایش کی کہ آپ نے اس زمانے میں جو فارسی نثریں لکھی ہوں، وہ بھیج دیجیے، تو ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا کہ میں نے آج تک اپنی منتشر نثریں جمع کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ آخر اس دردسری سے حاصل! ہمارے پیشروؤں کو اس سے کیا ملا کہ مجھے اس کی آرزو ہوتی؛ لکھتے ہیں:

> انصاف بالاے طاعت است؛ بدعوی گاہے کہ توانائیِ تنیل را بفرد میدگیِ فرہنگ مسلّم داشتہ ولواے نور العین را تف بشیوائیِ شیوہ برافراشتہ باشند؛ باکہ باید گفت کہ نتائج طبع ما کجائی است، و مارا چہ لذت ہ دریں جگر خائی ست۔
>
> سطرے چند بدیباچگیِ دیوانِ ریختہ کسوتِ حرف و رقم پوشیدہ، و درد بودلے کہ بہ آرائشِ سفینہ موسوم بہ "گلِ رعنا" از سویدا جوشیدہ است، ارمغان فرستم واز شرمِ تنگ مایگی آب می گردم۔

اس سے معلوم ہوا کہ کلکتے میں انھوں نے اپنے دیوانِ اردو کے لیے دیباچہ ضرور لکھا تھا۔ مرتبہ دیوان ان کے پاس موجود ہی تھا، جس سے انھوں نے "گلِ رعنا" کے اردو کے حصّے کے لیے انتخاب کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس زمانے میں شاید انھوں نے صرف اردو کلام کا ایک مفصّل انتخاب مرتب کیا ہو، جو متداول دیوان کی اولین یا ابتدائی شکل کہی جا سکتی ہے، اور اس کے لیے علیحدہ دیباچہ بھی لکھا۔ یہی انتخاب بعد کو دوسرے کلام کے اضافے کے ساتھ پہلی مرتبہ شعبان ۱۲۵۷ھ (اکتوبر ۱۸۴۱ء) میں چھپ کر شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن سر سیّد احمد خان مرحوم کے بھائی سیّد محمد خان بہادر کے قائم کردہ "مطبع سیّد الاخبار" میں چھپا تھا۔ یہ نسخہ پندرہ سطری مسطر کے ۱۰۸ صفحات کو محیط ہے اور اس میں ۱۰۹۵ شعر ہیں۔ اس کے شروع میں غالب کا اپنا فارسی دیباچہ اور آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خان کی تقریظ ہے، جو انھوں نے ۱۲۵۴ھ میں لکھی تھی؛ اس میں شعروں کی تعداد ۱۰۷۰ بتائی گئی ہے۔ اس تقریظ سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں؛ اوّل یہ کہ دیوان ۱۲۵۴ھ میں مرتب ہو چکا تھا اور دوسری یہ

۵۔ کلیاتِ نثر (فارسی): ۱۱۰، یہی خط حالی نے بھی نقل کیا ہے۔ دیکھیے یادگارِ غالب: ۲۱۱-۲۱۲

کہ اس وقت اس میں ۱۰۷۰ شعر تھے۔ گویا جب دیوان تین برس بعد ۱۲۵۷ھ میں شائع ہوا، تو اس میں صرف ۲۵ شعروں کا اضافہ ہوا۔

اس ایڈیشن کے نسخے بہت کمیاب ہیں۔ ایک کرم خوردہ نسخہ منشی مہیش پرشاد مرحوم کے پاس تھا۔ خدا معلوم، اب کہاں ہے۔ خان بہادر سید ابو محمد مرحوم کا نسخہ آزاد لائبریری، علی گڑھ میں آگیا ہے۔ ایک مکمل نسخہ صولت پبلک لائبریری، رام پور میں اور دوسرا جامعۂ ملیۂ اسلامیہ (دلی) کے کتاب خانے میں ہے۔

دیوانِ اردو کا دوسرا ایڈیشن جمادی الاوّل ۱۲۶۳ھ (مئی ۱۸۴۷ء) میں منشی نورالدین احمد لکھنوی کے مطبع دارالسلام، حوض قاضی، دہلی میں چھپا۔ اس کے شروع اور آخر میں بھی بالترتیب میرزا کا دیباچہ اور نیرّ رخشاں کی تقریظ ہے۔ اس میں ۹۸ صفحے اور ۱۱۱۱ شعر ہیں۔

مئی ۱۸۵۷ء میں غدر سے شاید دو ہی چار دن پہلے میرزا نے دیوان کا ایک نسخہ خوشخط لکھوا کر نواب یوسف علی خان فردوس مکاں کی خدمت میں بھیجا تھا[1]۔ جب وہ جنوری ۱۸۶۰ء میں رام پور گئے، تو نواب ضیاء الدین احمد خان نے ان سے کہا کہ رام پور والے نسخے کی ایک نقل مجھے بھیج دیجیے گا کیونکہ ان کا اپنا نسخہ غدر میں ضائع ہو گیا تھا۔ رام پور ہی میں میرزا کو میرٹھ کے ایک شخص عظیم الدین احمد کا خط ملا کہ میں آپ کا اردو دیوان چھاپنا چاہتا ہوں، مجھے اجازت دی جائے۔ چوں کہ میرزا اس شخص کو جانتے نہیں تھے، اس لیے انھوں نے اسے کوئی جواب نہ دیا مگر واپسی پر جب وہ میرٹھ میں نواب محمد مصطفٰی خان شیفتہ کے ہاں ٹھہرے، تو انھوں نے عظیم الدین احمد کی سفارش کی اور کاپیاں دیکھنے کی خدمت اپنے ذمّہ لی۔ اس پر میرزا نے دلّی پہنچ کر نواب ضیاء الدّین احمد خان سے قلمی دیوان لے کر میرٹھ بھیج دیا۔ تھوڑے دن بعد منشی شیو نرائن مالک مطبع مفید خلائق، آگرہ نے انھیں لکھا کہ آپ نے گھر کا مطبع چھوڑ کر دیوان میرٹھ کیوں بھیجا ہے؟ تو انھوں نے اسے بہ اصرار عظیم الدّین احمد سے واپس منگوا کر شیو نرائن کے پاس آگرے بھیج دیا[2]۔ دیوان ابھی آگرے میں چھپنا شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ معلوم نہیں کیوں،

۱۔ مکاتیب غالب: ۳۱-۳۲ (دیباچہ)

۲۔ اردوئے معلّٰی: ۲۸۲؛ خطوطِ غالب (۱): ۳۴۳-۳۴۴

انھوں نے مطبع احمدی واقع شاہدرہ، دہلی کے مالک محمد حسین خان تحسین کو اس کے چھاپنے کی اجازت دے دی۔ مگر یہ ایڈیشن اتنا غلط چھپا کہ میرزا نے خود ایک نسخے کی نظرِ ثانی و تصحیح کر کے اسے مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خان مذکور کو دیا جنھوں نے اسے محمد عبدالرحمٰن خان مہتمم مطبع نظامی کانپور کے حوالے کر دیا۔ مطبع احمدی والے نسخے پر تاریخ ۲۰ محرم الحرام ۱۲۷۸ھ (۲۹ جولائی ۱۸۶۱ء) درج ہے اور مطبع نظامی والے میں ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ (جون ۱۸۶۲ء)۔ گویا اس ایک برس میں دیوان کے دو ایڈیشن چھپے۔

مطبع احمدی والے نسخے میں ۸۸ صفحے اور ۱۷۹۶ شعر ہیں۔ اس کے مقابلے میں مطبع نظامی کانپور کے نسخے میں ۱۰۴ صفحے ہیں اور شعر ۱۸۰۲۔

اس دوران میں منشی شیو نرائن بھی دیوان کا چھاپا شروع کر چکے تھے۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ دیوان دلّی اور کانپور دو جگہ سے شائع ہو گیا ہے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سرِ دست چھاپا ملتوی کر دیا اور آخر کار اسے اگلے برس ۱۸۶۳ء میں پورا کر کے شائع کیا۔ وہ غالباً دیوان کے ساتھ میرزا کی تصویر بھی چھاپنا چاہتے تھے۔ چناں چہ غالب نے اپنی تصویر بھی ان کی نذر کی تھی۔ مگر ان کے شائع کردہ دیوان کے ساتھ تصویر نہیں چھپی ہے۔ اس ایڈیشن میں ۱۷۹۵ شعر ہیں اور ۱۴۶ صفحے۔

غالب کی زندگی میں ان کے علاوہ اور کوئی ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔

۵۔ عودِ ہندی

میرزا ایک مدّت تک اپنے خطوط فارسی زبان میں لکھتے رہے، لیکن ۱۸۴۷ء کے وسط میں، بلکہ عین ممکن ہے کہ اس سے بھی کچھ پہلے، انھوں نے عام طور پر فارسی میں خط لکھنا بہت کم کر دیا اور اس کے بعد خاص حالات کے سوائے آخر تک وہ اردو ہی میں لکھا کیے۔

میرزا کے اردو خطوط جمع کرنے کا خیال سب سے پہلے ممتاز علی خان میرٹھی کو ہوا۔ انھوں نے مارہرہ کے چودھری عبدالغفور سرور سے کہا کہ آپ وہ خطوط عنایت فرمائیں، جو آپ کے پاس ہیں۔ سرور نے نہ صرف اپنے خط ہی دیے، بلکہ وہ بھی جو صاحبِ عالم اور شاہ عالم صاحبان کے نام

---

۷ دیکھیے عبارتِ خاتمہ نسخہ مطبوعہ مطبع نظامی کانپور

آئے تھے ۔ ان ۳۱ خطوں پر ایک دیباچہ لکھا، جس میں تاریخ کا قطعہ ہے:

انشا مملو بصد مطالب لکھی یعنی پئے دوستانِ طالب لکھی
موسوم کیا جو مہرِ غالب سے سرور! تاریخ بھی اس کی "مہرِ غالب" لکھی[۱]
(۱۸۶۲)

اور یہ سارا مجموعہ جناب ممتاز علی خان کے حوالے کر دیا ۔ بعد کو ممتاز علی خان کو خیال آیا کہ اگر کوشش اور تلاش کی جائے، تو بعض دیگر حضرات سے بھی خط بہم پہنچ سکتے ہیں ۔ چناں چہ انھوں نے سرور والے مجموعے کی اشاعت ملتوی کر دی اور خواجہ غلام غوث خاں بےخبر کی مدد اور وساطت سے مزید ۱۲۷ خط جمع کیے ۔ ان خطوں کے علاوہ انھوں نے چند تقریظیں اور نثریں بھی حاصل کیں ۔ ان سب کا مجموعہ "عودِ ہندی" کے نام سے اوّل بار مطبع مجتبائی، میرٹھ سے ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ (۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء) کو (یعنی میرزا کی وفات سے تقریباً چار مہینے پہلے) شائع ہوا، اگرچہ تمام مسودہ ۱۸۶۶ء میں مکمل ہو کر مطبع میں دیا جا چکا تھا۔[۲]

یہ نسخہ ۱۸۸ صفحوں پر چھپا ہے ۔ اس کے شروع میں منشی ممتاز علی خان کا دیباچہ اور آخر میں حکیم غلام مولا صاحب قلق میرٹھی کی تقریظ اور مختلف اصحاب کے چار تاریخی قطعے ہیں ۔ اس کی قیمت ایک روپیہ فی نسخہ تھی۔

۶ - اُردوئے مُعلّٰی[۱]

عودِ ہندی کی ترتیب ۱۸۶۱ء میں شروع ہوئی تھی ۔ مگر خطوں کے جمع کرنے کا کام اتنا آہستہ آہستہ ہوا کہ اس کے چھپنے میں بہت دیر لگ گئی ۔ دوستوں کی طرف سے تقاضا شروع ہوا،

۱- "ادبی خطوطِ غالب" کے فاضل مؤلف میرزا محمد عسکری مرحوم کو اس تاریخ سے یہ شبہہ ہوا کہ "عودِ ہندی" سب سے پہلے ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئی (صفحہ ۷) حال آنکہ در تمام قرائن کو چھوڑ کر نامۂ غالب کی اس میں شمولیت ہی ان کے اس خیال کی تردید کے لیے کافی تھی، کیوں کہ یہ خط ۱۸۶۵ء میں لکھا گیا تھا ۔ انھیں اردوئے معلّٰی سے متعلق بھی غلط فہمی ہوئی؛ انھوں نے لکھا ہے کہ یہ کتاب میرزا کی زندگی میں شائع ہو چکی تھی ۔ (صفحہ ۹)

۲- اس ایڈیشن کی مفصّل کیفیت کے لیے دیکھیے، رسالہ "ہندستانی" الٰہ آباد (اکتوبر ۱۹۳۵ء) مضمون "عودِ ہندی کی ترتیب" از مہیش پرشاد ۔

تو میرزا نے غلام غوث خان بیخبر کو لکھا کہ آپ کے پاس جتنے خط ہیں، ان کی نقل مجھے بھیج دیں۔ لکھتے ہیں:[۱]

اجی حضرت! یہ منشی ممتاز علی خان کیا کر رہے ہیں! رقعے جمع کیے اور نہ چھپوائے۔ فی الحال پنجاب احاطہ میں ان کی بڑی خواہش ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ آپ کو کہاں ملینگے، جو آپ ان سے کہیں۔ مگر یہ تو حضرت کے اختیار میں ہے کہ جتنے میرے خطوط آپ کو پہنچے ہیں، وہ سب یا ان سب کی نقل بطریق پارسل آپ مجھ کو بھیج دیں۔ جی یوں چاہتا ہے کہ اس خط کا جواب، وہی پارسل ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ جب منشی ممتاز علی خان کی طرف سے خطوط کی اشاعت میں غیر معمولی دیر ہوئی، تو میرزا نے خیال کیا کہ انھوں نے چھاپنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ ادھر ان کے شاگرد منشی جواہر سنگھ ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ انھوں نے بیکاری کے ایام کا یہ مشغلہ اختیار کیا کہ اکمل المطابع کے مہتمم میر فخر الدین اور منشی بہاری لال مشتاق کی مدد سے خطوط جمع کرنا شروع کیے، تاکہ انھیں اس مطبع میں چھاپا جائے۔ انھوں نے میرزا سے بھی مدد مانگی۔ چنانچہ اسی سلسلے میں میرزا نواب علاؤ الدین احمد خان کو اپریل یا مئی ۱۸۶۲ء میں لکھتے ہیں:[۲]

مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع اکمل المطابع میں چند اصحاب میرے مسودات اردو کے جمع کرنے پر اور اون کے چھپوانے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگے ہیں اور اطراف و جوانب سے بھی فراہم کیے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا وہ جہاں بھیجنا ہوا، وہاں بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمھارے پاس بہت ہونگے۔ اگر ان کا ایک پارسل بنا کر بیبیل ڈاک بھیج دو گے، یا آج کل میں کوئی آنے والا ہو، اوس کو دے دو گے، تو موجب میری خوشی کا ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ میرزا نے خود بھی دوستوں سے رقعات جمع کر کے مرتب کے پاس بھیجے تھے۔ بعض اور خطوں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ گویا وہی کام جو پانچ برس پہلے انھوں نے منشی شیو نرائن

۱- عود ہندی: ۱۲۹

۲- اردوئے معلیٰ: ۲۹۴ (بنام نواب علائی)؛ خطوط غالب (۱): ۳۹۶

کے کہنے پر نہیں کیا تھا اور یہ کہہ کر ٹال دیا تھا:[5]

اردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا، ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اُس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر، کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپا میرے خلافِ طبع ہے۔

اب خود سرگرمی سے اس میں حصّہ لینے لگے تھے۔ یہ مجموعہ ۶ مارچ ۱۸۶۹ء (۲۱ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ) کو اردوے معلّیٰ کے نام سے چھپا۔ افسوس کہ میرزا کو اس کی شکل دیکھنا نصیب نہ ہوئی؛ وہ اس سے انیس دن پہلے فروری میں وفات پا چکے تھے۔ میرزا قربان علی بیگ خان سالک نے تاریخ کہی:

کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا	لب پہ نالوں کا اژدحام ہوا
صدمۂ مرگِ حضرتِ غالب	سببِ رنجِ خاص و عام ہوا
ہے یہی سالِ طبع و سالِ وفات	"آج اون کا سخن تمام ہوا"

(۱۲۸۵)

یہ اردوے معلّیٰ کا پہلا حصّہ تھا۔ اس میں ۴۴۶ صفحے ہیں، جن میں تین صفحے کا غلط نامہ بھی شامل ہے۔ اسی مطبع سے یہ حصّہ دوبارہ یکم رجب ۱۳۰۸ھ (۱۱ فروری ۱۸۹۱ء) کو شائع ہوا۔

حصّۂ دوم ابھی تک نہیں چھپا تھا۔ آخرکار اپریل ۱۸۹۹ء میں مولانا حالی کی فرمائش پر مولوی محمد عبدالاحد نے اپنے مطبع مجتبائی، دہلی میں پہلی دفعہ دونوں حصّے یک جا چھاپے۔ دوسرا حصّہ مولانا حالی ہی نے مرتّب کیا تھا۔ انھوں نے اس میں جگہ جگہ ضروری حاشیوں کا بھی اضافہ کیا ہے۔ یہ حصّہ ۵۶ صفحوں کو محیط تھا۔

۱۹۲۲ء میں شیخ مبارک علی تاجر کتب، لاہور نے ایک ایڈیشن کریمی پریس لاہور میں چھاپ کر شائع کیا۔ اس میں پہلے دو حصّوں کے علاوہ آخر میں ایک ضمیمہ بھی ہے۔ خود ناشر نے حصّۂ دوم کے آغاز میں دو خطوں کا اضافہ کیا، جو میرزا نے سجاد میرزا مرحوم (خلف ناظر حسین میرزا) کے نام لکھے تھے اور انھیں مکتوب الیہ کے خاندان (آغا محمد طاہر مرحوم)

۵۔ اردوے معلّیٰ: ۲۶۸ (بنام شیو نرائن) نیز: ۷۶ (بنام تفتہ)؛ خطوطِ غالب (۱): ۲۹۴ نیز ۵۸-۵۹

سے دستیاب ہوئے تھے۔ یہ ضمیمہ مسٹر شیر محمد سرخوش نے مرتب کیا تھا۔ انھوں نے اس کا دیباچہ بھی لکھا۔ اس ضمیمے میں ۲۳ خط ہیں۔ لیکن واقع یہ ہے کہ یہ سب خط ہر قدر بلگرامی (۲۲) اور لطیف احمد بلگرامی (۱) کے نام ہیں، اس سے پہلے اردوے معلّیٰ (علی گڑھ) کے دسمبر ۱۹۰۷ء کے شمارے میں مولوی علی اصغر بلگرامی نے شائع کیے تھے۔ سرخوش صاحب نے وہیں سے نشاندہی کیے بغیر نقل کر لیے ہیں۔

۷۔ مکاتیبِ غالب

میرزا کی دربارِ رام پور سے بارہ برس تک خط و کتابت رہی: جنوری ۱۸۵۷ء سے مارچ ۱۸۶۵ء تک نواب فردوس مکان کے ساتھ، اور اس کے بعد اپنی موت تک نواب خلدِ آشیاں کے ساتھ۔ خوش قسمتی سے ان میں سے اکثر خطوط ریاست رام پور کے دارالانشاء میں محفوظ تھے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی ناظمِ کتاب خانۂ رام پور نے انھیں "مکاتیبِ غالب" کے عنوان سے مرتب کر کے پہلی مرتبہ ۱۹۳۷ء میں شائع کیا۔ اس پہلے ایڈیشن میں کل ۱۱۵ خطوط تھے، ۱۰۷ دونوں والیانِ ریاست کے نام اور ۸ رام پور کے بعض اور حضرات کے نام۔ ان پر مرتب نے ایک مبسوط دیباچہ لکھا؛ آخر میں سیر حاصل حواشی بڑھائے؛ نیز جگہ جگہ حاشیے میں ان خطوط کی نقل دی؛ جو ریاست کی طرف سے میرزا کے خطوں کے جواب میں بھیجے گئے تھے، جس سے کتاب اور بھی مفید ہو گئی۔ اس کے بعد بھی اس مجموعے کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور خطوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ مؤلف نے اس میں حواشی بھی بڑھائے اور دیباچے کو بھی مفصّل کر دیا۔ یہ ساتویں بار ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۱۳۰ مکتوبات شامل ہیں، ۱۱۷ دونوں نواب صاحبان کے نام اور ۱۳ بعض دوسرے اصحاب رام پور کے نام۔ اس کے بعد چند اور خط بھی دستیاب ہوئے ہیں۔

۸۔ نادراتِ غالب

غالب نے جو خط منشی نبی بخش حقیر اکبر آبادی کے نام لکھے تھے، وہ میر مہدی مجروح اور میر افضل علی عرف میرن صاحب نے جمع کیے تھے۔ خوش قسمتی سے یہ مجموعہ دستبُردِ زمانہ سے

محفوظ رہ گیا۔ میرن صاحب کے نواسے جناب آفاق حسین آفاق دہلوی نے بسوط دیباچے اور حواشی کے ساتھ اسے "نادراتِ غالب" کے نام سے "ادارۂ نادرات، کراچی" کی طرف سے شائع کر دیا ہے۔ (۱۹۴۹ء) ۔ اس میں ۱۷۱ خط حقیر کے نام ہیں[1]، اور دو ان کے صاحبزادے منشی عبداللطیف کے نام۔ ان میں سے ایک خط حقیر کے نام کا اور ایک خط منشی عبداللطیف کے نام کا، اس سے پہلے اردوے معلیٰ میں چھپ چکے ہیں۔ حقیر کے ۱۷ خطوں میں، ۷ اردو کے ہیں، اور ایک فارسی کا۔
"یادگارِ غالب" دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مولانا حالی نے یہ کتاب لکھی ہے، تو یہ مجموعہ ان کے مدِنظر تھا۔

۹- غالب کی نادر تحریریں

پچھلے تیس چالیس برس میں غالب کے متعدد خط اور متفرق تحریریں مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئی ہیں۔ یہی تمام چیزیں ڈاکٹر خلیق انجم نے جمع کر کے اس عنوان سے یکجا شائع کرادی ہیں۔ (فروری، ۱۹۶۱ء) انھوں نے شروع میں ایک دیباچہ لکھا اور آخر میں حواشی کا بھی اضافہ کیا ہے۔ کتاب اغلاط سے مبرا نہیں، لیکن یہ ایک مفید کام ہوا ہے۔
ابھی خطوط کی خاصی تعداد غیر مطبوعہ ہے[2]۔ منشی مہیش پرشاد مرحوم کے پاس معقول ذخیرہ تھا۔ انھوں نے تمام خطوط کو اہتمام سے مرتب کر کے چھاپنا شروع کیا تھا اور خطوطِ غالب کی پہلی جلد ۱۹۴۱ء میں ہندستانی اکیڈمی، الہ آباد کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنے مجموعے میں

---

[1] یہاں اگرچہ حقیر کے نام ۲۰ خط ہیں، لیکن ایک خط (نمبر ۴) دراصل منشی شیو نرائن کے نام کا ہے اور غلطی سے حقیر کے نام سے چھپ گیا ہے؛ یہ غلطی روزِ اوّل سے چلی آرہی ہے۔ اردوے معلیٰ (ص ۲۰۳) میں بھی یہ حقیر ہی کے نام سے چھپا ہے۔

[2] ۱۹۳۹ء میں ایک مختصر مجموعہ "نادر خطوطِ غالب" کے نام سے سید محمد اسمٰعیل رسا گیاوی مرحوم نے شائع کیا تھا، لیکن میں ثابت کر چکا ہوں کہ مرتب نے مطبوعہ خطوں کے ٹکڑے اِدھر اُدھر سے جمع کر کے یہ خط تیار کر لیے ہیں، ورنہ میرزا نے کبھی یہ ان کے پردادا کرامت ہمدانی مرحوم کے نام نہیں لکھے تھے (دیکھیے میرا مضمون "نادر خطوطِ غالب مرتبہ رسا ہمدانی پر ایک نظر" جامعہ، دہلی: مارچ ۱۹۴۲ء) اسی سلسلے میں ملاحظہ ہو "نادر خطوطِ غالب (تبصرہ)" از قاضی عبدالودود، معیار، پٹنہ (جنوری، ۱۹۴۳ء)

تمام وہ خطوط، جو اردوے معلّیٰ اور عودِ ہندی اور مکاتیبِ غالب میں شائع ہو چکے ہیں، یا اور بھی جن تک ان کی دسترس ہو سکی، شامل کر لیے تھے۔ اس کی دوسری جلد شائع نہیں ہوئی تھی کہ ۱۹۵۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ کی فرمائش پر میں نے اس جلد کو از سرِ نو مرتب کیا تھا پہلی مرتبہ ترتیب کی جو غلطیاں رہ گئی تھیں، انھیں رفع کیا۔ میرے اپنے مجموعے میں کچھ غیر مطبوعہ خط تھے، وہ مناسب جگہ پر درج کیے۔ نادراتِ غالب کے خط چوں کہ اسی جلد سے متعلق تھے، اس لیے انھیں بھی شاملِ کتاب کیا اور یہ جلد ۱۹۶۲ء میں دوبارہ شائع ہوئی۔

دوسری جلد آج تک شائع نہیں ہوئی، اور افسوس کہ بوجوہ اب اس کی کوئی توقع بھی نہیں رہی۔

۱۰۔ نکاتِ غالب و رقعاتِ غالب

جس زمانے میں میجر فُلر پنجاب کے محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے، انھوں نے علومِ مشرقیہ کی ترقی کے لیے بہت کوشش کی تھی۔ کئی حضرات کو اپنے پاس لاہور بلوایا اور ان سے کتابیں لکھوائیں۔ جو نہیں آسکتے تھے، ان سے فرمائش کر کے کتابیں تصنیف کرائیں۔ جو لوگ ان کی دعوت پر لاہور پہنچے، ان میں رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب بھی تھے۔ موصوف نے میجر فُلر کے حسب الحکم میرزا سے طلبہ کے لیے فارسی زبان کی صرف کے قواعد لکھنے کی درخواست کی۔ اس پر میرزا نے دو مختصر رسالے مرتّب کیے: نکاتِ غالب میں یہ قواعد ہیں، جو اردو زبان میں لکھے گئے ہیں۔ اس میں ۲۰ صفحے ہیں؛ رقعاتِ غالب میں ان کے ۱۵ فارسی خط ہیں، جو انھوں نے پنج آہنگ کے آہنگِ پنجم سے انتخاب کیے ہیں۔ اس میں صرف ۱۶ صفحے ہیں گویا دونوں چیزیں ۳۶ صفحوں کو محیط ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن جس میں صرف پانسو نسخے تھے، فروری ۱۸۶۷ء میں محمد سعادت علی خاں کے مطبع سراجی، دہلی سے شائع ہوا۔

۱۱۔ قادر نامہ

میرزا نے عارف کے دونوں بچوں، باقر علی خاں اور حسین علی خاں کی تعلیم کے لیے آٹھ صفحے کا ایک مختصر منظوم رسالہ قادر نامہ تصنیف کیا تھا[۵]۔ اس میں خالقِ باری اور آمد نامہ کے

۵۔ اردو (۱۹۳۶ء)، ۵۰-۷ (مضمون "میرن صاحب" از مولوی عبدالحق)

باقی ص ۱۷۴ پر

طرز پر اردو فارسی کے ہم معنی الفاظ ہیں چونکہ پہلا شعر لفظ قادر سے شروع ہوتا ہے، اس لیے اس کا نام قادر نامہ رکھا گیا ہے۔ شعر اوّل ہے:

قادر، اللہ اور یزداں ہے خدا ہے نبی، مرسل، پیمبر، رہنما

کل اشعار کی تعداد ۱۳۰ ہے؛ اس میں بارہ شعر دو غزلوں کے بھی شامل ہیں، جو قادر نامہ ہی کا حصّہ ہیں۔ آخر میں ۴ شعر کا ایک قطعہ ہے۔

قادر نامہ کا پہلا ایڈیشن مطبع سلطانی (قلعہ)، دہلی سے ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۶ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن چھپے ہیں پہلے ایڈیشن ہی کو دوبارہ بڑے اہتمام سے مرتب کر کے مکتبۂ نیا راہی کراچی سے شائع کیا گیا ہے۔ (۱۹۵۹ء) قادر نامہ کا ایک ایڈیشن ۱۸۶۴ء میں محبس پریس دہلی میں بھی چھپا تھا۔ اس کا ایک نسخہ کتاب خانۂ رضائیہ رام پور میں موجود ہے۔ اس کے آخر میں گیارہ فارسی قطعے ہیں، جن کا نام "اسمائے فارسی" رکھا گیا ہے۔ یہ میرزا غالب کا نہیں بلکہ مُلّا جامی کا کلام ہے۔[1]

۱۴۔ انتخابِ غالب

۴۸ صفحے کی یہ مختصر کتاب[2] دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّے میں دو دیباچے اور ۱۲ خط اردو نقلیں اور ایک لطیفہ ہے۔ دوسرے حصّے میں دیوان اردو میں سے ۲۱۰ شعر انتخاب کر کے درج کیے ہیں۔ شروع اور آخر میں غالب ہی کی لکھی ہوئی دو مختصر نثریں ہیں[3]، جو خاص اسی مجموعے کے لیے لکھی گئی تھیں۔

(صفحہ ۱۷۳ کا بقیہ) مولانا غلام رسول مہر کو اس رسالے کے غالب کی تصنیف ہونے میں کلام تھا۔ (غالب: ۳۸۳) میں اندرونی اور بیرونی شہادتوں کی بنیاد پر ثابت کر چکا ہوں کہ یہ غالب ہی کا لکھا ہوا ہے۔ (دیکھیے، میرا مضمون: "قادر نامہ کا مصنف" سطور اردو جولائی، ۱۹۴۸ء)

۱۔ مکاتیب غالب: ۳۶ (دیباچہ)

۲۔ اس کا اصلی قلمی نسخہ جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب (الٰہ آباد) کے پاس تھا۔ اسی کا ذکر مرقعاتِ غالب کے نام سے خطوطِ غالب (۱) کے دیباچہ میں آیا ہے (ص، ک)

۳۔ یہ دونوں نثریں علی گڑھ میگزین (غالب نمبر) میں چھپ چکی ہیں (ص ۹۸-۱۰۱)

دونوں دیباچے اردوے معلیٰ میں موجود ہیں۔ پہلا میرزا رجب علی بیگ سرور کی کتاب "گلزارِ سرور" کا ہے، اور دوسرا خواجہ بدر الدّین خان (خواجہ امان) کی حدائق الانظار کا، خطوط سب کے سب میر مہدی مجروح کے نام ہیں۔ ان میں صرف ایک خط نیا ہے[1]؛ ایک نقل سے غدر کے زمانے میں، غالب کے حالات سے متعلق کچھ نئی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

اس مختصر مجموعے کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اسے خود غالب نے مرتب کیا تھا اور یہ عودِ ہندی اور اردوے معلیٰ دونوں سے پہلے ۱۸۶۶ء میں شائع ہوگیا تھا۔ ہوا یہ کہ ڈاکٹر مولوی ضیاء الدین خان (پروفیسر عربی، دلی کالج) انگریز افسروں اور فوجیوں کو اردو پڑھانے کے لیے ایک انشا مرتب کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے میرزا سے مدد کے لیے کہا، تو میرزا نے یہ خطوط وغیرہ جمع کر دیے۔ جانے مولوی صاحب موصوف نے ان سے کیا کہا، لیکن میرزا کا گمان یہ تھا کہ یہ مجموعہ فنانشل کمشنر پنجاب، میکلوڈ صاحب کے پیش ہونے والا ہے۔ اسی لیے وہ دیباچے میں لکھتے ہیں کہ یہ کتاب میکلوڈ صاحب کی نذر ہے اور اسے شائع کیا جائے۔ مولوی صاحب نے اس کے خطوط معمولی ردّ و بدل کے بعد اپنی مرتبہ انشاے اردو (حصّہ دوم) میں شامل کر لیے تھے، جو ۱۸۶۶ء میں مطبع فیض احمدی میں چھپی تھی۔

غالب نے جو نسخہ مولوی ضیاء الدّین خان کے لیے لکھوایا اور انھیں دیا تھا، یہ ان کے کتابخانے سے دستیاب ہوا اور عارضی طور پر محمد عبد الرزّاق راشد صاحب (حیدر آباد) کے ہاتھ آگیا۔ انھوں نے اسے مرتّب کر کے پہلی مرتبہ چشتیہ پریس، حیدر آباد میں چھپوا کر ۱۹۲۶ء (۱۳۴۵ھ) میں شائع کرا دیا[2]۔ اس کا دوسرا ایڈیشن دین محمدی پریس، لاہور میں ۱۹۴۳ء میں چھپا تھا۔

ج۔ قاطع برہان کا معرکہ

۱۔ اب یہ خطوطِ غالب (۱) میں شامل ہے: خط نمبر ۳۹ (ص ۳۴۴)

۲۔ کتابی صورت میں چھپنے سے پہلے یہ مجموعہ حیدر آباد (دکن) کے ماہانہ رسالے "تحفہ" میں بھی بالاقساط چھپا تھا۔ (اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۲۶ء)

محرقِ قاطع اور اس کے جواب

میرزا نے جب ۱۸۶۲ء میں کتاب "قاطع برہان" شائع کی تو ہندستان کے فارسی دانوں کے حلقے میں گویا بھونچال آگیا۔ بقول غالب "معتقدانِ برہان قاطع برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے"۔ سب سے پہلے اس کے جواب میں سید سعادت علی کی کتاب "محرقِ قاطع برہان" چھپی[1]۔ اس کے جواب میں تین رسالے لکھے گئے۔ اول 'دافعِ ہذیان' فارسی میں، اس کے مصنف مولوی نجف علی خان تھے[2]؛ دوم 'لطائفِ غیبی'، جس کے مصنف میاں داد خاں سیاح کہے جاتے ہیں[3]؛ اور سوم سوالات عبدالکریم[4]۔ آخری دونوں اردو میں ہیں۔

۱۔ محرقِ قاطع برہان ۹۶ صفحہ کی کتاب فارسی زبان میں ہے۔ یہ ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۴ء) میں مولوی امّو جان کے مطبع احمدی، دلہائی، شاہدرہ میں چھپی تھی۔ اس کے مصنف سید سعادت علی صاحب پہلے ریذیڈنٹ راجپوتانہ کے دفتر میں میر منشی تھے اور پنشن لینے کے بعد دلّی میں مقیم ہو گئے تھے اس کے علاوہ انھوں نے ایک اور کتاب "حدائق العجائب" بھی لکھی تھی۔

۲۔ 'دافع ہذیان' (فارسی) ۲۸ صفحے کا مختصر رسالہ ہے۔ یہ ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۵ء) میں اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوا۔ اس کے مصنف سید محمد نجف علی خان جھجر کے رہنے والے اور وہاں کے مشہور قاضی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد کا نام سید محمد عظیم الدین تھا۔ مولوی نجف علی خان عربی اور فارسی کے فاضل تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ خستہ اور ملہمی دو تخلص تھے۔ نظم و نثر کی متعدد کتابیں ان سے یادگار ہیں۔ دماغ میں کچھ سنک تھی۔ ۱۲۹۰ھ میں فوت ہوئے۔ ٹونک کے قبرستان موتی باغ (حضۂ عوام) میں مدفون ہیں۔

۳۔ 'لطائفِ غیبی' (اردو) ۴۱ صفحے کا رسالہ ہے۔ اس کے مصنف میاں داد خاں سیاح کہے جاتے ہیں مگر یہ میرزا کی اپنی تصنیف ہے۔ اس سے متعلق تفصیل سے آگے لکھا گیا ہے۔ یہ بھی ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) میں اکمل المطابع دہلی میں چھپا تھا۔ اس کی قیمت ۸ر فی نسخہ تھی۔

۴۔ سوالاتِ عبدالکریم' (اردو) یہ آٹھ صفحے کا مختصر رسالہ بھی غالباً اکمل المطابع دہلی سے ۱۲۸۱ھ میں چھپا تھا۔ اس میں کل سولہ سوال ہیں اور آخری صفحے پر دس سوالوں کا استفتاء ہے۔ میرے خیال میں یہ رسالہ بھی غالب کا لکھا ہوا ہے، یا کم از کم اس کی تصنیف میں ان کا بہت زیادہ ہاتھ ہے۔ (اس سے متعلق دیکھیے میرا مضمون "آجکل: فروری ۱۹۵۳ء میں)

ساطع برہان

قاطع برہان کے جواب میں دوسری کتاب "ساطع برہان" لکھی گئی[1]۔ اس کے مصنف میرزا رحیم بیگ رحیم میرٹھی تھے۔ رحیم اچھے فاضل شخص تھے۔ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ میرٹھ میں مکتب پڑھاتے تھے۔ آخر عمر میں ان کی بینائی جاتی رہی تھی۔

۱۳- نامۂ غالب (اردو)

"ساطع برہان" کے جواب میں میرزا نے خود ۱۶ صفحے کا ایک خط "نامۂ غالب" کے نام سے لکھا، اور اپنے خرچ پر اس کے تین سو نسخے چھپوا کر دور نزدیک دوستوں میں تقسیم کر دیئے[2]۔ یہ سب سے پہلے ۱۸۶۵ء میں مطبع محمدی (محمد میرزا خان) دہلی میں چھپا۔ میرزا نے اس کے جو نسخے نواب خلد آشیاں کو رام پور بھیجے تھے، ان کی اطلاع انھیں ۱۳ اگست ۱۸۶۵ء کے خط میں دی تھی[3]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "نامۂ غالب" اگست ۱۸۶۵ء میں چھپا تھا۔ اس کے بعد یہ اسی سال اودھ اخبار کی دو اشاعتوں (۱۰ اکتوبر اور ۱۷ اکتوبر) میں بھی چھپا[4]۔ اب یہ عودِ ہندی میں شامل ہے۔

قاطع القاطع و مؤیدِ برہان

قاطعِ برہان کے جواب میں دو کتابیں اور لکھی گئیں، ایک قاطع القاطع[5]۔ جس کے مصنف امین الدین امین دہلوی تھے۔ یہ پٹیالہ میں مدرس تھے۔ دراصل قاطع برہان کے جواب میں سب سے پہلے یہی کتاب لکھی گئی؛ یہ ۱۲۸۱ھ میں مکمل ہو گئی تھی، جیسا کہ اس کی تاریخِ ترتیب (فراغ) سے معلوم ہوتا ہے۔ مؤلف محرقِ قاطع برہان نے بھی اس کتاب کا ذکر اپنے ہاں کیا ہے (ص ۶۴) جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قاطع القاطع اس سے پہلے لکھی جا چکی تھی۔ اور سید سعادت علی نے اس کا مسودہ دیکھا تھا؛ البتہ یہ ۱۲۸۳ھ میں چھپی۔ دوسری کتاب

۱- ساطع برہان (فارسی) ۱۴۴ صفحات کی کتاب ہے۔ یہ ۱۲۸۲ھ میں مطبع ہاشمی میرٹھ سے شائع ہوئی تھی۔

۲- اردوئے معلیٰ: ۱۹-۲۰ (بنام میاں داد خان سیاح)

۳- مکاتیب غالب: ۱۴۱ (مکاتیب)

۴- رسالہ ہندستانی (الہ آباد) ۱۹۳۴ء: ۱۰۶

۵- قاطع القاطع (فارسی) یہ کتاب ۱۲۸۳ھ میں مطبع مصطفائی، دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں ۲۴۰ صفحے ہیں۔

مؤیدِ برہان[1] تھی۔ اس کے مصنف آغا احمد علی احمد تھے۔ مولوی احمد علی کمپنی کے مدرسۂ عالیہ، کلکتہ میں فارسی کے مدرس تھے۔ ان کے اجداد اصفہانی الاصل تھے، لیکن ایک زمانے سے نقل مکان کر کے ہندستان چلے آئے تھے۔ خود ان کا مولد ڈھاکہ (جہانگیر نگر) تھا، اسی لیے وہ جہانگیر نگری کہلاتے تھے۔ میرزا نے ان کی کتاب دیکھنے سے پہلے[2] ۳۱ شعر کا ایک قطعہ فارسی[3] زبان میں لکھ کر انھیں بھیجا، جس کا پہلا شعر ہے:

مولوی احمد علی احمد تخلّص نسخہ
در خصوصِ گفتگوے پارسی انشا کردہ است

۱۴۔ تیغِ تیز (اردو)

کتاب دیکھنے کے بعد میرزا نے ۳۲ صفحے کا ایک مختصر رسالہ اردو میں لکھا اور اس کا نام تیغِ تیز رکھا۔ اس کے اخیر میں بغیر شمار کے بغیر ایک صفحہ (۳۳) غلط نامہ کا اضافہ کیا ہے۔ اس میں سترہ فصلیں ہیں، پہلی سولہ فصلوں میں ایک ایک اعتراض مولوی احمد علی صاحب پر کیا ہے اور اسی ساتھ ان کے اعتراض کا جواب بھی دیا ہے۔ آخری فصل میں برہانِ قاطع پر مزید اعتراضات ہیں۔ اخیر میں سولہ ادبی سوالات کا استفتا ہے۔ ان کے جواب نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ نے دیے اور مولانا حالی، مولوی محمد سعادت علی خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں تینوں حضرات کی ان جوابات سے متعلق تصدیق و تائید ہے۔ یہ رسالہ اوّل بار مطبع اکمل المطابع سے، ۱۸۶۷ء میں شائع ہوا تھا؛ اس کے بعد دوبارہ نہیں چھپا۔

ہنگامۂ دلِ آشوب (حصہ اوّل)

۱۔ مؤید برہان (فارسی)۔ یہ اس سلسلے کی سب سے مبسوط اور وقیع کتاب ہے۔ ٹائپ میں، بمطبع مظہر العجائب، کلکتہ میں چھپی تھی۔ ۴۰۸ صفحات کو محیط ہے۔ آخر میں ۷ صفحے کا غلط نامہ ہے۔ ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۶ء) میں شائع ہوئی۔

۲۔ اردوے معلیٰ: ۳۳ (بنام ذکا)

۳۔ یہ قطعہ سبد چین میں شامل ہے (ص ۴۹ - ۵۱) پہلے یہ الگ بھی اکمل المطابع، دہلی میں ۱۲۸۲ھ میں چھپا تھا۔ اس کا سائز ½۴ × ۱۲″ (۱۱ × ½۶″) ہے اور یہ ایک رُخا چھپا ہے۔

میرزا کے مذکرہ صدر قطعے کے جواب میں مولوی احمد علی نے خود ایک قطعہ لکھا[1] اور اپنے ایک شاگرد مولوی عبدالصمد فدا سلہٹی[2] کے نام سے شائع کر دیا۔ اس کا آغاز یوں ہے:

فرقِ حق و باطل، اے صاحب نظر! بشنو زمن
گر ترا جویائے حق ایزد تعالیٰ کردہ است

اس کے جواب میں میرزا غالب کے دو شاگرد میدان میں اترے۔ سید محمد باقر علی باقر آروی اور خواجہ سید فخر الدین حسین سخن۔ ان دونوں کے قطعے بھی اسی زمین میں ہیں۔ ان چاروں قطعوں کا سولہ صفحات پر مشتمل مجموعہ منشی سنت پرشاد کے مطبع واقعہ آرہ (ضلع شاہ آباد) میں ۵ ذی الحجہ ۱۲۸۳ھ (۱۱ اپریل ۱۸۶۷ء) کو چھپا اور "ہنگامۂ دل آشوب" اس کا نام ہوا۔

تیغ تیز تر

اس پر عبدالصمد فدا[1] (یا دوبارہ مولوی احمد علی صاحب) نے باقر اور سخن کے دونوں قطعوں کا جواب لکھا اور پہلے چاروں کے ساتھ اس پانچویں قطعہ کو ملا کر اس مجموعے کا نام "تیغ تیز تر" رکھا۔ یہ رسالہ ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں غلام نبی خان کے مطبع نبوی سے شائع ہوا۔

ہنگامۂ دل آشوب (حصہ دوم)

اس کے بعد منشی جواہر سنگھ جوہر لکھنوی (شاگرد ناطق مکرانی) نے ایک قطعہ لکھا جس سے آغا احمد علی کی حمایت اور میرزا کی مخالفت مقصود تھی، اگرچہ ان دونوں باتوں کا اظہار کھلے بندوں نہیں کیا۔ اس پر باقر اور سخن نے جوہر اور فدا دونوں کے قطعوں کا ایک ایک جواب لکھا۔ اسی دوران میں میر آغا علی شمس لکھنوی نے اودھ اخبار (۲۵ جون ۱۸۶۷ء) میں ایک

۱۔ "ہنگامۂ دل آشوب" میں اس قطعے کا عنوان ہے " دومیں قطعہ کہ مولوی احمد علی صاحب بجواب قطعۂ حضرتِ غالب نگاشتہ از نام عبدالصمد فدا شاگردِ خود شہرت داد۔"

۲۔ اس قطعہ کا نواں شعر ہے:

من کیم؟ عبدالصمد، در شعر نامِ من فدا
شہر سلہٹ مولدم ایزد تعالیٰ کردہ است

مضمون لکھا، جس میں میرزا کے بعض اشعار پر اعتراض کیے تھے[1]۔ اس کا جواب سخن نے اردو نثر میں اور باقر نے فارسی نثر میں لکھا۔ باقر نے اپنے مضمون کے اخیر میں قتیل کے کلام پر بعض اعتراضات کا اضافہ کیا۔ ایک صاحب منشی محمد امیر امیر لکھنوی نے غالب کی حمایت میں اردو قطعہ لکھ کر اودھ اخبار میں چھپوایا۔ ان پانچوں قطعوں اور دونوں نثری مضامین کا مجموعہ منشی سنت پرشاد کے مطبع ہی سے "ہنگامۂ دل آشوب" حصۂ دوم کے نام سے ۲۵۔ جمادی الاوّل ۱۲۸۴ھ (۲۵ دسمبر ۱۸۶۷ء) کو شائع ہوا[2]۔ اس دوسرے حصے کا حجم ۶۲ صفحے ہے۔

اس شعری مناقشے کی دلچسپ بات یہ ہے کہ منشی محمد امیر صاحب کے قطعے کے علاوہ جو اردو میں ہے، باقی تمام قطعات فارسی میں اور اسی ایک زمین میں لکھے گئے تھے: انشا کردہ است، تقاضا کردہ است۔

شمشیرِ تیز تر

لیکن یہ سب شاعری ہی شاعری تھی، میرزا غالب نے جو نئے اعتراض "قاطع برہان" کی طبع ثانی "درفشِ کاویانی" میں اضافہ کیے تھے یا "تیغِ تیز" میں لکھے تھے، ان کا جواب ابھی

۱۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی دو رنڈیوں قمرن جان مشتری (عرف بی منجھو) اور امراؤ جان زہرہ (عرف بی چھٹن) نے بھی اس معرکے میں حصّہ لیا تھا۔ یہ دونوں اچھی خاصی تعلیم یافتہ اور نذکور الصدر آغا علی شمس کی شاگرد تھیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شمس نے خود اعتراض لکھ کر ان دونوں کے نام سے شائع کر دیے تھے۔ پنڈت کشن لال طالب دہلوی نے ان دونوں سے متعلق بہت سے قطعے لکھے تھے۔ ان میں ایک شعر تھا:

شعرائے شمس، زہرہ، مشتری ہے بڑی تو خیر ہے، چھوٹی کھری ہے

(خم خانۂ جاوید ۵: ۳۶)

۲۔ حصّۂ دوم کے سرورق پر اس کی تعدادِ اشاعت ۱۵۰، اور قیمت ۲ لکھی ہے پہلا حصّہ بھی غالباً تھوڑی تعداد ہی میں چھپا ہوگا۔ ہنگامۂ دل آشوب کے یہ دونوں حصّے مکمل رسالہ اردو کی اشاعت جنوری ۱۹۲۷ء میں بھی چھپ چکے ہیں۔

تک نہیں ہوا تھا۔ مولوی احمد علی صاحب نے ان اعتراضات کے جواب فارسی میں لکھے اور "شمشیرِ تیز تر" کے تاریخی نام (۱۸۶۷) سے شائع کیے۔ اس کے آغاز میں تیغِ تیز تر، کے پانچوں قطعے بھی شامل ہیں، جو کتاب کے پہلے پندرہ صفحوں کو محیط ہیں۔ ان کے بعد نئے نمبر سے اصلی کتاب شروع ہوتی ہے۔ آخر میں دو صفحوں (۱۰۵، ۱۰۶) پر تین قطعاتِ تاریخ ہیں۔ گویا پورا رسالہ ۱۲۲ صفحوں پر مشتمل ہے۔ یہ مطبع نبوی (مولوی غلام نبی خان) میں چھپا تھا۔ اس پر تاریخِ طباعت ۱۸۶۸ء درج ہے، لیکن دوسرا قطعۂ تاریخ امداد علی مضطر کا ہے "ترکی دادہ جواب ترکی" جس سے ۱۲۸۶ برآمد ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ کتاب میرزا کی زندگی میں چھپنا شروع ہو گئی تھی، لیکن ابھی اس کی طباعت مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ۱۲۸۵ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

شمشیرِ تیز تر اس سلسلے کی آخری تحریر ہے۔ اگر میرزا زندہ رہتے، تو ممکن ہے کہ یہ بحث چندے اور جاری رہتی۔ گویا قاطع برہان کی اشاعت سے جو ہنگامہ ۱۸۶۲ء میں شروع ہوا تھا، وہ شمشیرِ تیز تر کے ساتھ ۱۸۶۹ء میں ختم ہوا۔

مقدمۂ ازالۂ حیثیت عرفی

قاطع برہان کے مخالفوں نے جتنی کتابیں لکھی تھیں، ان میں سے صرف "قاطع القاطع" کا جواب نہیں لکھا گیا تھا۔ یہ کتاب ایسی فحش اور لوچ زبان میں ہے کہ میرزا کا ارادہ نہیں تھا کہ اس پر توجہ بھی کریں۔ چناں چہ کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت آپ نے اس کا جواب نہیں لکھا، تو کہا کہ اگر کوئی گدھا تمھارے لات مارے، تو کیا تم بھی اس کے لات مارو گے۔[1]

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو یہ ارادہ بدل گیا۔ اور انھوں نے ۲۰ دسمبر ۱۸۶۷ء کو ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا۔[2] سب سے پہلے انھوں نے دلّی کے ڈپٹی کمشنر ادبرائن صاحب کی خدمت

۱۔ یادگارِ غالب: ۶۰۔ "سوالات عبدالکریم" میں یہی لطیفہ "محرقِ قاطع برہان" سے متعلق بیان ہوا ہے (ص ۷)

۲۔ اس مقدمے کی روداد پہلے اردو، اپریل ۱۹۴۳ء میں چھپی اور وہاں سے احوالِ غالب میں نقل ہوئی (ص ۱۳۹-۱۷۱) دونوں جگہ متن میں بہت غلطیاں چھپ گئی ہیں۔

میں درخواست دی کہ میں خاندانی رئیس اور سرکارِ انگریزی کا منصب دار ہوں۔ مجھے دربار اور خلعت کے اعزاز حاصل ہیں۔ امین الدّین دہلوی نے جو پٹیالے میں ریاست کے مدرسے میں معلم ہے، ایک کتاب ' قاطع القاطع ' میں میرے متعلق ایسے ناشائستہ الفاظ لکھے ہیں اور ایسی گالیاں دی ہیں، جن سے میری ہتک عزّت ہوتی ہے۔ مہربانی فرماکر اس امر کی تحقیق کی جائے اور جرم ثابت ہونے پر " مدّعا علیہ کو سزائے سخت ملے، تاکہ پھر کوئی چھوٹا آدمی بڑے آدمی کو ایسے کلماتِ فحش و ناسزا نہ لکھے "۔

ڈپٹی کمشنر نے یہ درخواست اسسٹنٹ کمشنر سٹاک ڈن کے پاس بھیج دی، جو فوجداری مقدّموں کی سماعت کرتے تھے۔ میرزا نے اپنی طرف سے منشی عزیز الدین وکیل سرشتہ کو مقدّمے کی پیروی کے لیے مختار مقرّر کیا۔ وکیل نے ' قاطع القاطع ' کی نو ایسی عبارتیں پیش کیں، جو بنائے دعویٰ تھیں۔ تھوڑے دن بعد سٹاک ڈن صاحب تبدیل ہو گئے۔ اب مقدّمہ ڈپٹی کمشنر مذکور کی عدالت میں پیش ہوا۔ اور براتن صاحب نے مولوی امین الدّین کے نام سمن جاری کیے اور مدّعی اور مدّعا علیہ دونوں کو گواہ پیش کرنے کا حکم دیا۔ میرزا نے مندرجۂ ذیل اصحاب کے نام داخل کیے:

۱۔ مولوی سعادت علی خاں، مدرّسِ دلّی کالج، دلّی
۲۔ ماسٹر پیارے لال، سکریٹری لٹریری سوسائٹی، دلّی
۳۔ لطیف حسین، مدرّسِ اول کالجیٹ اسکول، دلّی
۴۔ نصیر الدین، مدرّسِ فارسی و ریاضیات نارمل اسکول، دلّی
۵۔ حکم چند مضمون نگار

ان میں سے کوئی صاحب بھی ۳۶ برس سے زیادہ عمر کے نہیں تھے۔ ان کے مقابلے میں مولوی امین الدّین نے مندرجۂ ذیل فہرست داخل کی:

۱۔ مولوی ضیاء الدّین، اسسٹنٹ پروفیسر عربی، دلی کالج، دلّی
۲۔ مولوی سدید الدین، سابق پروفیسر عربی، دلی کالج، دلی
۳۔ حکیم حشمت اللہ خاں

۴۔ سید حمید اللہ

۵۔ مولوی ابراہیم

۶۔ مولوی محمد حسین

۷۔ مولوی قمر الدّین

مدّعا علیہ کے گواہوں میں پہلے دونوں صاحب سن رسیدہ اور علمی دنیا میں مشہور و معروف بزرگ تھے۔ ان کے مقابلے میں میرزا کے گواہوں میں کوئی شخص ان کے پایے کا نہیں تھا۔

حال آں کہ جو عبارتیں میرزا کی طرف سے پیش کی گئی تھیں، ان سے متعلق کسی قسم کا شبہہ نہیں تھا لیکن مدّعا علیہ کے گواہوں نے اسے بچانے کے لیے ان کی طرح طرح کی تاویلیں کیں، اور ان لفظوں کے ایسے ایسے دُور از کار معنی بیان کیے کہ حیرت ہوتی ہے کہ عدالت نے انھیں کیسے تسلیم کر لیا۔ لیکن وہ بیچارہ انگریز اور معنی بیان کرنے والے مستند اور مشہور عالم۔ اسے کیا معلوم کہ حیلوں میں یہ مولوی شیطان کے بھی استاد ہیں۔ غرض میرزا کو یقین ہو گیا کہ اس عدالت سے انصاف کی امید بیسود ہے۔ ادھر "چند گرامی رؤسائے شہر" نے میرزا پر دباؤ ڈالا۔ آخر ان کے بیچ بچاؤ سے میرزا نے مقدمے سے دست بردار ہونا منظور کر لیا اور ۲۲ مارچ ۱۸۶۸ء کو راضی نامہ داخل کر دیا۔

مولانا حالی لکھتے ہیں[۵]:

> ان مولویوں کا (جو مولوی امین الدّین کی طرف سے بطور گواہ پیش ہوئے تھے) میرزا سے ملنا جلنا تھا۔ کسی نے پوچھا حضرت! انھوں نے آپ کے برخلاف شہادت کیوں دی۔ میرزا نے اپنا فارسی کا یہ شعر پڑھا:
>
> ہر آنکہ ورزگری جز بجنسِ مائل نیست   عیارِ بے کسیِ من شرافتِ نسبی ست

۵۔ یادگارِ غالب (حالی): ۶۲

د۔ لطائفِ غیبی کا مصنّف

۱۵۔ لطائفِ غیبی

یہ کتاب ۱۸۶۵ء میں سیّد سعادت علی کی "محرقِ قاطعِ برہان" کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اس پر مصنّف کا نام میاں دادخان سیّاح لکھا ہے مگر یہ محض مغالطہ ہے۔ اصل میں یہ کتاب میرزا کی اپنی تصنیف ہے۔ اس کے لیے کئی داخلی اور خارجی دلائل ہیں۔

(۱) میرزا ایک خط میں میاں دادخاں سیّاح کو لکھتے ہیں[۵]:

> تمھیں جو میں نے سیف الحق خطاب دیا ہے، اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ تم میرے ہاتھ ہو، تم میرے بازو ہو۔ میرے نطق کی تلوار تمہارے ہاتھ سے چلتی رہیگی۔ لطائفِ غیبی نے اعداء کی دھجیاں اڑادیں۔

اس خط میں دراصل اشارہ ہے خود لطائفِ غیبی کی طرف، جسے میرزا اس سے پہلے شائع کر چکے تھے۔ اس کتاب کے آغاز ہی میں یہ عبارت ہے:

> سیّاحِ بحر و بر، ہیچمداں، بے ہنر، سیف الحق، میاں دادخان حق شناسوں کی خدمت میں عرض کرتا ہے۔

اگر کتاب خود سیّاح کی لکھی ہوتی تو وہ دیباچے میں سیف الحق کیسے لکھتے، جب کہ غالب نے یہ خطاب انھیں بعد کو دیا تھا۔ فی الحقیقت میرزا نے کتاب لکھ کر ان سے منسوب کی اور پھر گویا انھیں اطلاع دیتے ہوئے یہ لکھا کہ میں نے تمھیں سیف الحق خطاب دیا ہے اور یہ اس کی وجہ ہے۔ میرزا کے خط کے اس اقتباس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مطلب یہ ہے کہ کلام تو میرا ہوگا، لیکن وہ تمھارے ہاتھ سے لکھا اور شائع کیا جائیگا، یعنی میں اپنی تحریر اپنے نام سے شائع نہیں کرونگا۔ (میرے نطق کی تلوار تمہارے ہاتھ سے چلتی رہیگی۔)

(۲) جن دنوں لطائفِ غیبی چھپی ہے، اسی زمانے میں میرزا نے خود ایک اعتراض قتیل کے کلام پر لکھا اور اخبار میں سیّاح کے نام سے چھپوا دیا۔ اس سے بھی اس بیان کی توثیق ہوتی ہے

۵۔ اردوے معلّیٰ: ۱۳۰

کہ "میرے نطق کی تلوار تمہارے ہاتھ سے چلتی رہیگی"۔ میرزا لکھتے ہیں[۱]:

> محمد میرزا خان میرے سبھی بھائی کا نواسہ ہے۔ اس نے ایک اخبار نکالا ہے مسمّیٰ بہ "اشرف الاخبار" اس کا ایک لفافہ تم کو بھیجتا ہوں۔ اس کو پڑھ کر معلوم کر لو گے کہ تمہارا ایک اعتراض قتیل کے کلام پر چھاپا گیا ہے۔ اس ارسال و اعلام سے صرف اطلاع منظور ہے۔

لطیفہ یہ ہوا کہ کسی مولوی صاحب نے اس اعتراض کا جواب دیا، تو میرزا کو "اکمل الاخبار" میں جواب الجواب چھپوانا پڑا۔ سیّاح کو لکھتے ہیں[۲]:

> واقعی اعتراض کے جواب ایک مولوی نے لکھے ہیں۔ اس ہفتے کے "اکمل الاخبار" میں دیکھ لو۔ جو تم سے کلام کرے، اسی انداز سے تم بھی کلام کرو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جواب الجواب سیّاح کے نام سے نہیں چھپا تھا۔

(۳) لطائفِ غیبی میں کتابت کی بہت غلطیاں رہ گئی تھیں۔ اگر یہ تصنیف خود سیّاح کی تھی، تو جو نسخے سیّاح کو بھیجے گئے تھے، وہ انھیں خود درست کر لیتے۔ غالب یا کسی اور شخص کو انھیں اغلاط بتانے کی ضرورت جبھی پیش آسکتی تھی کہ یہ کتاب کسی اور کی لکھی ہوتی۔ میرزا ایک خط میں انھیں لکھتے ہیں[۳]:

> یہ ایک پارسل جو بعد دو پارسلوں کے بھیجا گیا ہے، اس میں وہی لطائفِ غیبی ہے جس کو میں نے اپنے مطالعہ میں رکھ کر صحیح کیا ہے۔ اس کے بھیجنے سے یہ مدعا کہ تم اُن بیس رسالوں کو اس کے مطابق صحیح کر لو۔

اس سے ظاہر ہے کہ کتاب میرزا نے لکھی تھی اور اب وہ اس کی غلطیاں درست کر کے سیّاح کو بھیج رہے ہیں۔

۱۔ اردوے معلّیٰ: ۱۳

۲۔ اردوے معلّیٰ: ۳۸۳

۳۔ اردوے معلّیٰ: ۱۶

(۴) لطائفِ غیبی کے دیباچے کا آخری فقرہ ہے[۱]:

مجھ کو تو حمیت اور رعایتِ حق اس تحریر کی باعث ہوئی، تاکہ میں نے بیس لطائف جمع کیے، اور اس نگارش کا لطائفِ غیبی نام رکھا:

در پسِ آینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استادِ ازل گفت، ہماں می گویم

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ سیاح تو "در پسِ آینہ طوطی صفت" بیٹھے ہیں "استادِ ازل" (غالب) جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ دُہرا رہے ہیں۔ میرے خیال میں تو کتاب کا نام لطائفِ غیبی بجائے خود غمازی کر رہا ہے کہ

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

(۵) ان شہادتوں کے علاوہ سب سے بڑی داخلی شہادت خود لطائفِ غیبی کا اسلوبِ بیان و طرزِ تحریر ہے۔ سیاح کی اپنی لکھی ہوئی کتاب "سیرِ سیاح"، موجود ہے، جو ۱۸۷۲ء (۱۲۸۸ھ) میں چھپی تھی۔ اس میں انھوں نے لکھنؤ اور کانپور کے دو مشاعروں اور بعض اور مقامات کا حال لکھا ہے۔ ساری کتاب میں صرف پانچ صفحے نثر کے ہیں۔ لیکن اس کا بھی یہ حال کہ شروع سے آخر تک مسجع اور مقفی فقرے ہیں اور تصنع اور آورد سے کوئی سطر خالی نہیں۔ اس کی نثر کو لطائفِ غیبی سے کیا نسبت، جس میں بیساختگی اور آمد کا یہ عالم ہے کہ نگاہ کہیں رکتی ہی نہیں، اور اس پر ظرافت اور بذلہ سنجی فقرے فقرے سے عیاں، جو غالب کی تحریر کا طرۂ امتیاز ہے۔

(۶) مولانا حالی لکھتے ہیں[۲]:

میرزا کی اردو نثر میں زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں، چند تقریظیں اور دیباچے ہیں، اور تین مختصر رسالے ہیں، جو برہانِ قاطع کے طرفداروں کے جواب میں لکھے ہیں: لطائفِ غیبی، تیغِ تیز اور نامۂ غالب۔

۱۔ لطائفِ غیبی: ۳

۲۔ یادگارِ غالب: ۱۹۸۔ یہی بات ان سے پہلے محمد حسین آزاد نے بھی لکھی ہے (آبِ حیات: ۶۴۹)

سوال یہ ہے کہ مولانا آزاد اور حالی نے لطائفِ غیبی پر میاں داد خان سیاح کا نام مصنف کی حیثیت سے چھپا ہوا دیکھنے کے باوجود اسے کیوں غالب کی تصنیف قرار دیا؟ اس کا جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ انھیں معلوم تھا کہ یہ میرزا کی تصنیف ہے۔
غرض کہ ان تمام باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ لطائفِ غیبی میرزا کی تصنیف ہے۔ اور سیاح کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ بفرضِ محال اگر کچھ ہے، تو بس اتنا ہی کہ وہ زیادہ سے زیادہ اس کے جامع کی حیثیت رکھتے ہیں، جیسا کہ درفشِ کاویانی کے آخر میں سیاح کی تاریخ کا عنوان بھی "جامعِ لطائفِ غیبی" ہے۔

غالب نے اپنی ساٹھ سالہ ادبی زندگی میں چار کتابیں فارسی نثر میں اور دو نظم میں لکھیں۔ اردو میں ان کا سارا سرمایہ ایک مختصر دیوان اور خطوط کے مجموعوں کے علاوہ تین چار اور چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔ ساٹھ سال کی لمبی مدت کا یہ ثمرہ بلحاظِ مقدار کچھ ایسا قابلِ توجہ یا مہتم بالشان نہیں۔ خود انھیں بھی اس کا احساس تھا۔ مگر حالات کی نامساعدت اور ابنائے دہر کی ناقدری نے ان کے تمام دلولوں کو سرد کر دیا۔ وہ خود کہتے ہیں[1] کہ میں زمانے سے زیادہ نہیں، تھوڑی سی آسائش اور اطمینانِ قلب چاہتا تھا۔ اگر یہ مجھے میسر آجاتے، تو میں تخیل کی بلند پروازی سے اربابِ فن سے داد حاصل کرتا۔ لیکن انصاف سے دیکھا جائے تو جو کچھ انھوں نے اس پریشان حالی میں بھی لکھا اور صفحۂ قرطاس پر جو نقشِ جاوداں بنائے، ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کس نے کیا اور اس کی صحیح داد بھی انھیں کب ملی!
"مہرِ نیم روز" میں بہادر شاہ ظفر کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں[2]:

> مجھے اپنی خوش بختی پر جتنا ناز بھی ہو بجا ہے کہ آپ کا سا حکمران میرا خداوندگار و آقا ہے۔ لیکن میری جان آپ کے قربان! آپ کو بھی تو فخر ہونا چاہیے کہ غالب کا سا شاعرِ آتش نوا آپ کا غلام ہے۔ اگر آپ کا التفات میرے

۱۔ کلیاتِ نثر: ۱۵۰ (بنام مولوی سراج الدین احمد)
۲۔ کلیاتِ نثر: ۲۶۹

ہنر کے مطابق ہو۔ تو میری جگہ آپ کے دیدہ و دل میں ہونا چاہیے۔ کہتے ہیں، صاحبقرانِ ثانی شاہ جہان نے کلیم کو سیم و زر اور لعل و گہر سے تلوایا تھا۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ زیادہ نہیں، آپ سخن سنج حضرات کو بس یہ حکم دیں کہ وہ ایک بار میرے کلام ہی کو کلیم کے کلام کے ساتھ جانچنے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔

مولانا حالی لکھتے ہیں!

اس مضمون کو، جو لوگ میرزا کے رتبے سے واقف نہیں ہیں، شاید خودستائی اور تعلّی پر محمول کرینگے۔ مگر ہمارے نزدیک میرزا نے اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں کیا، بلکہ بالکل وہی کہا ہے جو ان کے زمانے کے اہلِ نظر اور اہلِ تمیز ان کی نسبت رائے رکھتے تھے۔[۱]

خود میرزا کو گہرا احساس تھا کہ لوگوں نے میرے صحیح مرتبے اور مقام کا اندازہ نہیں لگایا اور افسوس کرتے ہیں کہ دنیا اپنی کم نظری کے سبب میری صلاحیتوں سے کماحقہٗ مستفیض نہیں ہوئی۔ فرماتے ہیں[۲]:

پنجاہ و دو سال سفرِ سخن کا فتم۔ امروز کہ شصت و ششمین سال از عمرِ گزران می گزرد، سخن آفرین را سپاس گزارم و ہم جز آں بخشندۂ بخشایش گر کس نیارد دانست، کہ دریں پنجاہ و دو سال چہ دُرہاے معنی، بُر روے من کشادہ اند، و کرمیِ اندیشہ مرا در فرازستانِ آگہی بکدام پایہ نہادہ اند۔ حیف، کہ ابناے روزگار حسنِ گفتارِ مرا نشناختند۔ مرا خود دل بر آناں می سوزد کہ کامیاب شناساے فرۂ ایزدی نگشتند و ازیں نمایش ہاے نظر فروز کہ در نظم و نثر بکار بُردہ ام ہرگراں گذشتند۔ گویی نظیری ہمدردِ من و مقطعِ آں مینو آرامشگاہ نواے سازِ دم سردِ من است:

تو نظیری! ز فلک آمدہ بودی، چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدرِ تو نشناخت، دریغ!

۱۔ یادگارِ غالب: ۱۴۰

۲۔ درفشِ کاویانی: ۱۳۱-۱۳۲

تیسرا باب

عادات و اخلاق

حُلیہ

میرزا ایک تازہ وارد ولایتی خاندان کے چشم و چراغ تھے؛ اس لیے ان کا چہرہ مہرہ اور خد و خال ابھی مسخ نہیں ہونے پائے تھے اور ان میں اپنی قوم کی جملہ خصوصیات موجود تھیں۔ ان کی بڑی عمر کی تصویروں سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے شباب میں نہایت خوش رُو اور حسین رہے ہوں گے: چوڑا چکلا ہاڑ، لانبا قد، سڈول اکہرا جسم، بھرے بھرے ہاتھ پانو، کتابی چہرہ، کھڑا نقشہ، چوڑی پیشانی، ناک کی کاٹھی اونچی، رخسار کی ہڈی نسبتہً اُبھری ہوئی، گھنی لانبی پلکیں اور بڑی بڑی بادامی آنکھیں، کان بڑے، سرخ و سفید رنگ جس میں شراب نوشی نے چمپئی دمک پیدا کر دی تھی۔ شراب نوشی ہی کے باعث اخیر عمر میں پاؤں کی انگلیاں سوج کر اینٹھ گئی تھیں، جس سے جوتا پہننے اور چلنے میں تکلیف ہوتی تھی۔ جوانی میں داڑھی منڈاتے اور سر پر پٹھے رکھتے تھے۔ جب کہولت کا زمانہ آیا اور داڑھی مونچھ میں سپید بال آگئے، تو داڑھی منڈانا ترک کر دی۔ کیوں کہ دوسرے تیسرے سفید کھونٹی نکل آتی اور بدنما معلوم ہوتی تھی۔ داڑھی زیادہ لمبی، مولویانہ طرز کی نہیں رکھتے تھے، بلکہ کترواتے تھے۔ یہ دو ڈھائی انگل سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ دہلی کے عوام کی وضع تھی، منہ پر داڑھی، سر پر بال۔ انھوں نے یہاں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی؛ جس دن داڑھی بڑھائی، اسی دن سر منڈایا۔ جوانی میں مسّی بھی استعمال کرتے تھے۔ جب سامنے کے دونوں دانت ٹوٹ گئے تو یہ بھی ترک کر دی۔ لمبا قد ہونے کی وجہ سے اخیر عمر میں کمر میں ذرا خم آگیا تھا اور جھک کر چلتے تھے۔

لباس

میرزا خود رئیس ابن رئیس تھے۔ رئیسوں سے رشتہ داری اور یارانہ تھا۔ بادشاہوں اور

نوابوں کے استاد تھے۔ اس لیے ان کی فطری رکھ رکھاؤ کی عادت اور نفاست پسندی المضاعف ہو گئی۔ بالعموم اس کے بیرونی اظہار کا مقام لباس ہوا کرتا ہے۔ وہ گھر پر دلّی کے شرفا کی طرح، بڑ کا پاجامہ اور کھلی آستین کا الفی گریبان کا کرتا یا انگرکھا پہنتے تھے۔ سر پر عام طور پر ململ کی گول ہلکی ٹوپی ہوتی، جس پر کامدانی یا کشیدے کڑھائی کا کام ہوتا تھا۔ جاڑوں میں سردی سے بچنے کے لیے کسی گرم کپڑے کا کلی دار پاجامہ اور مرزئی پہنتے تھے۔ باہر نکلتے، تو تنگ مُہری کا آڑا پاجامہ، کُرتا اور اس پر صدری یا جامہ وار کی چپکن اور اس پر نیمہ آستین۔ اوپر کسی بھاری اور قیمتی کپڑے کی قبا یا چغہ اور اس پر ایک جامہ۔ پاؤں میں گھیتلی جوتی یا نوک دار کفشی اور ہاتھ میں موٹھ دار، مضبوط، لمبی لکڑی اس کی شام پر کندہ تھا:

یا اسد اللہ الغالب[1]

بعض اوقات ایک شالی رومال بھی کندھوں پر ڈال لیتے یعنی رومال کا سموسہ بنا کے اسے اس طرح پشت پر ڈال دیتے کہ اس کا ایک کونہ پیٹھ پر لٹکتا رہتا اور دوسرے دونوں کنارے شانوں سے گذر کر سینے پر آ رہتے، یا پھر سادہ طریقے پر گردن کے گرد ایک چکر دے کر اسے آگے پیچھے چھوڑ دیتے۔ سر پر عموماً کلاہ پاپاخ یا سیاہ پوستین کی اونچی ٹوپی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی مغلئی انداز کا پٹکا بھی باندھتے تھے۔ یعنی نیچے مخروطی کلاہ اور اس پر دستار۔ ایک خط میں انھوں نے منشی جواہر سنگھ جوہر سے ریشمی لنگی کی فرمائش کی ہے۔ اس میں لنگی کی وضع قطع سے متعلق جو ہدایتیں لکھی ہیں، ان سے ان کی عام عادات اور حسنِ مذاق کا نہایت صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں[2]:

> تمھیں یاد ہوگا کہ میرے پاس برّہ کی پوستین کی ٹوپی تھی۔ وہ اب کرم خوردہ ہو گئی ہے اور میرے سر پر کچھ نہیں۔ مجھے ٹوپی کی حاجت نہیں، البتہ ابریشمی لنگی چاہتا

۱۔ نیّرِ رخشاں کی رباعی ہے:

استادِ من، آں پیرِ حق آگہ غالب — اقلیم کلام را شہنشہ، غالب
می داشت عصائے کندہ جوہر بدست — بُد نقش بر آں "یا اسد اللہ الغالب"

۲۔ کلیاتِ نثر: ۲۵۰؛ نیز دیکھیے اردوئے معلّیٰ: ۳۳۶ (بنام منشی جواہر سنگھ)؛ خطوطِ غالب (۱): ۱۶۹

ہوں جیسی پشاور اور ملتان میں بنتی ہے اور اُن اطراف کے امرا اسے زیب سر کرتے ہیں۔ لیکن ایسی لنگی ہو کہ اس کے رنگ شوخ اور انگشت نما نہ ہوں، حاشیہ سرخ نہ ہو، کام اگرچہ نازک اور نفیس ہو، لیکن سونے چاندی کے تار اس میں نہ صرف ہوتے ہوں، ابریشم سیاہ اور سبز اور خاکستری اور زرد، اس کے تار و پود میں استعمال ہوا ہو۔ غالباً اس طرح کی چیز اس علاقے میں جلد اور آسانی سے دستیاب ہو جائیگی۔ تلاش کریں اور مہیا کر کے ڈاک سے مجھے بھیج دیں۔ اور قیمت بھی لکھیں۔ اگر قیمت نہیں لکھینگے، تو میں نہیں لینے کا۔ ہدیہ دار مغان وہ ہے جو بے طلب بھیجا جائے۔ جو چیز مانگ سے دی جائے، وہ ہدیہ نہیں کہی جا سکتی۔ میری اس تحریر سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ میں تم سے ہدیہ قبول نہیں کرنا چاہتا، بلکہ لنگی کا خریدار ہوں۔ اگر بے مانگے کوئی چیز آئیگی، تو میں اسے خوشی سے لونگا بہر حال لنگی کے بھیجنے میں توقف اور قیمت لکھنے میں تکلف نہ کیا جائے۔

خوراک

کھانے سے متعلق میرزا کا اصول یہ معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑا ہو، اور لذیذ ہو۔

گرمی سردی ہر موسم میں صبح نہار منہ، سب سے پہلے ٹھنڈائی پیتے تھے یعنی مقشر باداموں کا شیرہ، مصری کے شربت کے ساتھ۔ بعض دوست جو انھیں مصری کا تحفہ بھیجتے رہتے تھے، وہ اسی تبرید کے کام آتی تھی۔ اس کے بعد پہر دن چڑھے ناشتہ ہوتا تھا۔

دوپہر کے کھانے میں گوشت ضرور ہوتا تھا۔ گوشت سے بہت رغبت تھی اور یہ کسی دن ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ گوشت میں اس امر کا خیال رکھا جاتا کہ تازہ اور بے ریشہ ہو، تا کہ بوٹی پکنے پر نرم اور لذیذ رہے۔ بکری اور دنبے کا گوشت زیادہ پسند تھا؛ بھیڑ کا گوشت پسند نہیں کرتے تھے۔ پرندوں میں مرغ، کبوتر اور بٹیر پسند خاطر تھے؛ ترکاریوں میں انھوں نے ایک جگہ کڑوے کریلوں اور املی کے کھٹے پھولوں کا ذکر کیا ہے۔ گوشت میں کبھی کبھی میوہ ڈلوا لیتے تھے۔

جناب بگا بیگم فرماتی تھیں کہ ان کی عادت تھی کہ گوشت میں یا اور بھی جو سالن ترکاری

پکی ہو، اس میں تھوڑی سی چنے کی دال ضرور پڑتی تھی؛ اور مجھے چنے کی دال ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اس لیے میں رخصتی کے بعد گھر میں آئی، تو میری خاطر سے گوشت میں دال نہ ڈالی گئی۔ جب میرزا صاحب دوپہر کو کھانے پر بیٹھے، تو دیکھا کہ سالن میں دال نہیں پڑی ہے۔ انھوں نے خیال کیا کہ شاید گھر میں دال نہیں تھی۔ کہنے لگے: بھئی، اگر دال ہو چکی تھی، تو یا خود کسی کو بھیج کے منگوا لی ہوتی، یا مجھ سے کہا ہوتا، میں منگوا دیتا۔ اس پر بیگم صاحب بولیں، نہیں، دال تو گھر میں موجود ہے، لیکن بہو چنے کی دال نہیں کھاتی، اس لیے سالن میں نہیں ڈالی گئی۔ میرزا صاحب کو خدا دے ایسا موقع، پَٹ سے بول اٹھے: ادہو، پھر تو بہو خدا سے بھی بڑھ گئیں۔ ارے، چنا تو وہ چیز ہے کہ اس پر خود اللہ میاں کی بھی رال ٹپک پڑی تھی۔ اور پھر مزے مزے سے لگے، وہ مشہور لطیفہ سنانے، اور کہا کہ بس جب بہو چنے کی دال نہیں کھاتی، تو یہ خود خدا سے بھی بڑی ہوئی۔ گھر بھر میں سب کا مارے ہنسی کے بُرا حال تھا۔ میں ان کی لطیفہ بازی کی عادت سے کچھ ایسی واقف نہیں تھی، سخت شرمندہ ہوئی؛ اور جی میں ٹھان لی کہ آج سے کبھی کھانے کے معاملے میں دخل نہیں دونگی۔ لیکن میری ساس نے مجھ سے کہا کہ بیٹی، بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں، ان کی ہنسی مذاق کی عادت ہے۔ ان کی بات دل پر نہ رکھو۔ اس کے بعد میں نے چنے کی دال پر تو کبھی اعتراض نہیں کیا؛ ہاں، خود نہیں کھاتی تھی اور گوشت یا جو ترکاری پکتی، اس میں سے الگ کر کے کھا لیتی۔

اچھی قسم کے چاولوں کے بھی دلدادہ تھے۔ لیکن چوں کہ قبض کی تکلیف ہمیشہ بلائے جان رہی، اس لیے نئے چاولوں سے گھبراتے تھے کہ قابض ہوتے ہیں۔ پرانے چاولوں کو ترجیح دیتے تھے، جو پتلے بھی ہوں اور لمبے بھی، اور پکنے پر بڑھیں۔

جب تک صحت ٹھیک رہی اور معدہ بھی درست تھا، دوپہر کے کھانے میں گوشت کے علاوہ روٹی بھی ہوتی تھی۔ گوشت کی مقدار آدھ سیر کے قریب ہوا کرتی تھی۔ اگر سالن میں شوربا ہوا، تو بالعموم روٹی کا چھلکا اس میں بھگو بھگو کر کھاتے تھے۔ جب صحت نے جواب دے دیا اور معدہ کمزور ہو گیا، تو روٹی اور چاول چھوڑ دیے۔

دوپہر کو سیر بھر گوشت کی گاڑھی یخنی اور سرِ شام کبھی کبھی تین چار تلے ہوئے شامی کباب۔ کھانا بہت ابتدائی زمانے سے دن میں صرف ایک ہی وقت، دوپہر کو کھاتے تھے۔ رات کو کبھی کھایا ہی نہیں، بلکہ ان کے ایک خط سے، جو انھوں نے کلکتے کے قیام کے زمانے میں لکھا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ اتوار کے دن گوشت بھی نہیں کھاتے تھے[1]۔ خدا معلوم یہ ہمیشہ کا دستور تھا یا عارضی بات تھی۔

گرمیوں میں ٹھنڈے پانی پر جان دیتے تھے۔ اگر برف دستیاب ہو جاتی، تو ذخیرہ کر رکھتے ورنہ صراحی پر ترصافیاں لپیٹ دیتے، تاکہ پانی ٹھنڈا رہے۔

پھل

پھلوں میں انگور اور آم دونوں خاص طور پر بہت مرغوب تھے۔ ایک دفعہ برسات کے شروع میں نواب علاء الدین احمد خاں نے انھیں لوہارو آنے کی دعوت دی، تو انھوں نے مذاق مذاق میں لکھا کہ میں اندھا ہوں کہ اس موسم میں دلّی چھوڑ کر لوہارو جاؤں۔ اُس ویرانے میں نہ آم، نہ انگور، نہ کوئی اور لطف۔ ناصاحب! میں آج کل نہیں آسکتا۔

آموں سے ان کی رغبت کا سب دوستوں کو علم تھا اور جہاں جہاں آم افراط سے ہوتا ہے، وہاں کے دوست احباب اُنھیں فصل میں سوغات کے طور پر بھیجتے رہتے اور وہ خود بھی فرمائش کر کے دوستوں سے منگواتے رہتے تھے۔ کلکتے کے سفر میں انھیں بنگال کے آم بہت پسند آئے تھے اور انھوں نے ایک جگہ ان کا ذکر اثمارِ بہشتی کے مقابلے پر کیا ہے:

ہمہ گر میوۂ فردوس بخوانت باشد
غالب! آں انبۂ بنگالہ فراموش مباد

ایک مرتبہ میرزا فخرو ولی عہد نے اپنے خاص باغ سے آموں کا تحفہ بھیجا، تو اس پر انھوں نے اردو میں ایک مختصر مثنوی آموں کی تعریف میں کہی، جو ان کے دیوان میں موجود ہے۔ ایک خط میں اپنے آم کھانے کا حال یوں لکھا ہے[2]:

۱۔ مآثرِ غالب: ۲۰ (خط ۱۳)

۲۔ اردوے معلیٰ: ۱۰۷ (بنام چودھری عبدالغفور سرور)

ان دنوں میں، کہ دل بھی تھا اور طاقت بھی تھی، شیخ محسن الدین مرحوم سے بطریقِ تمنّا کہا گیا تھا کہ جی یوں چاہتا تھا کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر، آم کھاؤں ۔ اب وہ دل کہاں سے لاؤں؟ طاقت کہاں سے پاؤں؟ نہ آموں کی طرف وہ رغبت، نہ معدہ میں اتنے آموں کی گنجایش۔ نہار منہ میں آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں، جو کہوں بین الطعامین۔ ہاں آخرِ روز، بعدِ ہضمِ معدہ، آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں، اتنے آم کھاتا تھا، پیٹ اپھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں مگر دس بارہ، اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات۔

حقّہ اور پان

حقّہ بھی پیتے تھے اور اس کا کوئی وقت مقرّر نہیں تھا۔ صبح، دوپہر، شام، جب جی چاہا، تازہ کروالیا۔ کام کر رہے ہیں اور حقّے کا کش لگ رہا ہے۔ تصویر سے معلوم ہوتا ہے کہ حقّے کی ظاہری شکل وصورت کا بھی خیال رکھتے تھے، اور پیچوان کو ترجیح دیتے تھے۔ پان نہیں کھاتے تھے۔

شراب

میرزا نے اپنی زندگی جس ناپسندیدہ طریقے پر شروع کی تھی، اس کا ذکر انھوں نے کسی جگہ کیا ہے۔ بارے، بعد کو وہ بہت کچھ سنبھل گئے اور انھوں نے اکثر باتوں میں معتدل روش اختیار کرلی۔ البتہ یہ کافر شراب ایسی ان کے منہ لگی کہ آخر دم تک نہ چھٹی۔

"باغِ دودر" کے ایک قطعے° سے معلوم ہوتا ہے کہ وفات سے دو تین مہینے پہلے (نومبر ۱۸۶۸ء/ شعبان ۱۲۸۵ھ) انھوں نے چند دن کے لیے شراب پینا چھوڑ دی تھی۔ لیکن یہ عصمتِ بی بی از بے چادری کا مضمون تھا۔ لکھتے ہیں کہ میرے احباب میں سے دو شخصوں نے غیرتِ دینی کے باعث مجھے شراب پینے سے منع کیا، لیکن میں ان کی باتوں میں نہیں آیا،

° ۔ قطعہ (۴۵)

نہ میں نے شراب ہی ترک کی۔ اس پر انھوں نے ایک اور چال چلی یعنی جس زود کا ندار سے میں شراب ادھار منگوایا کرتا تھا، اسے بہکایا۔ اتفاق سے مجھ پر اس کا قرض بھی حدِ مناسب سے زیادہ ہو چکا تھا۔ جب میں نے اس سے اور ادھار دینے کو کہا، تو اس نے انکار کر دیا۔ کاسۂ خالی اور کیسۂ خالی، دونوں کا کیا میل! اگر میرے پاس دام ہوتے، تو میں کہیں اور ہی سے منگوا لیتا، لیکن، درہم و دام اپنے پاس کہاں۔

میرا خیال ہے کہ اس کے بعد جب کہیں سے کوئی فتوح ہاتھ آ گئی، تو انھوں نے پھر پینا شروع کر دی۔

اوّل اوّل انھوں نے کوئی اصول نہیں قائم کیا تھا یعنی شام کے علاوہ دن کے بعض اوقات میں بھی پی لیتے تھے "ابر و باراں میں یا پیش از طعام چاشت یا قربتِ شام، جب جی چاہا، تین چار گلاس پی لیتے اور شرابِ شبانہ میں مجرا نہ لیتے" لیکن جلد ہی انھوں نے محسوس کر لیا کہ اس بے اعتدالی کا نتیجہ سراسر نقصان کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا، تو انھوں نے خیام کے مشورے پر عمل شروع کیا کہ

اندک خور و گہ گاہ خور و پنہاں خور

دن کا پینا بالکل ترک کر دیا اور صرف شام پر اکتفا کی، اور وہ بھی مقدار میں کم۔ یہ معمول آخر تک رہا، اور یہ عادت ایسی راسخ تھی کہ اگر سرِ شام شراب پینے کو نہ ملتی، تو انھیں رات بھر نیند نہیں آتی تھی۔ ابتدا میں روزانہ پاؤ بھر کے قریب پیتے رہے؛ لیکن آخری ایام میں جب تندرستی خراب ہو گئی اور احتراقِ خون سے بیمار رہنے لگے، تو یہ مقدار گھٹ کر صرف چند تولے رہ گئی تھی۔ شراب کی حدّت اور تیزی کم کرنے کو اس میں دو تین حصے گلاب ملا لیا کرتے تھے، چناں چہ خود ایک شعر میں لکھتے ہیں:

آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خوے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی، گلاب را

اسی طرح ایک اور شعر ہے:

رندِ ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نبود
لیک صنم بہ سجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

رندِ دُرد آشام غالب نام، در ساقی گری
پارۂ مشک و گلاب افزود در صہبائے من

میر مہدی مجروح کا ایک شعر ہے:

غالب آئے ہیں، لاؤ، اے مجروح!
بادۂ ناب میں ملا کے گلاب

مولانا عبدالحق صاحب نے میر افضل علی عرف میرن صاحب کے حال میں میرزا کی شراب نوشی سے متعلق ایک دلچسپ روایت بیان کی ہے، جس سے ان کے شراب پینے کے طریقے پر روشنی پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں[1]:

ایک بار کا ذکر ہے کہ حیدر آباد کے ایک وکیل صاحب کسی سے ذکر کر رہے تھے کہ میرزا غالب شراب پیتے تھے۔ میر صاحب (یعنی میرن صاحب) قریب کے کمرے میں کپڑے بدل رہے تھے۔ ان کے کان میں اس کی بھنک جا پڑی، ویسے ہی باہر نکل آئے۔ وکیل صاحب پر بہت بگڑے، اور بہت برا بھلا کہا۔ جب ذرا ٹھنڈے ہوئے، تو میں نے پوچھا، تو کیا یہ غلط ہے کہ میرزا صاحب شراب پیتے تھے؟ کہنے لگے، یہ لوگ کیا جانیں، یونہی جو جی میں آیا، بک دیتے ہیں۔ اب انھوں نے بیان کرنا شروع کیا کہ کس طرح پاک، صاف ستھرے، آبخورے میں تھوڑی سی ڈالی جاتی اور اس میں گلاب ملایا جاتا اور اس پر صافی لپیٹ کر اُدھر ہوا میں لٹکا دیا جاتا۔ رات کے وقت جب کوئی نہیں ہوتا تھا اور صرف میں یا میر مجروح ہوتے، تو اس وقت اسے پیتے۔ اس کے بعد ہزار توبہ استغفار کرتے۔ غرض انھوں نے میرزا صاحب کی مے نوشی کو طول دے کر ایسے عجیب طور سے بیان کیا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ شراب نہ تھی، بلکہ آبِ کوثر تھا۔

میرزا محمد حسن خان عرف خضر میرزا (عارف کے بھتیجے) فرماتے ہیں[2]:

شراب پینے میں ان کا دستور تھا کہ کلو داروغہ گلاس دھو کر آدھ پاؤ شراب

۱۔ اردو، جنوری ۱۹۳۷ء، بعنوان "ا۔"، کے مجموعۂ مضامین "چند ہم عصر" میں بھی شامل ہے (۲۱۵-۲۱۶)
۲۔ ادبی دنیا سالنامہ (۱۹۴۷ء): ۲۷۶

اس میں ڈال دیتا اور گلاس ڈھانک کر ان کے پاس رکھ دیا کرتا تھا۔ موسم گرما میں، شراب کا گلاس لال قند کے کپڑے میں لپیٹ کر رکھا جاتا تھا۔ کپڑے کو برف سے تر کر دیتے تھے؛ اتنا تر ہو جاتا کہ پانی ٹپکنے لگتا۔ مغرب کی اذان ہونے پر شراب پیتے تھے۔ ایک قاب میں بادام نمک میں پڑے ہوئے گھی میں تلے ہوئے، پاس ہی پڑے رہتے تھے۔ چار بادام منہ میں ڈال لیتے اور شراب کا گھونٹ لیتے اور ساتھ ساتھ غزل لکھتے جاتے تھے۔ شعر لکھتے تھے اور کاٹتے تھے، پھر لکھتے تھے اور کاٹتے تھے؛ یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

مولانا حالی فرماتے ہیں[1] کہ رات کی شراب کی جو مقدار مقرر کر لی تھی، اس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ جس صندوق میں بوتلیں رکھتے تھے، اس کی کنجی کلّو داروغہ کے پاس رہتی تھی اور اسے تاکید سے کہہ رکھا تھا کہ رات کو کبھی سرخوشی کے عالم میں مجھے زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو، تو میرا کہا نہ ماننا اور طلب کرنے پر کنجی نہ دینا۔

یہ نہیں کہ وہ شراب نوشی کو بُرا نہیں سمجھتے تھے، یا انھیں اس پر فخر تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس سے پشیمان تھے اور اپنے آپ کو گنہگار سمجھتے تھے۔[2] وہ ثوابِ طاعت و زہد جانتے تھے لیکن اپنی طبیعت کی افتاد سے مجبور رہتے اور اس پر عمل نہیں کر سکتے تھے۔ چوں کہ یہ بُری عادت انھیں پڑ گئی تھی اور وہ اسے بالکل چھوڑنے پر قادر نہیں تھے، اس لیے انھوں نے کم از کم یہ اصول بنا لیا تھا کہ تنہائی میں یا پھر نہایت بے تکلف اور گہرے دوستوں کی موجودگی میں پیتے۔ اگر غور سے دیکھا جائے، تو یہ پابندی بھی ان کی شرم اور پشیمانی ہی کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔

اپنی شراب نوشی کی ایک جگہ انھوں نے توجیہ بھی کی ہے:

مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

۱۔ یادگارِ غالب: ۸۲

۲۔ اردوئے معلّٰی: ۳۸۰؛ خطوطِ غالب: ۳۹۳ (غلامی)

ممکن ہے، اوائل عمر میں انھوں نے واقعی نشاط اور عیش و عشرت کے لیے پینا شروع کی ہو، لیکن بعد کو جب مادی اور ذہنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، تو یہ بات باور کی جاسکتی ہے کہ شاید اس زمانے میں پینے سے غرض محض غم غلط کرنا ہو۔ بہرحال اخیر عمر میں جب اس کی مقدار اتنی تھوڑی رہ گئی تھی، نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے وہ کوئی سرور حاصل کرتے ہونگے، بلکہ یہ محض طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، جس سے وہ باز نہیں رہ سکتے تھے۔

میرزا عموماً ولایتی شراب پیتے تھے، اور وہ بھی خاص طور پر اولڈ ٹام اور کاس ٹیلن۔ گرچہ یہاں کی دیسی شراب انھیں پسند نہیں تھی اور یہ انھیں راس بھی نہیں آتی تھی چنانچہ کئی شعروں میں اس کی شکایت کی ہے:

بس است آنچہ بہ ہندوستان کشند از قند | ہم از خرنگ بیار ارنباشد از شیراز
شراب تندی ہندوستاں دماغم سوخت | زشیرہ خانۂ کشمیرم آورند شراب

غالب از شراب تندی ہندم کباب کرد
زیں بعد بادہ ہائے گوارا کشیدہ باد

غدر کے زمانے میں انھیں بہت تکلیف ہوئی، شہر میں ولایتی شراب کم ہوگئی، اور اس کی قیمت بھی بہت چڑھ گئی۔ جہاں پہلے بیس پچیس روپے درجن کے دام تھے، اب بڑھ کر پچاس ساٹھ میں بکنے لگی میرزا کا یہ مقدور کہاں کہ اتنے مہنگے داموں خرید سکتے۔ اس لیے انھوں نے کوشش کی کہ کانپور سے منگوائی جائے[۱] لیکن جب معلوم ہوا کہ وہاں بھی یہی نرخ ہے، تو قہر درویش بجان درویش، چپکے ہو رہے۔ اس زمانے میں ان کے دوست مہیش داس آنریری مجسٹریٹ، دلی نے انھیں دیسی شراب تند تحفے کے طور پر پیش کی، جو رنگ و بو میں ولایتی سے کم نہیں تھی۔ میرزا نے اسے بہت پسند کیا اور اس پر ایک رباعی کہی:

از مہر دلم وایہ از ہر دری جست | از بادۂ ناب، یک دو ساغر می جست
فرزانہ مہیش داس بخشید بمن | آبے کہ برائے خود سکندر می جست

---

[۱] اردوئے معلّیٰ: ۵۰۹ (بنام ہرگوبند سہائے)

یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد وہ شراب "خانہ ساز" ہی استعمال کرتے رہے۔ کبھی کبھی گھر پر بھی کشیدہ کر لیتے تھے۔ جب محکمۂ آبکاری قائم ہوا اور حکام کی طرف سے گھروں میں شراب تیار کرنے پر پابندی عائد ہوگئی، تو انھوں نے ایک خط میں اس کی شکایت لکھی ہے۔[1]

میرزا نے ایک مقطع میں اپنی ان تمام مرغوب اشیا کا یکجا ذکر کیا ہے:

غالب! من و خدا، کہ سرانجامِ برشکال
غیر از شراب و انبہ و برفابِ قند نیست

دلّی میں سکونت

عین ممکن ہے کہ جب وہ دلّی آئے ہیں تو شروع میں کچھ دن سسرال کے ہاں ٹھہرے ہوں۔ اس صورت میں گویا سب سے پہلے وہ یہاں گلی قاسم جان میں رہے لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ جلد ہی انھوں نے اپنا الگ مکان لے لیا؛ اور یہ شاید ان کی اپنی ملک تھا۔ نواب انور الدولہ کے نام ایک خط میں غالباً اسی ذاتی مکان کی طرف اشارہ ہے۔ لکھتے ہیں:[2]

سی سالست کہ خانہ و کاشانہ فروختہ کوبکو می گردم و مقامے معیّن ندارم۔ ہر جا کہ می روم، دو سہ سال یا کمتر یا بیشتر می آسایم۔

اس خط پر تاریخ درج نہیں لیکن اتنا یقینی ہے کہ یہ ۱۸۵۵ء سے پہلے کا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مکان انھوں نے کلکتے کے سفر سے پہلے فروخت کیا ہو۔ اس موقع پر انھیں سفر کے لیے اچھی بڑی رقم درکار تھی۔ جو کچھ قرضے سے مہیا ہو سکا، وہ لیا؛ اس کے علاوہ اس مکان کے اونے پونے کیے۔ اگر یہ قیاس درست ہو، تو گویا ۱۸۲۶ء تک وہ اس مکان میں رہے۔ انور الدولہ کے خط میں تیس سال کی مدت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ خدا معلوم یہ تھا کہاں!

سفرِ کلکتہ سے واپسی کے بعد (۱۸۲۹ء) انھوں نے ایک خط میں اپنا پتا مولوی سراج الدین احمد

۱۔ اردوے معلّیٰ: ۱۶۷؛ خطوطِ غالب (۱): ۲۸۲ (بنام حکیم غلام نجف خاں)

۲۔ کلیاتِ نثر: ۲۳۵

کو لکھا ہے[1]، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے میں نواب عبدالرحمن[2] خان کی حویلی (کھاری باؤلی) میں رہتے تھے۔

نواب یوسف علی خان ناظم اپنی طالب علمی کے زمانے میں دلّی آئے ہیں، تو انھوں نے اور استادوں کے علاوہ غالب سے فارسی پڑھی تھی۔ ناظم مارچ ۱۸۱۶ء میں پیدا ہوئے تھے[3]۔ اس لیے غالباً ۱۴-۱۵ برس کی عمر میں یعنی ۱۸۳۰ء کے لگ بھگ دلّی آئے ہونگے۔ اس کی تائید میرزا کے ایک خط سے بھی ہوتی ہے، جو انھوں نے مارچ ۱۸۶۰ء میں تفتہ کو لکھا ہے[4]۔ اس میں نواب صاحب کو تیس برس سے اپنا دوست بتایا ہے۔ میرزا نے مولوی فضل حق خیرآبادی کی تحریک پر ۱۸۵۷ء کے آغاز میں نواب ناظم کی خدمت میں قصیدہ بھیجا اور تجدیدِ تعلقات کا ڈول ڈالا، تو شروع میں ریاست کی طرف سے ان کے خطوط پر پتا "عقبِ مسجدِ جامع" لکھا جاتا رہا[5]۔ اس پر میرزا نے توجہ[6] دلائی کہ میں سات آٹھ برس سے بلّی ماران میں مقیم ہوں، آیندہ خط کے پتے میں اس محلّے کا نشان دیا جائے۔

میرا خیال ہے کہ "عقبِ مسجدِ جامع" والا وہ مکان ہے، جہاں وہ اس زمانے میں رہتے تھے، جب کہ نواب ناظم اپنے قیامِ دلّی کے دوران میں ان سے پڑھتے رہے تھے۔ چوں کہ اس کے بعد تعلقات منقطع ہو گئے[6] اور نواب صاحب کو ان کے نئے مسکن کا پتا معلوم نہیں تھا، اس لیے ان کی ہدایت پر اسی پرانے پتے پر خط بھیجا گیا؛ انھوں نے خیال کیا ہوگا کہ وہ ہنوز وہیں رہتے ہیں۔

۱- متفرقاتِ غالب (۱) : ۳

۲- یہ نواب عبدالرحمن خان، رام پور کے نواب یوسف علی خان فردوس مکان کے چچا تھے۔

(مکاتیبِ غالب: ۱۲۷ (حواشی)

۳- تلامذۂ غالب: ۲۷۴

۴- اردوے معلّیٰ: ۱۴۴؛ خطوطِ غالب (۱) : ۷۳

۵- مکاتیبِ غالب: ۱۰ (مکاتیب)

(۶) ایضاً

اس صورت میں وہ نواب عبدالرحمٰن خان والی حویلی میں زیادہ دن نہیں رہے ہونگے۔ یہی سال ایک شاید رہے ہوں؛ اور اس کے بعد انھوں نے جامع مسجد کی پشت پر یہ مکان لے لیا۔

میرزا صاحب نے نواب علاء الدین احمد خان صاحب کو ایک خط میں لکھا ہے[1] کہ اب "یہ وہ دلّی نہیں، جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے"۔ نواب علائی اپریل ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے[2]۔ اس لیے ان کی طالب علمی کا زمانہ تقریباً ۱۸۴۰ء میں شروع ہونا چاہیے؛ اور وہ جبھی سے یا اس کے کچھ دن بعد غالب کے ہاں پڑھنے کے لیے آنے لگے ہونگے۔ گویا وہ ۱۸۴۱ء-۱۸۴۲ء کے قریب شعبان بیگ کی حویلی (پھاٹک حبش خان) میں رہتے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ جامع مسجد والے مکان سے اٹھ کر وہ سیدھے شعبان بیگ کی حویلی میں آتے۔ یا درمیان میں کہیں اور بھی رہے۔

جوئے کا مقدمہ مئی ۱۸۴۷ء میں پیش آیا۔ اس کا فیصلہ دس بارہ دن بعد غالباً جون کے پہلے ہفتے میں ہوا اور انھیں چھ مہینے قید کی سزا ہوئی؛ لیکن وہ چھ مہینے قید میں نہیں رہے اور ڈاکٹر راس کی سفارش پر تین مہینے بعد رہا کر دیے گئے[3]۔ گویا وہ ستمبر یا اکتوبر ۱۸۴۷ء میں رہا ہوئے ہونگے۔ یہ تو نہیں معلوم ہوسکا کہ جب وہ گرفتار ہوئے ہیں، تو کس مکان میں تھے، لیکن قید سے چھوٹ کر آنے کے بعد وہ حضرت میاں کالے کی عظیم الشان حویلی (گلی قاسم جان) کے ایک حصّے میں رہے تھے۔ اس کے بعد میاں کالے صاحب کی زندگی بھر وہ اسی مکان میں رہے۔ غالباً وہ اس مکان کا کرایہ نہیں دیتے تھے؛ میاں کالے کے پاس دوستانہ رہے۔ جب میاں کالے صاحب کا ۱۴ دسمبر ۱۸۵۱ء کو انتقال ہوگیا[4]، تو اس کے بعد انھوں نے دوسرے مکان کا انتظام کیا اور مارچ ۱۸۵۲ء میں وہاں چلے

۱۔ اردوئے معلیٰ: ۳۱۸؛ خطوطِ غالب (۱): ۳۸۳

۲۔ تلامذۂ غالب: ۲۴۰

۳۔ دیکھیے اوپر ص

۴۔ دہلی اردو اخبار، ۱۴ دسمبر ۱۸۵۱ء (۲۰ صفر ۱۲۶۸ھ)

گئے۔ میرزا تفتہ کو انھوں نے ۲۲ مارچ ۱۸۵۲ء کے خط میں اس نقلِ مکان کی اطلاع دی ہے۔[1]
یہ نیا مکان بلّی ماران میں حکیم محمّد حسن خان کی ملکیت تھا۔

غدر کے بعد جب انگریزوں کا دلّی پر دوبارہ قبضہ ہو گیا، تو انھوں نے شہر میں بہت اودھم مچایا تھا۔ مسلمانوں پر ان کی خاص نظرِ عنایت تھی۔ جس محلے میں بھی مسلمان مقیم دیکھتے، وہاں گورے گھس آتے اور طرح طرح کی بدعنوانیاں کرتے؛ حکّام بالا بھی ان سے کوئی باز پُرس نہیں کرتے تھے۔ اس زمانے میں حکیم محمود خان کا مکان (بلّی ماران) مسلمانوں کا گویا جائے پناہ بن گیا تھا۔ جانے کسی نے مخبری کی، یا کیا ہوا؛ ایک دن (۲ فروری ۱۸۵۸ء) گورے کوچے میں گھس آئے اور دوسروں کا تو کیا ذکر، خود حکیم محمود خان اور حکیم مرتضیٰ خان اور ان کے چچیرے بھائی حکیم عبد الحکیم خان (عرف حکیم کالے صاحب) کو بھی تقریباً ساٹھ آدمیوں سمیت تھانے لے گئے۔ بارے تینوں حکیم تو تین دن بعد (۵ فروری) واپس آ گئے، لیکن دوسرے لوگوں کو کم و بیش دو مہینے نظر بند رہنا پڑا۔[2] حکیم محمود خان نے یہ لیل و نہار دیکھے، تو خیال کیا کہ چند دن کے لیے احتیاطاً یہاں سے ٹل جانے ہی میں عافیت ہے۔ چنانچہ وہ مارچ میں پٹیالے چلے گئے۔[3]

اس پُر آشوب زمانے میں میرزا اسی حکیم محمد حسن خان والی حویلی میں تھے۔ قدرتی طور پر انھیں بھی تشویش ہوئی کہ کہیں کوئی گورا گھر میں آکر آبرو ریزی نہ کر دے۔ جب حکیم محمود خان پٹیالے چلے گئے، تو میرزا بمقتضائے مصلحت عارضی طور پر اپنا مکان چھوڑ کر ان کے مسکن شریف منزل (بلّی ماران میں) منتقل ہو گئے۔[4] لیکن انھوں نے حکیم محمد حسن خان والا

۱۔ اردوئے معلّیٰ، ص ۳۵۷؛ خطوطِ غالب (۱) : ۸۔ میرزا نے مجروح کے نام کے خطوط اردوئے معلّیٰ، ص ۱۴۴؛ خطوطِ غالب (۱)، ص ۳۴۳) میں جو ۱۸۵۰ء لکھا ہے، تو یہ محض اٹکل ہے؛ وہاں تعیّنِ زمانہ مراد نہیں، بلکہ لمبے عرصہ کا اظہار مقصود ہے۔ نیز دیکھیے باغِ دودر، ص ۱۵۴

۲۔ کلیاتِ نثر : ۴۰۲

۳۔ ایضاً : ۴۰۶

۴۔ اردوئے معلّیٰ : ۱۶۵؛ خطوطِ غالب (۱) : ۲۷۷ (حکیم غلام نجف خان)

مکان چھوڑا نہیں تھا۔ جب چند ماہ بعد حالات معمول پر آ گئے، تو وہ شریف منزل سے اپنی جگہ پر واپس آ گئے۔

اس مکان کا کرایہ چار روپیہ مہینا تھا، جو وہ ہر ماہ باقاعدگی سے ادا کرتے رہے۔ لیکن غدر کے زمانے میں جب پنشن بند ہو گئی، تو اس معمول میں فرق آ گیا اور وہ کرایہ نہ دے سکے۔ مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر تین برس کی یہ ساری چڑھی ہوئی رقم انھوں نے پنشن کا روپیہ ملنے پر مئی ۱۸۶۰ء میں ادا کی تھی[1]۔ وہ اس مکان میں بہت دن رہے۔

۱۸۶۰ء میں یہ حویلی حکیم غلام اللہ خان نے خریدلی۔ نئے مالک نے جون ۱۸۶۰ء میں میرزا سے مکان خالی کر دینے کو کہا۔ انھوں نے کچھ لیت و لعل کی، اور کہا کہ جونہی دوسرا مکان ملتا ہے، میں اسے خالی کر دونگا۔ مالک انھیں نکالنے پر تُلا ہوا تھا، جب اس نے دیکھا کہ سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلتا، تو اس نے مرمّت اور ردّ و بدل کے بہانے مدد لگا دی۔ اس طرح زچ ہو کر یہ مکان چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اس پر انھوں نے علائی کو لکھا کہ اپنی چھوٹی پھوپھی سے سفارش کر کے کروڑا والی حویلی دلوا دو، تاکہ یہاں سے نجات ملے۔ انھوں نے یہ حویلی دے دی تھی، لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اس میں گئے نہیں، بلکہ انھیں ۹ جولائی ۱۸۶۰ء کو دوسرا مکان مل گیا اور وہ اس میں اُٹھ گئے[2]۔

یہ نیا مکان بھی بلّی ماران ہی میں تھا، بلکہ اس پہلے مکان کے برابر والا مکان تھا۔ اس کے مالک میر خیرات علی (عرف میر خیراتی) تھے[3]۔ اگرچہ یہ مکان بھی وسیع اور بسر بازار تھا لیکن اس کے باوجود وہ اس سے خوش نہیں تھے۔ بات یہ ہے کہ پہلا حکیم محمد حسن خان والا مکان شرق رویہ تھا اور گرمیوں میں پُروا ہوا کے باعث بہت آرام دِہ! اس نئے مکان میں وہ جہت اور سمت بدل گئی، جس سے خس کی ٹٹی اور ہوا کا لطف نہ رہا۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ اسی مکان سے ۱۸۶۲ء کی برسات میں تنگ آ کر انھوں نے نواب علاء الدین احمد خان کے

۱۔ ایضاً: ۵۵ (تفتہ)؛ خطوطِ غالب (۱): ۷۵
۲۔ ایضاً،
۳۔ اردوئے معلّیٰ: ۱۳۰ (مجروح)؛ خطوطِ غالب (۱): ۳۱۹

ذریعے سے الٰہی بخش خاں معروف والا مکان لینے کا ارادہ کیا تھا۔ پھر برسات ختم ہو گئی اور انھوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا[1]۔

اس کے بعد انھوں نے ۱۸۶۶ء کے آغاز میں، رام پور کے دوسرے سفر سے واپسی کے بعد مردانہ حصے کے لیے وہ مکان لیا[2] جس میں ان کا انتقال ہوا۔ یہ بلی ماران سے گلی قاسم جان میں داخل ہوتے الٹے ہاتھ کو پڑتا ہے اور سرے کی مسجد کے برابر کا مکان ہے۔ اسی مسجد کی مناسبت سے انھوں نے کہا تھا:

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

اس مکان کے مالک کا نام غالباً اسمٰعیل خاں تھا اور کرایا ساڑھے پانچ روپیے مہینا[3]۔ اس میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ اس کے مردانہ اور زنانہ حصے الگ الگ کچھ فاصلے پر تھے، زنانہ حصہ اس کے بالمقابل گلی کی دوسری طرف تھا۔ یہ اب ہندستانی دواخانے میں شامل ہے۔

رہن سہن

مکان میں انھیں اس بات کا خیال رہتا کہ محلسرا اور دیوانخانہ الگ الگ ہوں۔ اگر دیوانخانہ بھی اسی مکان میں ہوتا، تو وہ ترجیح دیتے تھے کہ اس کا دروازہ محلسرا سے علیحدہ ہو، تاکہ دوست احباب مردانے میں بے جھجک آ جا سکیں، ورنہ انھیں اس میں بھی کوئی اعتراض نہیں تھا کہ دونوں بالکل دو الگ الگ مکانوں میں ہوں۔ دونوں جگہ کے ملازم مخصوص تھے۔ نوکروں کے بارے میں ان کا ٹھاٹھ سدا امیرانہ، بلکہ مسرفانہ رہا۔ اندر باہر چار چار، پانچ پانچ نوکر بھرے تھے۔ سفر میں بھی نوکر ساتھ لے جاتے تھے۔ کلکتے کے

۱۔ اردوے معلیٰ: ۳۲۹؛ نیز ۳۲۳-۳۲۴ (علائی)

۲۔ یہ مکان انھوں نے ستمبر ۱۸۶۵ء میں کرایے پر لے لیا تھا، لیکن وہ اس میں رام پور سے واپسی کے بعد جنوری ۱۸۶۶ء میں گئے۔

۳۔ اردوے معلیٰ، ص ۱۲۷؛ خطوطِ غالب: ۲۸۶-۲۸۷ (غلام نجف خان)

سفر میں ایک کہار اور دو ملازم دلّی سے ان کے ساتھ گئے تھے۔ رام پور کے دونوں سفروں میں تین چار ملازم تھے۔ نوکروں کی یہ بھرمار ان دنوں بھی قائم رہی، جب ۱۸۵۷ء میں اور اس کے بعد بھی ان کا حال بہت پتلا تھا۔ اس زمانے میں ان کے پاس دو نوکر — کلّو داروغہ اور کلیان — مردانے میں اور دو لونڈے — نیاز علی اور ایاز — اور ایک ددا، اور ایک خادمہ 'وفادار'، زنانے میں تھے۔ ان نوکروں کی تنخواہ تقریباً پچیس روپے تھی[۱]۔ اس لحاظ سے کہ ان کی مستقل آمدنی کبھی غیر معمولی طور پر زیادہ نہیں رہی، یہ ہر مہینے ۲۵ روپیے کا خرچ بہت زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ مداری اور کلّو داروغہ اور کلیان، تینوں بہت لمبے عرصے تک ان کے پاس رہے، بلکہ کلّو کا انتقال بھی میرزا کے بعد اسی گھر میں ہوا۔ کلیان ہندو تھا۔

انھیں جانور پالنے کا بھی شوق تھا۔ بالخصوص جب باقر علی خان اور حسین علی خان، دونوں بھائی ان کے پاس آ گئے، تو ان کی تفریح اور دلچسپی کے لیے وہ زیادہ اہتمام سے جانور رکھنے لگے تھے۔ باہر ان کی سواری کے لیے گھوڑے تھے، اندر بلّی، مور، کبوتر، بٹیر، دنبہ، بکری[۲]۔ ان کے کلیاتِ فارسی میں ایک قطعہ[۳] بلی سے متعلق موجود ہے، جو ابتدائی زمانے کا کلام معلوم ہوتا ہے۔

مطالعہ

شاعری کا پیشہ ایسا ہے کہ اسے عمدگی سے نباہنے کے لیے وسیع مطالعے کی ضرورت ہے۔ شاعر اپنی زندگی کے چوبیس گھنٹے گویا امتحان کے کمرے میں ہوتا ہے، جہاں ہر کس و ناکس ممتحن ہے، اور شاعر کا فرض ہے کہ وہ ان سب کو اطمینان بخش جواب دے اور پیشانی پر بل تک نہ لائے۔ میرزا بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں تھے، بلکہ ان کی ذمہ داریاں بہت زیادہ تھیں۔ یہ آخری دور کی دلّی اپنی تمام بے سر و سامانی کے باوجود عجیب شان رکھتی تھی۔ چراغ بجھنے سے پہلے اس کی لَو بھڑک اٹھتی ہے۔ یہی حال یہاں بھی ہوا۔ یہاں اس زمانے میں اردو، فارسی کے مستند اساتذہ اور نقادانِ فن جمع ہو گئے تھے۔ پھر جتنا بڑا دعوی، اتنا ہی کڑا امتحان۔

۱۔ ایضاً

۲۔ اردوے معلّی: ۳۲۴؛ نیز ایضاً: ۱/۱، جہاں سفرِ رام پور کا حال بیان کیا ہے۔

۳۔ قطعہ نمبر ۱۹۔

میرزا کا دعویٰ یہ تھا کہ آج ہندستان بھر میں میرے برابر کا فارسی داں نہیں۔ "فارسی کی میزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے"۔[1] اس لیے ان کے کلام کو نظرِ غائر سے دیکھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ دوست اور مدّاح استفادے اور لطف اندوزی کے لیے دیکھتے، تو مخالف اور منکر، اس کی خامیاں دکھانے اور نکتہ چینی کے لیے۔ خوش قسمتی سے ابتدائے عمر میں انھیں ملّا عبدالصّمد کے سے فارسی اور عربی علوم کے ماہر استاد کی تربیت میسّر آگئی۔ لیکن تکمیل کے لیے وسیع مطالعے اور غور و فکر کی بھی ضرورت تھی، جو اپنے "زورِ بازو" ہی سے حاصل ہو سکتی تھی۔ میرزا کے کتنے ہی خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قدیم شاعروں کا کلام بہت غور اور توجہ سے دیکھا تھا۔ یہی سبب ہے کہ جب کبھی کسی نے ان کے کلام پر اعتراض کیا، آخر حق ان کی جانب ثابت ہوا اور اساتذۂ سلف کے کلام سے سند مل گئی۔ ان کی وسعتِ مطالعہ اور فارسی سے ازلی لگاؤ کا اندازہ اس واقعہ سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ ۱۰۔۱۱ برس کی عمر میں وہ ظہوری کا دیوان اتنی توجہ اور انہماک سے دیکھ چکے تھے، کہ انھوں نے اسے ایک اعتراض کے جواب میں بطورِ سند پیش کر دیا۔ ان کا یہ مطالعے کا شوق آخر تک قائم رہا۔ خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی سے روایت ہے[2] کہ جب میں ان کی زندگی کے بالکل آخری ایام میں ان کی ملاقات کو گیا ہوں، تو دیکھا کہ غالباً قاآنی کا مطالعہ کر رہے ہیں، حال آں کہ اس زمانے میں انھوں نے چلنا پھرنا ترک کر دیا تھا اور سارا سارا دن بستر پر لیٹے رہتے تھے، کانوں سے بالکل سنائی نہیں دیتا تھا، بینائی بھی بہت کمزور ہو گئی تھی اور پڑھنے کے لیے چشمہ لگانے کی ضرورت پڑتی تھی۔

شعر و شاعری کے علاوہ کہ یہ ان کا خاص موضوع تھا، انھیں قصّے کہانی کی کتابوں سے بھی دلچسپی تھی۔ جن دنوں داستانِ امیر حمزہ اور بوستانِ خیال ان کے مطالعے میں تھیں، بہت خوش تھے۔ دیکھیے میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں[3]: اور کیسے ایک ایک لفظ سے مسرّت ٹپک رہی ہے:

۱۔ اردوے معلّیٰ: ۳۶۱؛ خطوطِ غالب (۱): ۴۸ (تفتہ)

۲۔ اردوے معلّیٰ (دیباچہ: ط)

۳۔ اردوے معلّیٰ: ۱۴۴؛ خطوطِ غالب (۱): ۳۲۳

مولانا غالب علیہ الرحمۃ ان دنوں میں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی
کتاب امیر حمزہ کی داستان کی، اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستانِ خیال
کی آ گئی ہے۔ سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشک خانے میں موجود ہیں۔ دن
بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں، رات بھر شراب پیا کرتے ہیں:

کسے، کایں مرادش میسّر بود
اگر جم نہ باشد، سکندر بود

بلکہ یہ شوق اس حد تک تھا کہ کبھی کبھی وہ گھر پر داستان گویی کا سلسلہ بھی شروع کروا دیتے تھے۔ ان دنوں دوست احباب کا مجمع رہتا؛ یوں، ان کا شوق بھی پورا ہو جاتا اور گھڑی دو گھڑی دوستوں کے جمع ہو جانے سے رونق بھی ہو جاتی۔ اسی طرح کی داستان گویی کسی زمانے میں جمعرات اور جمعہ کو، ہفتے میں دو دن ان کے مکان پر ہوتی تھی۔ اسی کی اطلاع سالک کو ایک خط میں دیتے ہیں[1]:

گھر میں تمہارے سب طرح خیر و عافیت ہے۔ محمد میرزا[2] پنج شنبہ اور جمعہ کو
داستان کے وقت آ جاتا ہے۔ رضوان ہر شب کو آتا ہے۔

یہ اسی مطالعے اور شوق کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے نواب کلب علی خان کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا، جس کی تشبیب اور مدح میں حمزہ اور اس کی اولاد اور اس کے دوسرے افراد کا ذکر کیا ہے[3]۔

لیکن کتابوں سے متعلق ان کا اصول یہ تھا کہ بالعموم خریدتے نہیں تھے۔ ایک صاحب کا کاروبار ہی یہ تھا کہ لوگوں کو کتابیں کرائے پر مہیا کرتے تھے۔ میرزا بھی اسی سے کتابیں

۱۔ اردوے معلیٰ: ۲۳۷

۲۔ پورا نام محمد میرزا خان تھا، یہ قربان علی بیگ خان سالک کے بڑے بیٹے تھے۔ رضوان (شمشاد علی بیگ خان) سالک کے چھوٹے بھائی تھے۔

۳۔ مکاتیبِ غالب: ۱۴۴ (مکاتیب) یہ قصیدہ سبدچین میں شامل ہے (قصیدہ پنجم)

منگواتے اور مطالعے کے بعد واپس کر دیتے[1]۔ حافظہ قوی تھا، ایک دفعہ کا دیکھا ہوا ذہن میں محفوظ ہو جاتا تھا۔ اکثر دوست احباب انھیں اپنی تصنیفات ہدیہ دیتے رہتے تھے۔ اگر چاہتے، تو اچھا خاصا کتاب خانہ فراہم ہو جاتا لیکن انھوں نے کبھی کتاب اپنے پاس نہیں رکھی؛ جس نے مانگی، اس کی نذر کر دی۔ غدر کے زمانے میں ان کے پاس صرف چھاپے کی برہانِ قاطع اور دساتیر تھی۔ بعد کو یہ برہانِ قاطع بھی نواب علاء الدین احمد خان کو دے دی، اور صرف دساتیر ان کے پاس رہ گئی۔ اسے وہ اپنا "ایمان اور حرزِ جان" کہتے تھے اور کسی کو نہیں دیتے تھے[2]۔

کتابوں کے علاوہ اخبار بھی حتی الوسع دیکھتے رہتے تھے۔ اُن کے خطوں میں دلّی اور لکھنؤ اور آگرے اور کلکتے کے متعدد اخباروں کے نام ملتے ہیں۔ اس کے دو سبب تھے۔ چوں کہ وہ درباری تھے، اس لیے حکّام کی نقل و حرکت اور ان کی تقرری اور تبدیلی کے کوائف سے آگاہ رہنا چاہتے تھے؛ یہ خبریں ان اخباروں میں چھپتی رہتی تھیں۔ اگر اخباروں سے مطلوبہ خبر نہیں ملتی تھی، تو دوستوں سے پوچھتے کہ جو انھیں معلوم ہو، وہ خود، اور جو نہیں معلوم، وہ کسی اور جگہ سے دریافت کر کے لکھیں۔ دوسرے کبھی کبھی ان پرچوں میں ادبی نوک جھونک بھی ہوتی رہتی اور شعرا کے کلام پر تنقید و تقریظ چھپتی رہتی۔ وہ خود بھی ان دلچسپیوں میں حصہ لینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اس لیے ضرور تھا کہ وہ ان سے تعلق قائم رکھیں۔

خط و کتابت

یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ میرزا کی سی کامیاب خطوط نویسی بہت کم کسی کو نصیب ہوئی۔ اس میں ہرگز کسی طرح کا مبالغہ نہیں کہ ان کے خطوط اپنی طرز کی بے نظیر چیز ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان سے پہلے کسی نے خط لکھے نہیں، یا شائع نہیں کیے تھے۔ یہ بات نہیں، ایسے بیسیوں مجموعے موجود ہیں۔ ان سے پہلے کے جو خطوط ہمیں ملتے ہیں

۱۔ یادگارِ غالب: ۳۰

۲۔ اردوئے معلّی: ۳۲۲؛ خطوطِ غالب (۱): ۳۷۰

وہ تین بڑی قسموں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں: مراسلات اور منشیات اور ملفوظات۔ مراسلات وہ خطوط ہیں، جو شاہی درباروں کے پیشہ ور منشیوں نے لکھے تھے، جیسے ابو الفضل کے خطوط۔ منشیات وہ ہیں، جو زبان دان اور ادیب حضرات اپنی قادر الکلامی کے اظہار اور صنائع و بدائع کی مثالوں کے لیے لکھا کیے؛ انشائے خلیفہ، انشائے مادھورام وغیرہ ایسے کئی مجموعے ملتے ہیں۔ سب سے پہلے آخر ملفوظات، وہ مکتوبات ہیں، جو بعض صوفیۂ کرام اور بزرگانِ دین کے باقیاتِ صالحات میں سے ہیں۔ اس صنف میں مثلاً حضرت مجدد الف ثانی احمد سرہندی رح کی تحریریں پیش کی جاسکتی ہیں۔ لیکن ان تینوں میں سے آپ کو کسی میں بھی وہ چیز نہیں ملیگی جو غالب، کے خطوط کا طرّۂ امتیاز ہے۔ یہ خطوط، لکھنے والے کی زندگی اور کردار کا آئینہ ہیں۔ انھیں تصنّع اور آورد کی ہوا تک نہیں لگی۔ ان کے ایک ایک لفظ میں ایک زندہ شخصیت بول رہی ہے۔ یہی ان کی انفرادی خصوصیت ہے، اور جب تک یہ دونوں زبانیں بولی اور سمجھی جائینگی؛ ان کی اس خوبی کا اعتراف کرنے والے بھی موجود رہینگے۔

خلوص کے علاوہ اِن خطوط کی ایک اور خصوصیت ان کا طرزِ تحریر ہے۔ یہ ایسا بدیع اور دلفریب ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے، کوئی سامنے بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ خود میرزا بھی اپنے خطوط کی اس خصوصیت سے واقف تھے، اور انھوں نے کئی جگہ اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ انھوں نے پرانا اسلوبِ تحریر بہت ابتدائی زمانے میں ترک کر دیا تھا، یعنی جب انھوں نے ابھی اُردو میں لکھنا شروع بھی نہیں کیا تھا۔

بعض اصحاب نے لکھا ہے؎ کہ انھوں نے خطوط میں جو "صاف اور سادہ طریقہ اختیار کیا،" یہ ان کے سفرِ کلکتہ کا اور یہاں انگریزی اسلوب سے تعارف کا نتیجہ تھا؛ یہ غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کلکتے جانے سے پہلے ہی اس سادہ طرزِ مکاتبت کے موید اور خطوط نویسی کے پرانے اسلوبِ تحریر کے مخالف تھے۔ ۱۸۲۵ء میں انھوں نے پنج آہنگ کا آہنگِ اوّل لکھا، تو اس میں القاب و آداب کے کلمات جمع کیے،

؎ مثلاً نقشِ آزاد (مولانا ابو الکلام آزاد) : ۲۷۸

اس کے شروع میں لکھتے ہیں[1]:

ادا شناس داند کہ ہنجارِ من در نگارش اینست کہ چوں کلک و ورق بکف گیرم، مکتوب الیہ را بلفظے کہ فراخورِ حالتِ اُوست، سر آغازِ صفحہ آواز دہم، ذرمزمہ سنج مدّعا گردم۔ القاب و آداب و خیرت گوئی و عافیت جوئی حشو و زائد ست دیختگاں حشو را دفع نہند۔ و نیز دانا شناسد کہ دریں باب چہ ساحری تواں کرد، و دریں شیوہ گنجایشِ سخن گستری تا کجاست۔

اور یہ محض نظریے ہی کی حد تک نہیں تھا، وہ بہت حد تک عمل بھی اسی پر کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۲۸ء میں کلکتے سے مولوی محمد علی خان صدر امین باندہ کو لکھتے ہیں[2] کہ میں چاہتا ہوں تحریر، تقریر سے کم نہ ہو۔ بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ قلم ہاتھ میں لیا، تقدیم و تاخیر سے قطع نظر، مدّعا پیشِ نظر رکھتا ہوں اور درازیِ سخن سے بےفکر باتیں کرتا چلا جاتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پرانے ڈھنگ کے لمبے لمبے القاب و آداب نہیں لکھتے۔ شروع میں ایک آدھ لفظ ایسا لکھا، جو مخاطب کے حسبِ حال اور اسے متوجہ کرنے والا ہو جیسے پیر و مرشد، حضرت، بھائی، یار، برخوردار؛ اور اس کے بعد مطلب کی ضروری باتیں سپردِ قلم کر دیں۔

اس ضروری اصلاح کو فارسی میں رائج کرنا بہت مشکل تھا کیوں کہ ان کے مخاطب بیشتر پُرانی طرز کے بزرگ اور لکیر کے فقیر، روایت پرست حضرات تھے۔ یہ لوگ صدیوں سے ایک خاص پُرتکلف طرزِ مکاتبت کی پیروی کرتے آ رہے تھے: انھیں کسی اصلاح کے قبول کرنے یا خود اس پر عمل کرنے پر آمادہ کر لینا محال تھا لیکن اس کے باوجود ان کے فارسی خطوط دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہاں بھی بہت حد تک کامیاب رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ہر جگہ عبارت آرائی اور حشو و زوائد سے اپنا دامن نہیں بچا سکے، کیونکہ ان کے لیے مکتوب الیہ کے مذاق اور

۱۔ کلیاتِ نثر: ۵

۲۔ کلیاتِ نثر: ۱۶۹

افتادِ طبع کی رعایت ضروری تھی؛ لیکن پھر بھی ایسے خط جو سادگی اور بیساختگی سے بالکل عاری ہوں، بہت ہی کم ہیں۔

اس کے مقابلے میں چوں کہ انھوں نے اردو میں خطوط نویسی بہت بعد کو شروع کی، اور یہاں ان کے مخاطب عام طور پر نوجوان طبقے کے لوگ یا عزیز شاگرد تھے، اس لیے وہ اس تبدیلی پر نہ صرف یہ کہ معترض اور چیں بجبیں نہیں ہوئے، بلکہ کسی حد تک خود ان کے معاون بن گئے اور فرمائشیں کر کر کے ان سے یہ خط لکھواتے رہے۔

عموماً وہ خط لکھنے میں ابتدا نہیں کرتے تھے، لیکن اگر کہیں سے خط آجاتا، تو اس کا جواب ضرور لکھتے۔ غدر سے پہلے، جب وہ قلعے میں ملازم تھے، بالعموم ان کا صبح کا وقت دربار میں گزرتا تھا۔ وہاں سے دوپہر کو واپس مکان پر آتے۔ کھانا کھانے کے بعد ظفر کی غزل بناتے[1]۔ اس کے بعد جو وقت بچتا، اس میں دوستوں کے خطوں کے جواب لکھتے۔ لیکن غدر میں ان کی دنیا سمٹ سمٹا کر گھر کی چار دیواری تک رہ گئی تھی، اس لیے وہ اپنا بیشتر وقت خط لکھنے میں گزارنے لگے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں[2]:

> میں تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں، یعنی جس کا خط آیا، میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا، جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آرہتے ہوں؛ بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے، ایک دو صبح کو اور ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے؛ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گذر جاتا ہے۔

میرزا کا خط نستعلیق شفیعا آمیز نہایت دلکش اور شیریں ہے۔ وہ خوش خط ہونے کے باوجود بہت "زود نویس اور تیز دست" تھے[3]۔ ان کے جو خط چھپ چکے ہیں، حال آں کہ

۱۔ اردوئے معلّیٰ: ۴۸ ہم؛ خطوطِ غالب (۱): ۲۵۷ (قدر)

۲۔ اردوئے معلّیٰ: ۵۹؛ خطوطِ غالب (۱): ۹۱ (بنام تفتہ)

۳۔ یادگارِ غالب: ۷۰-۷۱

انھیں لکھے سو سوا سو سال یا اس سے بھی زیادہ گذر چکے ہیں، وہ آج بھی پہلے دن کی طرح روشن اور نظر افروز ہیں۔ وہ خطوں کی نقل نہیں رکھتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ جب ان کے چھاپنے کا فیصلہ ہوا تو انھیں دوستوں سے ان کی نقل طلب کرنا پڑی۔ غدر کے دنوں میں اگر خالی وقت ہوتا، تو وہ اپنے استعمال کے لیے لفافے گھر پر بنا لیا کرتے تھے۔ منشی شیو نرائن اکبر آبادی کو معلوم ہوا، تو انھوں نے خیال کیا کہ وہ بچت کے خیال سے ایسا کرتے ہیں اس لیے انھوں نے اپنے مطبع میں لفافے چھاپ کر ان کی خدمت میں بھیج دیے۔ ان پر ازمقام .... درمقام ..... تاریخ ...... ماہ ..... وغیرہ چھپا ہوا تھا میرزا ان تصنعات اور قیود سے کوسوں دور بھاگنے والے، انھوں نے ایک بار تو ان کی خاطر سے لفافے رکھ لیے کہ وہ بُرا نہ مانیں، البتہ خود استعمال نہیں کیے اور دوستوں میں تقسیم کر دیے۔ لیکن جب دوبارہ انھوں نے اسی طرح چھاپ کر ارسال کیے، تو اب کے میرزا نے یہ لکھتے ہوئے واپس کر دیے کہ صاحب، مجھے اس "ازمقام، درمقام" سے الجھن ہوتی ہے، یہ چھپے ہوئے لفافے مجھ سے لے لو اور ان کی جگہ سادہ لفافے بھیج دو۔[1]

انھیں اس بات کا بہت خیال رہتا تھا کہ ایسا نہ ہو خط کہیں راستے میں گم ہو جائے اور مکتوب الیہ تک پہنچے ہی نہیں۔ اس کا علاج انھوں نے یہ سوچا تھا کہ اگر خط میں کوئی ضروری اور اہم بات ہوئی، تو اسے بیرنگ بھیج دیتے۔ دوستوں کو بھی یہی مشورہ دیتے کہ ضروری خط بیرنگ بھیج دیا کریں، آدھ آنہ نہ سہی، ایک آنہ سہی۔ ایک دوست کو لکھتے ہیں:[2] "ہر مہینے میں آٹھ (بیرنگ) خط تک، بلکہ سولہ خط تک سے میں نہ گھبراؤں گا۔"

تصنیف و تالیف و شعرگوئی

میرزا کی نثر کی اکثر کتابیں مثلاً کلیاتِ نثر فارسی، قاطعِ برہان، اردو خطوط کے مجموعے محض حسنِ اتفاق سے مرتب ہو گئے۔ قصد سے انھوں نے صرف دستنبو اور مہر نیم روز اور اردو کے دو ایک رسالے لکھے۔

۱۔ اردوے معلیٰ ص ۲۵۹؛ ایضاً ۲۷۰-۲۷۱؛ خطوطِ غالب (۱): ۴۱۹ و ۴۲۲ (شیو نرائن کے نام)

۲۔ اردوے معلیٰ ۴۴؛ خطوطِ غالب (۱): ۲۵۷ (بنام قدر)

انھوں نے ابتدا میں تھوڑی مدت تک اسد تخلص کیا۔ چناں چہ جب تک وہ آگرے میں رہے، بلکہ قیامِ دہلی کے ابتدائی زمانے میں بھی، اسد تخلص کرتے رہے۔ پھر اس کے بعد اگرچہ حسبِ ضرورت انھوں نے پھر بھی یہ تخلص استعمال تو کیا، لیکن بالعموم اسے ترک کر دیا۔ روایت ہے[۵] کہ کسی نے ان کے سامنے میر امانی اسد (شاگرد سودا) کا یہ مطلع پڑھا:

اسد! اس جفا پر بتوں سے وفا کی

مرے شیر! شاباش، رحمت خدا کی

اور کہا، آپ نے یہ شعر خوب کہا ہے اور اس کی بہت تعریف کی۔ میرزا کو ان جفا اور وفا، بت اور خدا، اسد اور شیر کے تلازموں سے دلی نفرت، بہت جھلائے اور اس شخص کو جواب دیا کہ صاحب! اگر یہ شعر میرا ہے، تو مجھ پر خدا کی لعنت، اور اگر کسی اور کا ہے تو اس پر بقول اس کے واقعی خدا کی رحمت ہو۔ غالباً کچھ اسی قسم کے التباس سے بچنے کے لیے انھوں نے اسد ترک کر کے غالب تخلص اختیار کیا۔ یقیناً اس کی طرف ان کی رہنمائی حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے لقب "اسد اللہ الغالب" نے کی ہوگی۔

فکرِ شعر میں کبھی عام شاعروں کی روش اختیار نہیں کی۔ اور شاعروں کی طرح یہ نہیں کہ کسی استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا، یا اس کے قوافی لکھ لیے اور ان قافیوں میں لکھنے لگے، بلکہ وہ عموماً بحر اور ردیف ذہن میں رکھ لیتے، اور شعر کہنا شروع کر دیتے تھے۔

ان کے نزدیک شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں۔ یہی سبب ہے کہ عام طور پر ان کی غزلیں لمبی نہیں۔ ان کے ہاں پندرہ سولہ بیت کی غزل شاذ و نادر ہوتی ہے، بالعموم دس بارہ شعر سے زیادہ نہیں ہوتے۔ یہ درست ہے کہ وہ تلمیذ الرحمٰن تھے اور انھوں نے اپنا کلام کسی کو بغرضِ اصلاح نہیں دکھایا؛ لیکن ان کے دیوان کے جو قدیم نسخے

---

۵ اردوئے معلّٰی: ۲۷۴-۲۷۵؛ خطوطِ غالب (۱): ۴۳۷ (شیو نرائن) نیز دیکھیے آب حیات: ۶۲۵؛ یادگارِ غالب: ۱۳۰؛ نگار (رام پور)، فروری ۱۹۶۳ء: ۹ (یہاں شعر ذرا مختلف لکھا ہے)۔

دریافت ہوئے میں، جن میں سے ایک ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے خود بنظرِ اصلاح دیکھتے اور اس میں ضروری ردّ و بدل کرتے رہتے تھے۔

مولانا حالی نے ان کی شعرگوئی سے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس سے ان کی قادر الکلامی اور قوتِ حافظہ دونوں کا ثبوت ملتا ہے۔ فرماتے ہیں[1]:

> فکرِ شعر کا یہ طریقہ تھا کہ اکثر رات کو عالمِ سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے، اور جب کوئی شعر سرانجام ہو جاتا تھا، تو کمربند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے۔ اسی طرح آٹھ آٹھ، دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار قلم بند کر لیتے تھے۔

وہ مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ ان کے فارسی اور اردو خطوں سے ان کا مشاعروں میں جانا ثابت ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں اجمیری دروازہ کے باہر غازی الدّین خان کے مدرسے (موجودہ دلّی کالج) میں ہر مہینے مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ پھر غدر سے پہلے شیفتہ اور آزردہ ایک مدّت تک التزام سے اپنے ہاں مشاعرے کرتے رہے۔ قلعے میں بھی مشاعرے ہوا کرتے تھے، جن میں خود بہادر شاہ ظفر بہت دلچسپی لیتے اور اپنا کلام بھی بھیجتے تھے۔ میرزا اکثر ان مشاعروں میں جاتے اور اپنا طرحی اور غیر طرحی کلام سناتے۔ وہ داد دینے والوں کا شکریہ نہایت متانت بلکہ کسی حد تک تمکنت سے ادا کرتے۔ ان کے رویّے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے اپنا جائز حق سمجھتے ہیں اور داد دینے والا ان پر کوئی احسان نہیں کر رہا ہے۔ پڑھنے میں ان کی آواز بلند اور مترنم اور دلکش ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے سامنے قصیدہ پڑھا، تو ظفر نے ان کے پڑھنے کی تعریف کی اور کہا، "میرزا تم پڑھتے خوب ہو"۔ ظفر کے اس فقرے پر میرزا نے جو کچھ کہا ہے[2]، اس کے سمجھنے میں اکثر لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ انھوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے گویا میرزا نے اس بات کا فخریہ ذکر کیا ہے حالانکہ حقیقت میں وہ اسے حسرت سے بیان کر رہے ہیں کہ لے دے کے میرے پڑھنے

۱۔ یادگارِ غالب: ۷۶

۲۔ یادگارِ غالب: ۱۰۴

کی تعریف کر دی، اور کلام کی بلندی اور خوبی کا اندازہ نہیں کیا۔

شاعری کی ایک صنف سے وہ بہت گھبراتے تھے۔ ان کے کلام میں تاریخیں ملتی ہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ ان کی طبیعت کو فنِ تاریخ و معمّا سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔ وہ اسے بہت گھٹیا قسم کی شاعری سمجھتے تھے[1]۔ عام طور پر دوسروں کے دیے ہوئے مادّے نظم کر دیا کرتے تھے[2]۔ جہاں دو چار جگہ ان کے کلام میں بے تکلف مادّۂ تاریخ ملتا ہے، یہی سمجھنا چاہیے کہ یہ کسی اور کا بتایا ہوا ہے۔ ورنہ جب بھی انھوں نے خود مادّۂ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، ایسے ایسے عجیب و غریب تعمیے اور تخرجے بہم پہنچائے ہیں کہ ان سے واقعی مضحکہ خیز صورت پیدا ہو گئی ہے۔

شاعر کو اپنے کلام کے محفوظ اور مدوّن کرنے کا کس قدر خیال ہوتا ہے مگر حیرت ہوتی ہے کہ میرزا نے ابتدائی چند برس کے بعد کبھی اپنا کلام اپنے پاس نہیں رکھا، نہ کوئی بیاض ہی اس کے لیے بنائی۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں اور میرزا ذوالفقار الدین حیدر خاں عرف ناظر حسین میرزا نے ان کی نظم و نثر محفوظ کرنے کا التزام کر رکھا تھا۔ دونوں حضرات نے ان کے کلام کے قلمی نسخے بہت اہتمام سے تیار کروائے تھے۔ جب غدر ہوا اور ان دونوں کے گھر لٹے، تو کتابخانے بھی ورق ورق ہو گئے؛ ان کے ساتھ میرزا کے دیوان اور مصنّفات بھی ضائع ہو گئے[3]۔ ان کے متعدد خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غدر کے بعد جب تک دیوان پھر سے نہیں چھپا، ان کے پاس اپنا کوئی کلام نہیں تھا۔ کوئی شخص کہیں سے کوئی غزل لکھوا لاتا، تو وہ اس کا شکریہ ادا کرتے اور اس کے ممنونِ احسان ہوتے۔

مدح

اگرچہ ان کا کلام تمام اصنافِ سخن میں موجود ہے اور وہ بہت حد تک ہر جگہ کامیاب بھی ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کا اصلی میدان قصیدہ اور غزل ہے۔ اردو کلام میں قصیدے

۱۔ اردوے معلّیٰ: ۸۳؛ خطوطِ غالب (۱): ۵۷ (تفتہ)

۲۔ اردوے معلّیٰ: ۳۲۱؛ خطوطِ غالب (۱): ۳۶۰ (علائی)

۳۔ اردوے معلّیٰ: ۱۵۱ (صاحب عالم)؛ نیز ۱۹۳۔۱۹۴ (مہر)؛ خطوطِ غالب (۱): ۲۵۴ (مہر)

بہت کم ہیں۔ البتہ فارسی میں ان کی بہت بڑی تعداد ہے۔ سب سے زیادہ یعنی پندرہ قصیدے بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں۔ بارہ، حمد و نعت و منقبت میں ہیں، چار نواب محمد یوسف علی خاں اور تین ان کے جانشین نواب کلب علی خاں کی مدح میں، تین قصیدے ملکہ وکٹوریہ کے لیے اور سترہ ہندستان کے مختلف وایسرایوں اور صوبوں کے گورنروں اور حکومتِ ہند کے سکتروں وغیرہ کے لیے لکھے گئے ہیں[1]۔ ان کے علاوہ بعض اور رؤسا اور احباب کی مدح میں بھی ان کے قصیدے موجود ہیں۔ انگریز حکّام کی مدح میں قصیدوں پر کئی اصحاب نے اعتراض کیا ہے، لیکن ان کے بارے میں ایک بات یاد رکھنا چاہیے کہ میرزا درباری تھے اور دربار میں ان کی نذر اشرفی، دو اشرفی نقد نہیں، بلکہ یہی قصیدہ ہوا کرتا تھا۔ پس جتنے وایسراؤں اور گورنروں کے درباروں میں وہ شامل ہوئے ہونگے، ان میں لازمًا انھوں نے قصیدہ پیش کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جس وایسرائے کے دربار میں وہ شامل نہیں ہوئے، اس کے لیے قصیدہ بھی نہیں لکھا۔ مثلاً لارڈ ڈلہوزی نے اپنے آٹھ سال کے دورِ حکومت (۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۶ء) میں ایک مرتبہ بھی دلّی میں دربار نہیں کیا؛ چنانچہ ان کی مدح میں قصیدہ بھی نہیں ملتا۔ ایک اور بات بھی مدّنظر ہے کہ ان کی پنشن کا مقدمہ لمبی مدّت تک جاری رہا؛ حکومتِ ہند کے سکتّروں کے قصیدے بیشتر اسی سلسلے میں لکھے گئے تھے۔

ان کے قصیدوں کی تشبیب یا تمہید بہت شاندار اور پُرشکوہ ہوتی ہے اور اس میں وہ اپنا پورا زورِ کلام صرف کر دیتے ہیں۔ گریز عمومًا بہت پُرلطف اور بیساختہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد مدح بہت کم اور مختصر، اور اخیر میں دو ایک شعر میں دعا پر وہ قصیدہ ختم کر دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ وہ شاعر ہیں اور مدح بھی کرتے ہیں، لیکن ایک آدھ جگہ کو چھوڑ کر ان کی مدح میں بیجا غلو اور اغراق کہیں نہیں ملتا۔ جیسا انھوں نے خود ایک

۱۔ یہاں یہ تعداد موجودہ مطبوعہ کلیات کے مطابق دی گئی ہے؛ اور اس سے بحث نہیں کہ ان میں سے بعض قصیدے پہلے کسی اور ممدوح کی مدح میں تھے اور پھر حسبِ ضرورت کسی اور کے نام کر دیے گئے۔ (اس سلسلے میں دیکھیے میرا مضمون: "غالب کے فارسی قصیدے"، نقوش (لاہور)، مارچ ۱۹۶۳ء)

جگہ لکھا ہے، وہ بیشتر ضرور ہیں لیکن "فقیرِ متکبر" مثلاً غدر کے بعد جتنے عرصے تک اُن کا دربار بند رہا، انھوں نے کسی انگریز کی مدح میں قصیدہ نہیں کہا! اس سے متعلق اپنے خاص انداز میں نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:

گورنمنٹ کا بھاٹ تھا، بھٹئی کرتا تھا، خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف، بھٹئی متروک۔

یعنی انگریز کی قصیدہ خوانی، دربار و خلعت سے وابستہ اور لازم و ملزوم تھی، ورنہ وہ اپنے آپ کسی ستائش یا صلے کی خواہش سے یہ قصیدے نہیں لکھا کرتے تھے۔

ہجو

خلاقِ معانی، کمال اسمٰعیل اصفہانی کی رائے میں جو شاعر ہجو گو نہیں، یا کم از کم ہجو کہنے پر قادر نہیں، وہ اس شیر سے مشابہ ہے، جو چنگال و دندان نہ رکھتا ہو، یعنی دیکھنے میں وہ شیر ہے لیکن چونکہ مخاطب کو معلوم ہے کہ وہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، اس لیے وہ نہ اس سے ڈرتا ہے، نہ اس کی قدر کرتا ہے۔ اسی باعث مدح و ہجو کا شروع سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ ہجو، مدح گو شعراء کا ہتھیار حربہ ہے۔ ممدوح جانتا ہے کہ اگر صلہ نہ دیا، تو شاعر کے ترکش میں ایسے تیر بھی موجود ہیں، جن کے سوفار زہر میں بجھے ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ مدح پر انعام دے کر اس بلا کو ٹالنے کی کوشش کرتا ہے۔

انوری نے اس مضمون کو نہایت لطیف پیرایے میں لکھ کر اپنے ممدوح کی خدمت میں بھیجا تھا۔ کہتا ہے:

سہ بیت رسم بود، شاعرانِ طامع را — یکے مدیح و دگر قطعۂ تقاضائی
اگر بداد، سوم شکر، ور نداد، ہجا — ازیں سہ بیت، دو گفتم، دگر چہ فرمائی

یعنی مدح گو اور انعام کے خواہش مند شاعر تین قسم کا کلام کہتے ہیں۔ اوّل قصیدہ، پھر صلہ کے لیے تقاضا۔ اس کے بعد اگر انعام مل گیا، تو شکریہ ورنہ ہجو۔ میں ان میں سے پہلے دو لکھ چکا ہوں، اب تیسرے سے متعلق ارشاد ہو کہ کون سا لکھوں۔

ے اردوئے معلّیٰ: ۳۲۲؛ خطوطِ غالب (۱): ۳۷۰

میرزا کا دامن اپنے کسی ممدوح کی ہجو سے ملوّث نہیں ہوا۔ البتہ وہ تقاضے کی حد تک ضرور گئے ہیں۔ انھوں نے نواب وزیرالدّولہ رئیسِ ٹونک کی مدح میں قصیدہ[1] لکھا لیکن جب اُدھر سے صلہ ملنے میں دیر ہوئی، تو انھوں نے ایک بہت دلچسپ قطعہ[2] لکھا، جس میں انعام نہ پہنچنے کی یہ توجیہہ کی ہے کہ ممدوح مختلف دیار و امصار سے انعام کے لیے اشیا جمع کر رہا ہے: دمشق سے دیبا اور روم سے مخمل، دکن سے ہاتھی اور عراق سے گھوڑے، نیشاپور سے فیروزہ اور بدخشاں سے یاقوت، علیٰ ہذا القیاس۔ اب جب تک یہ سب چیزیں جمع نہ ہولیں، وہ انعام کیسے بھیج سکتا ہے! قطعے کے آخر میں تقاضا ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرزا ہجو کرنا جانتے نہیں۔ ان کے کلیات میں تین چار مختصر ہجویں ہیں۔ لیکن جس طرح ان کی مدح عام طور پر بیجا مبالغے سے خالی ہے، اسی طرح ایک آدھ استثنا کو چھوڑ کر ان کی ہجو بھی فحش گوئی تک نہیں پہنچی۔ ایک دشمن نے انھیں نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کی تھی، اسے مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہم چو تو ناقابلے، در صُلبِ آدم دیدہ بود
زاں سبب ابلیسِ ملعون، سجدہ بر آدم نکرد[3]"
حاشا للہ، بودنت، در صُلبِ آدم تہمت است
پیشِ ہر کس گفتم ایں اندیشہ، باور ہم نکرد

شاعر کہتا ہے کہ چوں کہ تیرے جیسا ناشدنی صُلبِ آدم میں موجود تھا، اس لیے شیطان کو جب یہ معلوم ہوگیا، تو اس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ غالب اس پر اضافہ کرتے ہیں: خدا نہ کرے، یہ آدم پر تہمت ہے کہ تو ان کے صُلب سے پیدا ہوا ہے۔ میں نے جس کسی سے اس خیال کا اظہار کیا، اس نے بھی میری تائید کی اور یہ بات باور نہیں کی۔

۱۔ قصیدہ ۵۲ (کلیاتِ غالب، نظم فارسی)

۲۔ قطعہ ۲۲ (سبد چین): ۴۶۔۴۷

۳۔ یہ شعر کسی اور کا ہے، میرزا نے اسے تضمین کیا ہے۔

محرقِ برہانِ قاطع کے مصنف منشی سعادت علی کی ہجو میں بھی انھوں نے ایک رباعی کہی ہے ۔ اسی طرح ایک فحش رباعی سبد چین کی پہلی اشاعت میں تھی ۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ کس کے خلاف کہی گئی تھی ۔ (اسی فحش کی بنا پر میں نے اسے اشاعتِ ثانی سے حذف کر دیا تھا)

ظرافت

میرزا اگر شاعری کا ذوق اور فارسی زبان سے مناسبت ازل سے اپنے ساتھ لائے تھے، تو ظرافت بھی گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی ۔ ان کی کوئی بات لطیفے اور چٹکلے سے خالی نہیں ہوتی تھی ۔ غور سے دیکھا جائے تو ان کی زندگی کسی صورت میں بھی ایک خوشحال اور مطمئن زندگی نہیں کہی جا سکتی ۔ ساری عمر ان کی مخالفت ہوتی رہی؛ شروع میں فنِ شعر میں "جدتوں اور بدعتوں" کی وجہ سے، اور آخر میں قاطع برہان کی تصنیف کے باعث ۔ بہادر شاہ کے دربار میں کیا کچھ گزری، تو یہ معلوم کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی یقینی ذریعہ تو نہیں، لیکن سہروں کے واقعے نے اس کے ایک گوشے سے بھی نقاب الٹ دی ہے ۔ اُن کے متعدد فارسی قطعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالف (یعنی ذوق کے حلیف) ان کے اردو کلام پر اعتراض کرتے رہتے تھے ۔ بغرض یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہاں بھی ان کے خلاف ریشہ دوانیاں ہوتی رہتی تھیں ۔ یہ تو رہا ذہنی پہلو ۔ مادی لحاظ سے بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فارغ البال تھے ۔ بس یوں خوش و ناخوش، انھوں نے گذارنے کو تو گزار دی، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ وہ اطمینان اور بےفکری، جو روح اور دل و دماغ کی غذا ہے، اور انسان کی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتی، اور انھیں جلا دیتی ہے، انھیں بہت کم نصیب ہوئی عمر بھر انھیں نہ تو ذہنی سکون میسر ہوا، نہ مادی اطمینان ۔ ایسے حالات کا لازمی نتیجہ افسردگی اور دل گرفتگی ہوا کرتا ہے ۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں :

واسطے فکرِ مضامینِ متیں کے غالبؔ! چاہیے خاطرِ جمع و دلِ آرامیدہ

ایک اور جگہ کہا ہے :

شعر کی فکر کو، اسدؔ! چاہیے ہے دل و دماغ
عذر کہ یہ فسردہ دل، بے دل و دماغ ہے

۱۔ لطائفِ غیبی : ۱۵ ۔

اس لیے یہ واقعی تعجب کا مقام ہے کہ ایسے داخلی اور خارجی ماحول میں بھی ان کی طبیعت کی شگفتگی مرتے دم تک قائم رہی اور ان ایام میں بھی جب وہ چاروں طرف سے ہر طرح کے آلام میں گھر ہوئے تھے، انھوں نے کسی خاص کدورت کا اظہار نہیں کیا۔

مولانا حالی نے سچ فرمایا ہے[۵] کہ انھیں "حیوانِ ناطق" کی جگہ "حیوانِ ظریف" کہا جائے تو بجا ہے۔ ظرافت ان کی فطرت کا جزوِ اکبر تھا۔ چوں کہ دماغ نہایت تیزی سے کام کرتا تھا، اس لیے فوراً کچھ نہ کچھ سوجھ جاتی تھی؛ اور جب کوئی بات ذہن میں آجاتی، تو پھر وہ اسے کہنے سے رک نہیں سکتے تھے، مخاطب خواہ کوئی ہو۔ وہ ظفر اور ناظم تک سے تو چوکتے نہیں تھے، اور کسی کا کیا ذکر ہے!

گفتگو

جانسن کا قول ہے کہ کامیاب بات چیت کرنے کے لیے سب سے پہلے علم کی ضرورت ہے، جو گویا خام مادے کا حکم رکھتا ہے جس سے یہ عمارت تیار ہوتی ہے۔ اس کے بعد صاحبِ گفتگو کو زبان میں مہارت اور الفاظ پر قدرت درکار ہے۔ تیسری چیز تخیل اور پروازِ فکر ہے تاکہ وہ معمولی سی بات کو بھی لے اُڑے اور اُسے غیر معمولی طور پر پیش کر سکے؛ اور سب سے اخیر قوتِ ارادی اور مستقل مزاجی کہ وہ ناکامی سے گھبرانے کا نام نہ لے۔ جس شخص میں یہ چاروں صفتیں ہونگی، وہ کسی مجلس میں کبھی ہیٹا نہیں رہیگا۔

غالب میں ان چاروں خصوصیتوں کا بہرۂ وافر موجود ہے۔ علم، زبان پر قدرت، تخیل، استقلال، کسی چیز کی ان کے ہاں کمی نہیں، بلکہ فطری ظرافت ان کے پاس ایک اضافی چیز ہے۔ اس سے ہم آسانی سے خیال کر سکتے ہیں کہ وہ کیسے کامیاب "باتونی" رہے ہونگے۔ افسوس کہ انھیں کوئی بوسویل نہ ملا، جو ان کی تمام باتوں کو قلمبند کر لیتا۔ پھر بھی آزاد اور حالی کے ذریعے سے ان کے جو خیالات اور لطیفے ہم تک پہنچے ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس میدان کے بھی شہسوار تھے۔

یہاں ایک اور بات بھی لکھ دینا چاہیے۔ ظرافت اور مزاح کے عادی ہونے کی وجہ

---

۵ یادگارِ غالب: ۸۰

سے وہ بسا اوقات گفتگو میں کوئی ایسی بات کہہ جاتے ہیں، جو درحقیقت ان کی اصلی رائے نہیں ہوتی۔ اگر اسی مسئلے سے متعلق ان کی تحقیقی رائے دریافت کی جائے، تو وہ کچھ اور کہینگے۔ اس سے بعض اصحاب کو دھوکا ہوا ہے؛ اور انھوں نے اسے ان کی "غلطی" یا "قوتِ فیصلہ کے فقدان" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تحقیق اور مزاح میں فرق ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ ہے۔ مثال کے طور پر ان کا ایک لطیفہ لیجیے۔ کسی مجلس میں رتھ کی تذکیر و تانیث سے متعلق گفتگو ہوئی، تو انھوں نے لطیفہ چھانٹا[1] کہ اگر اس میں عورتیں بیٹھی ہوں، تو مؤنث کہو اور اگر مرد ہوں، تو مذکّر۔ ظاہر ہے کہ یہ محض مذاق ہے؛ اور اسے کوئی شخص مذاق سے زیادہ وقعت دیگا بھی نہیں۔ لیکن جب اسی بارے میں میر مہدی حسین مجروح نے ان سے دریافت کیا، تو اب انھیں تحقیقی جواب دینا پڑا[2] کہ رتھ میرے نزدیک مذکّر ہے۔ اس پر اعتراض وہی کریگا جس کی سنجیدگی مرض کی حد تک پہنچی ہوئی ہے، یا جسے خواہی نخواہی اعتراض ہی کرنا منظور ہے۔ دراصل غیر سنجیدہ اور ہنگامی گفتگو کے موقع پر موضوع کے صحیح یا غلط ہونے کا خیال نہیں ہوا کرتا، بلکہ اس وقت گرمیِ محفل اور اپنی قدرتِ کلام اور حاضر جوابی کا اظہار مقصود ہوتا ہے، حال آں کہ کہنے والے کی ذاتی رائے کچھ اور ہوتی ہے، اور حاضرینِ مجلس بھی یہ جانتے ہیں۔

غرض کہ قرائن سے یہ حتمی طور پر ثابت ہے کہ میرزا ایک اچھے "باتونی" تھے۔

رشتہ داروں سے محبّت

میرزا کا اپنا خاندان بہت مختصر تھا، لے دے کے ایک بھائی اور ایک بہن۔ بہن کی شادی بھی بہت کم سنی میں ہوگئی اور وہ اپنے گھر بار والی ہوگئی تھیں۔ بھائی میرزا یوسف غالباً انھی کے ساتھ آگرے سے دلّی چلے آئے تھے، یا شاید کچھ مدّت بعد آئے ہوں یہ بھی ممکن ہے، کہ وہ شروع میں انھیں کے پاس مقیم بھی رہے ہوں۔ چوں کہ انھیں بھی ساڑھے سات سو سالانہ پنشن کے ملتے تھے، اس لیے بسر اوقات کے لیے انھیں کوئی

۱۔ یادگارِ غالب : ۳۹

۲۔ اردوے معلّیٰ : ۳۹۵ ؛ خطوطِ غالب (۱) : ۳۳۶

کام کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی شادی فراش خانہ (دلّی) میں ایک سیّدوں کے خاندان میں ہوئی تھی۔ اولاد میں صرف ایک صاحب زادی عزیزالنسا بیگم تھیں، جو میرزا علی بخش خان کے صاحب زادے غلام فخرالدّین سے منسوب تھیں۔[۵]

غالب کو بھائی سے کس قدر محبت تھی، اس کا اندازہ ان کی متعدد تحریروں سے ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ بیمار ہو گئے، تو ان کے غسلِ صحت پر لکھا:

دی مرے بھائی کو حق نے، از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے، غالب! یوسفِ ثانی مجھے

غدر کے زمانے میں وہ ان سے الگ مکان میں رہتے تھے۔ ان ایام میں میرزا ان سے متعلق بہت فکرمند اور مضطرب تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح انھیں اپنے ہاں لے آئیں، لیکن حالات کچھ ایسے تھے کہ وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اسی دوران میں میرزا یوسف نے وفات پائی۔ اس حادثے کا ذکر کرتے ہوئے، انھوں نے دستنبو میں جن دردناک جذبات کا اظہار کیا ہے، اس سے صاف عیاں ہے کہ انھیں بھائی کی موت سے کتنا صدمہ ہوا۔ اسی طرح جہاں کہیں انھوں نے اپنے بھانجوں کا ذکر کیا ہے، نہایت محبّت سے۔ وہ ہمیشہ ان کی خیر و عافیت کے طلبگار رہے۔

پنشن کے معاملے میں انھیں نواب احمد بخش خان اور ان کے جانشین شمس الدین احمد خان، دونوں سے جائز شکایت اور رنجش تھی، لیکن اس کے باوجود انھوں نے نہایت عالی ظرفی کا ثبوت دیا اور ان واقعات کی ناخوشگوار یاد کو خاندان کے باقی افراد سے تعلقات کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ سُسرال کا خاندان گویا ان کا اپنا خاندان بن گیا، بالخصوص امین الدین احمد خان اور ضیاء الدین احمد خان سے ان کے تعلقات بالکل برادرانہ تھے اور انھوں نے ساری عمر، نہایت وفاداری اور بے جگری سے ان دونوں بھائیوں کا اور ان کی اولاد کا دُکھ سُکھ میں ساتھ دیا؛ ضیاء الدین احمد خان کی تو تعلیم و تربیت بھی بہت حد تک، انھیں کی نگرانی میں ہوئی۔ ان دونوں کے علاوہ، اس خاندان کے اکثر دوسرے نوجوان بھی ان کے شاگرد اور تربیت

---

[۵] ان کے حالات کے لیے دیکھیے میرا مضمون: "میرزا یوسف" مشمولہ "فسانۂ غالب"

یافتہ تھے[1]۔ یہ سب بھی ان کا حد درجہ ادب کرتے تھے اور ان کی حیثیت کسی طرح خاندان کے بزرگ سے کم نہیں تھی۔

بچوں سے محبّت

میرزا کا اپنا کوئی بچہ زندہ نہیں رہا۔ عارف کی وفات کے بعد امراؤ بیگم ان کے چھوٹے لڑکے حسین علی خان کو اپنے ہاں لے آئیں، جس کی عمر اس وقت صرف دو برس کی تھی۔ تھوڑے دن بعد باقر علی خان بھی پانچ برس کی عمر میں انھیں کے پاس آ گئے۔ ان بن ماں باپ کے دونوں بچوں کی پرورش جس محبّت اور دلسوزی سے انھوں نے کی، وہ کچھ انھیں سے ممکن تھی۔ دونوں بچے انھیں بہت دق کرتے تھے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں[2]:

> سنو صاحب، یہ تو تم جانتے ہو کہ زین العابدین خان مرحوم میرا فرزند تھا۔ اور اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں، میرے پاس آ رہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمّل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں۔ پس تمہارے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوئے جب ان عالم صورت کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے، مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے، ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں، کہیں پانی لڑھاتے ہیں، کہیں خاک اڑاتے ہیں، میں تنگ نہیں آتا، تو ان معنوی پوتوں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں ہیں، کیوں گھبراؤں گا۔

الغرض ان کے ہر طرح کے لاڈ چاؤ برداشت کرتے، ان کے آرام کے لیے آپ تکلیف اٹھاتے، لیکن پیشانی پر بل نہ لاتے، بڑھاپے میں انھیں گلے کا ہار بنائے بنائے پھرتے تھے۔ جہاں جاتے، وہ پالکی میں ساتھ ہوتے۔ رام پور کے دونوں سفروں میں بھی ساتھ تھے۔ اُن کی تفریح کے لیے ہر طرح کا سامان مہیا رہتا۔ میرزا کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی کہ ان

۱۔ اس خاندان میں ان کے مندرجہ ذیل شاگرد تھے:۔ نیّر رخشاں؛ علائی؛ ثاقب؛ طالب؛ محو؛ عارف؛ شاداں۔

۲۔ اردوے معلّی: ۵۵-۵۶؛ خطوطِ غالب (۱): ۱۷

کی دلچسپی اور دل بستگی میں کوئی کمی نہ رہنے پائے۔ دو دو روپے مہینا انھیں جیب خرچ ملتا تھا۔ رام پور سے ایک خط میں تحریر کرتے ہیں[۵]:

لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں۔ کبھی میرا دل بہلاتے ہیں، کبھی مجھ کو ستاتے ہیں۔ بکریاں، کبوتر، بٹیریں، تکّل، کنکوا، سب سامان درست ہے۔ فروری مہینے کے دو دو روپے لے کر دس دن میں اوڑھا ڈالے۔ پھر پرسوں چھوٹے صاحب آئے کہ دادا جان، کچھ ہم کو قرضِ حسنہ دو۔ ایک روپیہ دونوں کو قرضِ حسنہ دیا گیا۔ آج ۱۴ ہے؛ مہینا دور ہے۔ دیکھیے، کے بار قرض لیںگے۔

چھوٹے صاحب کی یہ فضول خرچی کی عادت اخیر تک ان کے ساتھ رہی۔ میرزا ان کی اسی عادت کے سبب انھیں "لڑکے بادشاہ" کہہ کر پکارا کرتے تھے؛ کہ میاں، بادشاہو کے سے الّلے تلّلے کرتے ہو۔ بات یہ ہے کہ چوں کہ خود "طفلی" میں یتیم ہو گئے تھے، اس لیے "دردِ طفلاں" کی حقیقت سے خوب واقف تھے، اور جانتے تھے کہ یتیمی کا داغ کیا معنی رکھتا ہے، اور بچوں کی حسرتیں کیا ہوا کرتی ہیں!۔

باقر علی خان، ان کی زندگی ہی میں گھر بار والے ہو گئے تھے اور ان کی وفات کے وقت ان کی دو صاحبزادیاں موجود تھیں۔ بڑی لڑکی محمّد سلطان بیگم سے میرزا کو بہت محبّت تھی۔ ان کی وفات کے وقت وہ چار برس کی تھیں۔ اس زمانے میں بھی جب باقر علی خان الگ مکان میں اٹھ گئے تھے، وہ دن بھر انھیں کے پاس کھیلتی رہتی تھیں۔ اسی طرح نواب علاء الدّین احمد خان کے صاحبزادے فرخ میرزا اور حکیم غلام نجف خان کے صاحبزادے ظہیر الدّین کے نام ان کے خطوط موجود ہیں، جن سے ان کے جذباتِ محبّت کا اظہار ہوتا ہے۔

لیکن یہ پھر بھی ان کے اپنے بچے تھے، انھیں دوسروں کے بچّوں سے بھی ایسی ہی محبّت اور شیفتگی تھی، اور وہ سب دوستوں کی اولاد کا حال اسی دلچسپی سے پوچھتے رہتے

---

[۵] اردوے معلّیٰ: ۱۷۱؛ خطوطِ غالب (۱): ۲۸۲ (بنام حکیم غلام نجف خان)

تھے۔ منشی نبی بخش حقیر کے نام کے خطوں سے ان کی صاحبزادی زکیہ بیگم اور ان کے بیٹوں اور پوتوں سے غایت درجہ محبت اور شغف کا ثبوت ملتا ہے۔ کوئی خط ان کے ذکر سے خالی نہیں۔ ہر خط میں ان کی صحت اور تعلیم و تربیت اور عام حالات سے متعلق پوچھتے ہیں؛ اور اگر حقیر لکھنا بھول جاتے ہیں، تو ان پر خفا ہوتے ہیں۔

دوستوں سے محبت

دوستوں سے وفا اور ان پر جان چھڑکنا اُن کا ایمان تھا۔ وہ یوں بھی حساس طبیعت کے تھے، لیکن ان کی اپنی مصیبت ناک زندگی، اور اس پر ۱۸۵۷ء کی ناگہانی افتاد نے انھیں بکا پھوڑا بنا دیا تھا۔ جہاں کسی دوست کے پھانس بھی چبھتی، وہ بلبلا اٹھتے۔ اپنی وسعت کے مطابق جو کچھ ہو سکتا، اس سے دریغ نہ کرتے۔ اگر خود کچھ نہ کر سکتے، تو دوسروں سے سفارش کرتے۔ اگر چہ ان کا اپنا حال کبھی کبھی آسودہ نہیں ہوا، لیکن یہ "گدائے غنی دل" کسی دوست اور عزیز کی تکلیف نہیں دیکھ سکتا تھا۔

انھوں نے امین الدین احمد خان اور ضیاء الدین احمد خان کا ساتھ جس پامردی سے دیا، وہ ان کی زندگی کا درخشاں واقعہ ہے۔ نواب احمد بخش خان کی وفات کے بعد ان کی پنشن، نواب شمس الدین احمد خان سے متعلق ہو گئی تھی۔ اگر میرزا ان کی ہاں میں ہاں ملاتے، تو نہ صرف یہ پنشن ہی باقاعدہ ملتی رہتی، بلکہ یقین ہے کہ نواب احمد بخش خان کے زمانے کی فتوحات بھی جاری رہتیں۔ رشتہ بھی برابر کا تھا اور کوئی ترجیح کی وجہ نہیں تھی، لیکن محض حق پرستی اور وفا کے احساس نے انھیں شمس الدین احمد خان کے خلاف ہونے پر مجبور کر دیا۔ جانی اور مالی نقصان کے قوی امکان کے باوجود انھوں نے دونوں بھائیوں کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ آخر کار اُن کے اس مخالفانہ رویے سے ناراض ہو کر شمس الدین احمد خان نے ان کا وظیفہ بند کر دیا۔ لیکن یہ وار بھی خالی گیا اور وہ اپنی روش پر مضبوطی سے قائم رہے۔ انھوں نے حصولِ ریاست میں امین الدین احمد خان کی ہر طرح مدد کی۔ جب ۱۸۳۴ء میں وہ اسی سلسلے میں سپریم کونسل کے سامنے اپیل کرنے کے لیے کلکتے گئے، تو میرزا نے اپنے وہاں کے احباب کے نام خط لکھے کہ

حتی الامکان ان کی امداد میں کمی نہ کی جائے۔ خدا نے بھی ان کوششوں کو پروان چڑھایا اور لوہارو انھیں دوبارہ مل گیا

دلّی میں افواہ اُڑی کہ راجہ بھرت پور وفات پا گئے۔ انھیں فوراً اپنے دوستوں کی فکر ہوئی، جو اس سرکار سے وابستہ تھے۔ دیکھیے، کس اضطراب سے تفتہ کو لکھتے ہیں[1]۔

بھائی! آج مجھ کو بڑی تشویش ہے۔ اور یہ خط میں تم کو کمال سراسیمگی میں لکھتا ہوں۔ جس دن میرا خط پہنچے، اگر وقت ڈاک کا ہو، تو اوسی وقت جواب لکھ کر روانہ کرو، اور اگر وقت نہ رہا ہو، تو ناچار دوسرے دن جواب بھیجو۔ منشا تشویش و اضطراب کا یہ ہے کہ کئی دن سے راجہ بھرت پور کی بیماری کی خبر سُنی جاتی تھی، کل سے اور بُری خبر شہر میں مشہور ہے۔ تم بھرت پور سے قریب ہو۔ یقین ہے کہ تم کو تحقیق حال معلوم ہو گا۔ جلد لکھو کہ کیا صورت ہے؟ راجہ کا مجھکو غم نہیں۔ مجھ کو فکر جانی جی کی ہے کہ اوسی علاقے میں تم بھی شامل ہو ۔۔۔۔۔۔۔۔ واسطے خدا کے نہ مختصر، نہ سرسری، بلکہ مفصّل اور منقح، جو واقع ہوا ہو اور جو صورت ہو، مجھ کو لکھو اور جلد لکھو کہ مجھ پر خواب و خور حرام ہے۔ کل شام کو میں نے سنا، آج صبح تلعے نہیں گیا اور یہ خط لکھ کر ازراہِ احتیاط بیرنگ روانہ کیا۔ تم بھی اس کا جواب بیرنگ روانہ کرنا ۔۔۔۔۔ زیادہ کیا لکھوں کہ پریشان ہوں۔

اور ان کی سب دوستوں سے محبت کا یہی حال تھا۔ متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، جس کی ضرورت نہیں۔ انھیں اپنی بیچارگی کا احساس ایسے موقع پر اور شدید ہو جاتا، جب وہ کسی دوست کو تکلیف میں دیکھتے اور اس کی مدد نہ کر سکتے۔ میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں[2]:

اے میر مہدی، تو درماندہ و عاجز پانی پت میں پڑا رہے؛ میرن صاحب

۱- اردوے معلّی: ۴۴-۴۵؛ خطوطِ غالب (۱): ۱۹-۲۰

۲- اردوے معلّی: ۱۱۰؛ خطوطِ غالب (۱): ۳۱۶

وہاں پڑے ہوئے دتی دیکھے کو ترسا کریں، سرفراز حسین نوکری ڈھونڈتا پھرے، اور میں ان غمہائے جانگداز کی تاب لاؤں۔ مقدور ہوتا تو دکھا دیتا کہ میں نے کیا کیا:

اے لبا آرزو کہ خاک شدہ

اللہ، اللہ، اللہ

یوسف میرزا کو لکھتے ہیں[1]:

یہاں اغنیا اور امرا کے ازواج و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں! اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے۔

ایک اور مقام پر انھوں نے جو کچھ نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھا ہے، وہاں گویا اپنی تمام حسرتوں کو زبانِ قلم سے بیان کر دیا ہے[2]:

مجھے اپنے ایمان کی قسم، میں نے اپنی نظم ونثر کی داد باندازۂ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا، آپ ہی سمجھا۔ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں، بقدر ہزار ایک، ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقتِ جسمانی کہ ایک لاٹھی ہات میں لوں، اور اوس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سُوت کی رسّی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھیرا، کبھی نجف جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے، نہ سہی، جس شہر میں رہوں، اوس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ .... وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے، وہ میں ہوں۔

شاگردوں سے محبت

شعر وسخن میں اُستادی شاگردی کی رسم فارسی کے سوائے اور کسی زبان میں نہیں ملتی۔

۱۔ اردوے معلّی: ۲۵۵؛ خطوطِ غالب (۱): ۲۲۴

۲۔ اردوے معلّی: ۲۹۳-۲۹۴؛ خطوطِ غالب (۱): ۴۰۹-۴۱۰

اُردو نے جہاں اور کتنی چیزیں، اچھی اور بُری، فارسی سے لیں، اسی طرح یہ رسم بھی اپنالی۔ اس میں فائدے بھی ہیں اور نقصان بھی۔ اگر اسے ایک حد کے اندر، اعتدال سے استعمال کیا جائے، تو یہ شاگرد کی ترقی و تہذیب میں مفید ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر اس میں بے اعتدالی آجائے، تو شاگرد ہمیشہ کے لیے عطائی ہو کے رہ جاتا ہے، اور کبھی اپنے پانو پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں ہو سکتا۔

میرزا نے اگرچہ اپنے کلام پر کسی سے اصلاح نہیں لی اور اس لحاظ سے ان کی تمام ترقی "خدائے بخشندہ" کی بخشایش اور ان کے اپنے "زورِ بازو" کا نتیجہ سمجھنا چاہیے، لیکن انھوں نے ابتدائی درسی تعلیم مولوی محمد معظّم سے حاصل کی اور اس کی تکمیل ملا عبدالصّمد سے کی۔ ملا عبدالصّمد کی مشفقانہ تعلیم کی یاد انھیں آخر دم تک رہی۔ ان کی تصنیفات میں جہاں کہیں ان کا نام آگیا ہے، نہایت ادب اور محبّت سے ان کی فضیلت اور علمیّت اور تربیت کا ذکر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بھی اپنے شاگردوں کے کلام کی اصلاح اور انھیں حتی الوسع شاعری اور زبان کے رموز و نکات سمجھانے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔

اصلاح سے متعلق ان کے چند مقرّرہ اصول تھے اور وہ ان پر سختی سے کاربند تھے۔ تمام شاگردوں کو ان باتوں کی پابندی کرنا پڑتی تھی اور اس بارے میں وہ کسی کی رُو رعایت نہیں کرتے تھے۔

جو کلام ان کے پاس اصلاح کے لیے آتا تھا، اس میں شعروں اور مصرعوں کے درمیان اتنی جگہ چھوڑی جاتی تھی کہ اصلاحی الفاظ آسانی سے لکھے جاسکیں۔

تحریر صاف، روشن اور خوش خط اور دبیز کاغذ پر ہوا کرتی تھی۔ مقصود یہ تھا کہ نہ انھیں خود اصلی مسوّدہ پڑھنے میں دقّت ہو، نہ ان کی اصلاح مغشوش ہو جائے۔ جسے شاگرد کے لیے سمجھنا مشکل ہو۔

وہ اصلاح کے ساتھ وجہِ اصلاح بھی لکھتے جاتے، تاکہ شاگرد آیندہ آپ اپنی رہنمائی کر سکے۔ اگر شاگرد ان کے اشارات غور سے نہیں دیکھتا تھا، تو وہ اس پر خفا ہوتے

تھے، کیوں کہ اس کا یہ مطلب تھا کہ ان کی محنت رایگاں جارہی ہے ۔ ان کا مزاج کسی حد تک جھلّا تھا، وہ بہت زود رنج تھے اور بحث کو پسند نہیں کرتے تھے ۔ لیکن اس کے باوجود وہ شاگرد کے سوال کرنے سے نہیں گھبراتے تھے، بلکہ اس سے خوش ہوتے، کیوں کہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ شاگرد ان کی ہدایتوں کا غور سے مطالعہ کر رہا ہے، اور خود اپنی فہم و فراست سے بھی کام لے رہا ہے ۔ لیکن ایسی تکرار جو کٹ حجتی یا ہٹ دھرمی کا پہلو لیے ہوتی، انھیں بہت ناگوار گزرتی تھی ۔

اصلاح میں ان کا اصول یہ تھا کہ اگر تبدیلی سے کلام میں واقعی ترقی ہوتی ہے تو بہتر، ورنہ لفظ کی جگہ ہم معنی لفظ رکھ دینے سے وہ پرہیز کرتے تھے کہ اس سے محض اپنی قدرت کلام کا اظہار ہوتا ہے؛ نہ شاگرد ہی کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے، نہ کلام کے درجے ہی میں کوئی فرق پیدا ہوتا ہے ۔ ان کی اصلاح اس حد تک نہیں جاتی کہ شاگرد کا مضمون ہی سرے سے بدل جائے ۔ وہ املا، محاورے یا زبان کی غلطی کی اصلاح کر دیتے ہیں؛ یا کسی جگہ لفظ تبدیل کیا ہے، تو ایسا کہ اس سے شعر بلند ہو گیا ہے ۔ اس سے شاگرد کی طرز میں انفرادیت اور خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ لیکن اگر استاد اپنی طرف سے اتنا تصرف کرنا شروع کر دے کہ شاگرد کا اصل مطلب ہی غت ربود ہو جائے، تو یہ تو ممکن ہے کہ اس سے شعر غیر معمولی طور پر بلند ہو جائے، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ کسی طرح اس کا کلام نہیں کہلا سکتا ۔

جو شعر انھیں پسند آتا، اس پر صاد کر دیتے اور تعریفی کلمات لکھنے میں بخل سے کام نہ لیتے ۔ اس سے شاگرد کا دل بڑھتا اور اسے معلوم ہوتا، کہ میں ترقی کر رہا ہوں ۔ استاد عام طور پر ایک آدھ شعر اپنی طرف سے بھی کہہ کر شاگرد کو عطا کر دیتے ہیں ۔ میرزا کے اپنے شاگردوں کو شعر دینے کی مثالیں بھی ملتی ہیں، لیکن بہت شاذ و نادر ۔ وجہ یہ ہے کہ ایک تو یہ شاگرد کے وقار اور خودداری کے خلاف ہے کہ وہ دوسرے کے کلام کو اپنے نام سے پیش کرے، دوسرے بھلا اس سے شاگرد کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے!

میرزا کے شاگردوں میں ہر طبقے کے لوگ موجود تھے ۔ ناظم اور بیتاب اور توفیق کے

سے والیانِ ریاست اور شہزادے، اور ذکا اور قدر اور تفتہ کے سے ملازمت پیشہ صاحبان؛ شیفتہ اور عرشی اور حقیر کے سے عالم فاضل بزرگ؛ اور مونس اور درد اور آرام کے سے معمولی پڑھے لکھے لوگ۔ لیکن وہ سب سے یکساں مہربانی اور لطف سے پیش آتے، ہر ایک کے کلام پر توجہ اور محنت سے اصلاح دی جاتی۔ اگر بیماری یا کسی سبب سے اصلاح کا کام رُک جاتا، تو سب کے مسوّدے پڑے رہتے۔

ان کا اپنے شاگردوں سے تعلق، ان کے کلام کی اصلاح ہی تک محدود نہیں تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ شاگردوں کو اپنے دوسرے دوستوں اور عزیزوں سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ان کی ہر طرح کی بہتری اور بہبودی کے خواہاں رہتے۔ ان کے روزگار میں ترقی کے لیے دامے، درمے، قدمے، تمام کوشش کرتے۔ مثلاً یوسف علی خان عزیز ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بیکار ہو گئے۔ چھوٹے چھوٹے بال بچّے اور بے روزگاری، زندگی دُوبھر ہو گئی۔ میرزا نے مختلف دوستوں کو سفارش چٹھیاں لکھیں کہ کسی طرح اُن کے لیے کوئی سبیل نکل آئے لیکن اسی پر اکتفا نہیں کی، بلکہ بیکاری کے زمانے میں، اپنے مقدور بھر ان کا درماہہ مقرر کر دیا![1] اسی طرح غلام حسنین قدر بلگرامی کی سفارشیں کرتے رہے۔ تفتہ اور مجروح کے لیے بھی صاحبِ اثر دوستوں کو لکھتے رہے۔

یہی باتیں تھیں، جن کے باعث ان کے شاگرد بھی ان سے اتنی محبت کرتے اور ان کی مشکلوں میں ان کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتے تھے۔

اساتذہ کا ادب

میرزا کی خود پسندی اور تعلّی کسی تعارف کی محتاج نہیں؛ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ہندستان کے فارسی دانوں کا تو ذکر ہی کیا کہ وہ انھیں اس قابل بھی نہیں خیال کرتے کہ ان کا نام تک لیا جائے، وہ اپنے آپ کو اکابرِ اہلِ ایران میں سے بھی کسی سے کمتر نہیں سمجھتے تھے۔ لکھتے ہیں[2]:

اہلِ پارس میں اور مجھ میں دو طرح کے تفاوت ہیں: ایک تو یہ کہ اون کا

۱۔ اردوے معلّیٰ: ۳۳۳ (ذکا) ۲۔ اردوے معلّیٰ: ۳۶۰-۳۶۱؛ خطوطِ غالب (۱) ۱۸۴ (بنام ہرگوپال تفتہ)

مولد ایران اور میرا مولد ہندستان ۔ دوسرے یہ کہ وہ لوگ آگے پیچھے،
سو، دو سو، چار سو، آٹھ سو برس پہلے پیدا ہوئے ہیں ۔

لیکن جہاں تک زبان کے قواعد و ضوابط اور اس کی نزاکتوں کا تعلق ہے ، وہ ان باتوں کے علم میں کسی کی برتری نہیں تسلیم کرتے ۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ چیزیں میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں، جیسے فولاد میں جوہر ۔[1] بلکہ پرانے اساتذہ کے پہلے گزرنے سے انھوں نے ایک اور لطیف مضمون پیدا کیا ہے :

باخذِ فیض ز مبداء فرو نم از اسلاف | کہ بودہ ام قدرے دیر تر بداں درگاہ
نزولِ من بجہاں بعد یک ہزار و دو لیست | ظہورِ خسرو و سعدی بہ ششصد و پنجاہ

یعنی میں اگر اتنی دیر بعد پیدا ہوا ہوں، تو یہ میرے لیے فخر و عزّت کا مقام ہے ۔ کیوں کہ اس طرح مجھے مبداء فیاض سے اتنی مدّت زیادہ استفادہ کرنے کا موقع ملا، اور میری استعداد و قابلیت بھی اسی نسبت سے زیادہ ہے ۔ اسی تفاخر کا نتیجہ تھا، جو کلیاتِ فارسی کے دیباچے میں انھوں نے اساتذۂ قدیم کو چراغ سے اور اپنے آپ کو آفتاب سے تشبیہہ دی ہے ۔

لیکن اس کے باوجود وہ حفظِ مراتب کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ۔ سیّد احمد حسن فدا مودودی نے غزل کہی ۔ انہی قافیوں میں دوسری ردیف کے ساتھ شہیدی کی غزل موجود تھی ۔ میرزا نے اصلاح دیے بغیر غزل انھیں واپس بھیج دی اور لکھا:[2]

> غزل کا کاغذ واپس بھیجتا ہوں ۔ نہ اس کو پھاڑ سکوں، نہ پانی میں دھو سکوں ۔ شہیدی کی غزل ان قافیوں میں بہ تغیرِ ردیف ایسی ہے کہ اب ان قافیوں کا باندھنا ہرگز نہ چاہیے ۔ آپ اور غزل لکھیے ، اس کو ہرگز دیوان میں نہ رکھیے ۔

نواب علاء الدّین احمد خاں نے ان سے "مژگاں گلہ دارد ۔ ارماں گلہ دارد" کی زمین میں

۱۔ ایضاً
۲۔ اردوے معلّیٰ : ۱۸۳

غزل کہنے کی فرمائش کی؛ انھوں نے جواب دیا کہ یہ زمین قدسی کے حصّے میں آچکی ہے، میں ان قافیوں میں لکھ کر "بے حیائی" کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔

بادی النظر میں اس سے ان کے کردار کا تضاد نظر آتا ہے کہ ایک طرف تو وہ اساتذۂ سلف سے ہمسری، بلکہ ان سے برتری کا دعویٰ کرتے ہیں، اور دوسری طرف بعض اوقات ان کے تتبع میں لکھنے سے گریز بھی کرتے ہیں۔ لیکن غور سے دیکھا جائے، تو اصل میں کوئی تضاد نہیں، بلکہ یہی بات ان کی انصاف پروری اور بلند نظری کی بیّن دلیل ہے۔

انھوں نے مشہور شاعروں کی زمینوں میں قصیدے اور غزلیں کہی ہیں اور کبھی کبھی وہ اپنے پیشرووں پر چشمک بھی کر جاتے ہیں۔ لیکن جہاں دیکھتے ہیں کہ کسی شخص کا کلام واقعی اتنا بلند اور قابلِ تعریف ہے کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا، تو وہ فوراً اس کا اقرار کر لیتے ہیں، جو انصاف کا تقاضا ہے۔ آخر کونسی زمین یا طرح ایسی ہے، جس میں چند شعر نہ کہے جا سکیں! لیکن میرزا کے نزدیک یہی کافی نہیں کہ شعر کہہ لیے جائیں؛ بلکہ یہ کہ وہ اچھے بھی ہوں، اور اگر اسی زمین میں پہلے سے کسی کا کلام موجود ہے، تو اس کے مقابلے میں رکھنے کے قابل بھی۔ اگر یہ ممکن نہیں، تو جھک مارنے سے فائدہ! بہتر ہے کہ اپنے عجز کا اعتراف کر لیا جائے۔ مثلاً جب انھوں نے نظیری کی زمین میں غزل کہی؛ اور نظیری کو وہ استاد مانتے تھے۔ تو دیکھیے مقطع میں کس شوخ پیرایے میں داد طلب کی ہے:

جوابِ خواجہ نظیری، نوشتہ ام غالبؔ! خطا نمودہ ام و چشمِ آفریں دارم

یہاں ضمناً ایک اور بات پر بھی روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ میرزا غالبؔ، ہندستان کے فارسی دانوں ــــــ شاعروں اور ادیبوں ــــــ میں سے کسی کو قابلِ استناد نہیں مانتے تھے اور انھوں نے اپنے خطوں اور تحریروں میں ان سب کو کوسا ہے۔ لیکن اس بات کے سمجھنے میں اکثر حضرات کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ آخر ان کے اعتراض کی نوعیت کیا تھی! کیا ان کے خیال میں یہ اصحاب فارسی

ھ ایضاً: ۳۱۱؛ خطوطِ غالب (۱): ۳۹۰

نہیں جانتے تھے؟ یا جانتے تو تھے لیکن غلط زبان لکھتے تھے؟ یعنی آخر وہ کیا بات ہے، جس پر انھیں اعتراض تھا؟

ہندستان کے فارسی لکھنے والوں میں بعض نام بہت مشہور ہیں، حضرت امیر خسرو دہلوی، ابوالفیض فیضی، میرزا عبدالقادر بیدل، ناصر علی علی، ان میں سے صفِ اوّل کے لوگ ہیں۔ مولوی غیاث الدّین عزّت رامپوری، میرزا محمد حسن قتیل، احسان اللّٰہ ممتاز عبدالواسع ہانسوی، ملّا محمد اکرم غنیمت کنجاہی، نور العین واقف بٹالوی وغیرہ، اگرچہ ان کے پایے کے نہیں، پھر بھی ہندستانی فارسی نویسوں میں بہت مشہور و معروف ہیں۔ ان میں سے میرزا ایک حضرت امیر خسرو کے سوائے کسی کو نہیں مانتے۔ ان سب کا نام ان کے رقعات میں آیا ہے، اور انھوں نے ہر جگہ یہی لکھا ہے کہ یہ لوگ اس قابل نہیں کہ ان کی فارسی کو معیاری سمجھا جائے۔ آخر کیوں؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے میں چند بنیادی اصول بیان کرنا چاہتا ہوں۔

زبان ان علوم میں سے ہے جو سماعت پر مبنی ہیں۔ یہاں قیاس سے کام نہیں چلتا۔ میں نے جو پہلوں سے سنا، وہ آج لکھ اور بول رہا ہوں۔ جو لوگ مجھ سے پہلے تھے، انھوں نے اپنے بڑوں کی پیروی کی؛ اور جو میرے بعد آئینگے، وہ اپنے بڑوں کا تتبع کرینگے۔ یہاں چراغ سے چراغ جلتا ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص جمہور کی رائے کے خلاف، نئے الفاظ اور نئے محاورے گڑھنا اور لکھنا شروع کرے۔ جب تک انھیں قبولِ عام اور تائیدِ جمہور کی سند نہ مل جائے، وہ ٹکسال باہر ہیں؛ اور زبان کا جزو نہیں سمجھے جا سکتے۔ انھیں یہ مقبولیت اور تائید جبھی حاصل ہوگی، اگر وہ سماعی اصول پر پورے اتریں۔ اور انھیں زبان میں داخل کرنے کا حق بھی صرف اُس ملک کے باشندوں کو حاصل ہے، جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے، نہ کہ کسی اجنبی کو غرض کہ یہ کلّیہ بہرحال قائم رہیگا کہ زبان سماعی علم ہے، قیاسی نہیں۔ یہ پہلا اصول ہے۔

جس ملک میں کوئی خاص زبان بولی جاتی ہے، وہ اس ملک کے باشندوں کی

مادری زبان ہے اور وہ لوگ اہلِ زبان کہلاتے ہیں، چونکہ وہ گہوارے سے اپنے اردگرد کے بڑے بوڑھوں سے یہ زبان سنتے چلے آئے ہیں، اس لیے جیسا وہ، اس زبان کے اسرار و رموز سے واقف ہوتے ہیں، ایسا کسی دوسرے ملک کا باشندہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ممکن ہے کہ کوئی اجنبی محنت اور مشق سے اس زبان کے قواعد پر عبور حاصل کرے، اور ان قواعد کی رو سے اسے صحیح لکھ بھی لے، لیکن اس کے باوجود اس کا درجہ زباندان کا ہے، اہلِ زبان کا نہیں، کیوں کہ زبان پہلے بنتی ہے اور قواعد بعد کو۔ زبان اور بیان کے روزمرے میں سینکڑوں آنوٹیں اور نزاکتیں ایسی ہیں، جو تحریر میں آسکتی ہیں، نہ کسی قاعدے قانون کی پابند ہوتی ہیں۔ ان کا تعلق سماعت اور وجدان سے ہے۔ یہ باتیں اُس اجنبی کو کسی قاعدے اور کتاب میں نہیں ملینگی اور اس حد تک اس کا علم ناقص رہیگا۔ یہ دوسرا اصول ہے۔

یہ اجنبی جس نے وہ زبان کتابوں کی مدد سے سیکھی ہے، جب کوئی چیز اس زبان میں لکھیگا، تو قدرتًا اس کی تحریر میں وہ سادگی اور آمد، بیساختگی اور شیرینی نہیں ہوگی، جو آپ کو کسی اہلِ زبان کی تحریر میں ملیگی۔ وجہ ظاہر ہے! چوں کہ اس نے اسے مکتب میں پڑھا ہے، اس لیے اس کا علم خارجی ہے، داخلی نہیں، جیسا اس شخص کا، جس نے جب سے ہوش سنبھالا، یہی زبان سنی اور بولی۔ اس کے لیے یہ زبان ایسی ہے جیسے "فولاد میں جوہر" یا "تار میں گہر"۔ اسے لفظوں کی تلاش میں کاوش نہیں کرنا پڑتی۔ اس کے برعکس زباندان کو اپنا مافی الضمیر بیان کرنے میں الفاظ ڈھونڈنا پڑینگے۔ اس سے خواہی نخواہی اس کے بیان میں تصنع اور آورد آجائیگی۔ یہ تیسرا اصول ہے۔

ان پیش کردہ اصولوں ہی سے ایک اور اصول پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی لفظ یا محاورے کی غلطی یا درستی میں بحث ہو، تو اس کا فیصلہ اہلِ زبان کی سند سے ہوگا۔ اس بارے میں کسی بڑے سے بڑے اجنبی کا کلام بھی مفیدِ مطلب نہیں ہو سکتا۔ یہ چوتھا اور آخری اصول ہے۔

اگر ہم یہ چاروں اصول اپنے سامنے رکھیں، تو ہم آسانی سے فیصلہ کر سکینگے کہ غالب

کا ان ہندستانی فارسی لکھنے والوں پر اعتراض کیا ہے!۔
غالب اس سے انکار نہیں کرتے کہ یہ اصحاب عالم ہیں، فارسی جانتے اور لکھتے ہیں، لیکن وہ کہتے ہیں کہ ان کا اہلِ زبان سے کیا مقابلہ؟ حضرت صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں:

ہندستان کے سخنوروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمۃ کے سوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا۔ خسروِ کیخسرو قلمرو سخن طرازی ہے، یا ہم چشم نظامی گنجوی و ہم طرح سعدی شیرازی ہے۔ خیر فیضی بھی نغز گوئی میں مشہور رہے، کلام اس کا پسندیدۂ جمہور رہے۔ دیکھو عبد القادر بدایونی کیا لکھتا ہے: زہے سیاہی فالیز۔ آرزو، نقیر اور شیدا اور بہار وغیرہم انھیں میں آ گئے۔ ناصر علی اور بیدل اور غنیمت، ان کی فارسی کیا! ہر ایک کا کلام بہ نظرِ انصاف دیکھیے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ منت اور مکین اور واقف اور قتیل، یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے۔ ان حضرات میں عالم علوم عربیہ کے شخص ہیں۔ خیر ہوں، فاضل کہلائیں۔ کلام میں ان کے مزا کہاں، ایرانیوں کی سی ادا کہاں! فارسی کی قاعدہ دانی میں اگر کلام ہے، تو اس میں پیرویِ قیاس ایک بلائے عام ہے۔ وارستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سوجگہ اعتراض کیا ہے، اور ہر اعتراض بجا ہے۔ بایں ہمہ وہ بھی جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے، منہ کی کھاتا ہے۔ مولوی احسان اللہ ممتاز کو صنائعِ لفظی میں دستگاہ اچھی تھی، اس شیوہ و روش کو خوب برت گئے؛ فارسی وہ کیا جانیں! قاضی محمد صادق اختر عالم ہوں گے، شاعری سے ان کو کیا علاقہ![1]

یہاں انھوں نے جامعیت سے سب مشہور ہندستانی فارسی نویسوں پر تبصرہ کر دیا ہے اور اسی سے پتا چلتا ہے کہ وہ کیوں انھیں سند نہیں مانتے۔ صحیح زبان لکھ لینا اور بات ہے اور طرزِ گفتار کا اہلِ زبان کا سا ہو جانا بالکل دوسری بات ہے۔ اسی لیے

---

[1] عودِ ہندی: ۳۵-۳۶

وہ کہتے ہیں[1]:

یہ لوگ راہِ سخن کے غول ہیں، آدمی کے گمراہ کرنے والے؛ یہ فارسی کو کیا جانیں۔ ہاں طبعِ موزوں رکھتے تھے، شعر کہتے تھے۔

یعنی شعر کہہ لینا کچھ مشکل نہیں، لیکن زبان کا سند ہونا اور اس میں اہلِ زبان ہی کی سی گھلاوٹ ہونا اور بات ہے۔ اس میں کوئی قیاس اور کوشش مفید نہیں ہوسکتی۔ اہلِ زبان کی نقل کی کوشش کرنا ان کا منہ چڑانا ہے۔ اسی لیے وہ ایک جگہ قتیل پر اعتراض کرتے ہیں کہ "وہ ایرانیوں کی تقریر کے موافق تحریر بناتا ہے۔"

ان کے نظریے کی وضاحت ان کے ایک دوسرے خط سے بھی ہوتی ہے۔ نواب انورالدولہ بہادر شفق میرزا کے شاگرد تھے۔ انھوں نے ایک قصیدہ کہا اور اصلاح کے لیے ان کے پاس بھیجا۔ انھیں لکھتے ہیں[2]:

قصیدے کو بار بار دیکھا اور غور کی جس طرز پر ہے، اس میں گنجایش اصلاح کی نہ پائی، یعنی لفظ کی جگہ لفظِ مرادف بالمعنی لانا صرف اپنی دستگاہ کا اظہار ہے۔ ورنہ کوئی لفظ بے محل اور بے موقع نہیں۔ کوئی ترکیبِ فارسی ٹکسال باہر نہیں ہے؛ مگر ہاں، طرزِ گفتار کا بدلنا، اوس کے واسطے چاہیے، دوسرا قصیدہ اس زمین میں ایک اور لکھنا، اور وہ تکلفِ بارد ہے۔ بلکہ شاید یہ حضرت کو منظور بھی نہ ہو۔

اس سے بھی زیادہ واضح ایک اور تحریر ہے۔ شاہزادہ بشیرالدین کو لکھتے ہیں[3]:

فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت طبیعت کی ہے۔ پھر تتبع کلامِ اہلِ زبان، لیکن نہ اشعارِ قتیل و واقف و شعرائے ہندستان، کہ یہ اشعار سوائے اس کے کہ ان کو موزونیِ طبع کا نتیجہ کہیے، اور کسی تعریف کے

۱- اردوے معلّیٰ: ۲۲۲-۲۲۳؛ خطوطِ غالب (۱): ۱۹۹ (بنام انورالدولہ شفق)

۲- اردوے معلّیٰ: ۲۲۵؛ خطوطِ غالب (۱): ۲۰۸

۳- اردوے معلّیٰ: ۳۸۶

شنایاں نہیں ہیں ؛ نہ ترکیب فارسی ، نہ معانی نازک ؛ ہاں ، الفاظ
فرسودہ ، عامیانہ ، جو اطفالِ دلبستاں جانتے ہیں ، اور جو متصدّی نثر
میں درج کرتے ہیں ؛ وہ الفاظ یہ لوگ نظم میں صرف کرتے ہیں ۔

یعنی محض "زبان کا درست" اور "الفاظ کا با محل اور باموقع" ہونا کافی نہیں ، "طرزِ گفتار" کا اہلِ زبان کے محاورے اور روزمرّے کے مطابق ہونا شرط ہے ۔ اور یہ چیز ہر ایک کے حصّے میں نہیں آتی ۔ درست زبان اور با محل الفاظ تو ہر وہ شخص لکھ لے سکتا ہے ، جس نے کسی زبان کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے قواعد پر حاوی ہو گیا ہے ۔ اس کی مثال میں ہندستان میں انگریزی لکھنے والے پیش کیے جا سکتے ہیں ۔ یہاں پچھلے ایک سو برس سے اوپر اسکولوں اور کالجوں میں انگریزی پڑھائی جاتی ہے ۔ بلامبالغہ ہزاروں ہندستانی مصنّفوں نے انگریزی زبان میں کتابیں لکھی ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود ہماری انگریزی سے متعلق انگریزوں کی جو رائے ہے ، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ چند برس اُدھر جب ہمارے ایک سیاسی لیڈر نے اپنی سوانح عمری لکھی ، تو ولایت کے اخباروں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا کہ کتاب کی زبان ایسی ہے جو انگریزوں کو خاص طور پر پسند آئیگی ، کیوں کہ وہ ان کا روزمرّہ لکھتے ہیں اور اس میں کسی طرح کی اجنبیّت اور تصنع نہیں ۔ اور یہ بھی اس لیے کہ یہ صاحب بچپن سے ولایت میں تعلیم پاتے رہے تھے ۔ مدعا یہ کہ اس تمام علم و فضل کے باوجود ہمارے کتنے اصحاب کو یہ سندِ قبول ملی ہے !

بس غالب کا اعتراض یہ تھا کہ ان حضرات کی زبان میں "ترکیبِ فارسی" یعنی فارسیّت نہیں یا دوسرے لفظوں میں "ایرانیوں کی سی ادا" نہیں ۔ زبان درست ہے ، کلام موزوں ہے ! اگر آپ اس پر اصلاح دینا چاہیں ، تو اس میں غلطی نہیں پائینگے ، سوائے اس کے کہ کسی جگہ ، ترکیب یا محاورے کی غلطی ہو کہ شاعر ناواقفی کے سبب ہندی محاورے کو فارسی میں ترجمہ کر کے لکھ جائے ۔ لیکن اس کے باوجود آپ

اس میں کسی چیز کی کمی پائیں گے کیونکہ "ورائے شاعری چیزے دگر ہست" اور یہ "چیزے دگر" صرف اہلِ زبان کے حصّے میں آتی ہے۔

میرزا نے قاطع بُرہان کسی خاص ارادے اور اہتمام سے نہیں لکھی تھی؛ یہ کتاب محض اتفاق سے مرتب ہو گئی۔ اگر ۱۸۵۷ء کی شورش نہ ہوئی ہوتی، اور ان کے معمولی مشاغل جاری رہتے، تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب کبھی عالمِ وجود میں نہ آتی چونکہ ان دنوں، وہ کہیں باہر جا آ نہیں سکتے تھے، اور صرف ایک برہان قاطع کا نسخہ ان کے پاس رہ گیا تھا، اس لیے دفع الوقتی کے لیے وہ اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ یہاں انھیں کتاب کے صفحے صفحے پر بوالعجبیوں کا گلزار نظر آیا۔ اس سے ان کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی۔ چناں چہ جہاں کہیں کوئی لطیفہ ذہن میں آ جاتا۔ وہ اس کے حاشیے پر لکھ دیتے۔ غدر کے بعد انھوں نے، اپنے خاص دوستوں کے دیکھنے کو، یہ سب اشارات جمع کر کے ایک جگہ لکھوا لیے۔ اب بھی وہ انھیں شائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن پھر انھیں خیال آیا کہ اگر انھیں باقاعدہ مرتب کر کے کتابی شکل میں چھاپ دیا جائے، تو اس سے میرا پرانا دعویٰ ثابت ہو جائیگا کہ ہندستان کے فارسی داں غلط فہم اور غلط نویس ہیں۔ اسی کو وہ "باسی کڑھی میں اُبال آیا" سے تعبیر کرتے ہیں چنانچہ انھوں نے مسودے پر نظرِ ثانی کی اور حک و اصلاح اور حذف و اضافے کے بعد اسے شائع کر دیا۔

پھر اس کے بعد جس طرح شرم و حیا اور تہذیب و شرافت کی مٹی پلید ہوئی، وہ ہماری ادبی تاریخ کا بہت ہی افسوسناک باب ہے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ اگر "البادی اظلم" کے اصول سے دیکھا جائے، تو اس کے لیے بہت تک میرزا خود ذمہ دار تھے۔ انھوں نے اپنی "درشت گفتاری" کی جو توجیہہ کی ہے، وہ بہت بودی ہے۔ کوئی لاکھ "سپاہی زادہ" ہوا کرے، اسے ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے کا مذاق یا تمسخر اڑائے، یا اسے سخت سُست کہے، خاص کر جب بحث کا موضوع بھی علمی اور تحقیقی ہو۔ بیشک، میرزا نے اپنی تحریر میں شوخ طبعی اور بذلہ سنجی کے جوہر

دکھائے ہیں، لیکن علمی مسئلوں کی تحقیق میں شوخی اور ظرافت نہیں، متانت اور سنجیدگی درکار ہے۔ اسی لیے مفتی میر محمد عباس شوستری نے انھیں ٹوکا تھا کہ آپ نے یہ کیا غضب کیا ہے۔ اس کا ایک ہی نتیجہ نکل سکتا تھا کہ مخالف بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے، یا پھر ان سے نچلی سطح پر آ کے گالیاں دینے لگتے۔ اور ہوا بھی یہی، چوں کہ وہ ظرافت کے اہل نہیں تھے، پھکڑ پر اُتر آئے۔

بہر حال ایک بات بالکل واضح ہو گئی کہ میرزا اپنے دعوے میں حق بجانب تھے۔ انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ہندستانی فارسی داں ہرگز قابلِ اعتبار نہیں۔ یہ اپنے قیاس کی پیروی میں نہ صرف خود قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہیں، بلکہ دوسروں کی گمراہی کا بھی سبب بنتے ہیں۔

خودداری

بظاہر مدح نگاری اور خودداری کا کسی شخص میں جمع ہونا محال نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں یہ بات درست نہیں۔ مدح نگاری کا تعلق شاعری سے ہے، جو اکتسابی چیز ہے۔ خودداری کردار کا جزو ہے، جو وہبی چیز ہے۔ جب شاعر قصیدے میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا ہوتا ہے، تو وہ خوب جانتا ہے کہ یہ رسمی باتیں ہیں؛ اور ممدوح کو بھی معلوم ہوتا ہے، کہ یہ سب "سخن گسترانہ" باتیں ہے، جس سے شاعر کا مقصود اپنی قدرتِ کلام کا اظہار اور حصولِ صلہ و ستائش ہے، ورنہ اس میں حقیقت کا کوئی شائبہ نہیں۔

پس کسی شاعر کی مدح گوئی اور قصیدہ نگاری سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ ذلیل اور خوشامد پرست ہے، غلط استدلال ہے۔ بعض لوگوں نے عدمِ تدبّر کے باعث اسی بنا پر میرزا پر بھی اعتراض کیا ہے اور انھیں بے غیرت اور نہ معلوم کیا کیا کچھ کہا ہے۔ حال آنکہ نہ اکیلے غالب نے قصیدہ نگاری کا "گناہ" کیا اور نہ یہ بے غیرتی کی دلیل ہے۔ کسی شخص کے اصلی کردار کا اندازہ اس کی روزمرّہ کی زندگی کے طرزِ عمل سے لگانا

۵۔ مکاتیبِ غالب: ۱۵۳ (حواشی متعلقہ ص ۱۴۱)

چاہیے۔ ہم میرزا کی زندگی کے دو واقعے لیتے ہیں۔

۱۸۲۷ء میں کلکتے جاتے ہوئے وہ کچھ مدّت کے لیے لکھنؤ ٹھہرے۔ غازی الدین حیدر کا زمانہ تھا اور معتمد الدولہ آغا میر سلطنتِ اودھ کے وزیر اعظم تھے۔ آغا میر کے ایما پر بعض دوستوں کی رائے ہوئی کہ نائب سلطنت سے غالب کی ملاقات کرائی جائے؛ لیکن میرزا نے دو شرطیں پیش کر دیں: اوّل، میں نقد نذر پیش کرنے سے معاف رکھا جاؤں؛ دوسرے یہ کہ میرے پہنچنے پر معتمد الدولہ مجھ سے معانقہ کریں۔ چوں کہ آغا میر کو یہ دونوں شرطیں منظور نہیں تھیں، اور غالب ان سے کم کو اپنی غیرت اور خودداری کے منافی خیال کرتے تھے، اس لیے یہ ملاقات نہ ہو سکی۔

یاد رہے کہ اس وقت ان کی عمر تیس برس سے زیادہ نہیں تھی، ابھی سرکارِ انگریزی سے انھیں خلعت اور دربار کے منصب نہیں ملے تھے، بادشاہی دربار سے بھی ان کا کچھ یونہی غیر یقینی سا تعلق تھا۔ مدّعا یہ کہ اس ابتدائی زمانے میں، جب ابھی وہ اعزاز و اکرام کے عادی نہیں ہوئے تھے، اور جوانی کی عمر میں، جب ان چیزوں کی ہوس زیادہ ہوا کرتی ہے، ان کا سلطنتِ اودھ کے وزیر اعظم سے ان اسباب کی بنا پر ملاقات نہ کرنا، اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ انھیں شروع سے اپنی عزّتِ نفس کا کس قدر خیال تھا۔

دوسرا واقعہ اس سے بارہ تیرہ برس بعد کا ہے۔ ۱۸۴۲ء میں انھوں نے دلّی کالج کی فارسی مدرّسی کا عہدہ محض اس وجہ سے ٹھکرا دیا کہ جب یہ اس سلسلے میں ٹامسن صاحب سے ملنے کو ان کے مکان پر گئے تو آگے سے کوئی شخص ان کے استقبال کو نہیں آیا۔ اس زمانے میں وہ انگریزوں کے وظیفہ خوار تھے، درباروں میں شامل ہوتے اور قصیدے پڑھتے تھے، اور انعام میں خلعت پاتے تھے۔ اور تو اور، خود ٹامسن صاحب ان کے ملنے والے، بلکہ دوست تھے۔[۵] لیکن ان سب باتوں کے باوجود انھوں نے حکومت کے اتنے بڑے انگریز حاکم سے ملاقات اور کالج میں ملازمت سے انکار کر دیا حال آنکہ "وہ" ان کے خداوندانِ مجازی کی خوشنودی کا باعث اور "یہ"

---

۵ ان کے کلام میں، ان کی مدح میں ایک قصیدہ بھی ہے (نمبر ۳۶)۔ ایک غزل بھی ان کی مدح میں ہے۔ پنج آہنگ میں متعدد خط ان کے نام ہیں۔

ان کے اظہارِ کمال کا ذریعہ بن سکتی تھی، اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں، جو بظاہر ان کا عین مقصود ہونا چاہیے تھیں۔ لیکن وہ اس کی پروا نہیں کرتے، اور بات صرف اتنی سی ہے کہ جب میں کوٹھی پر ملاقات کو گیا ہوں، تو کوئی شخص پذیرائی کو کیوں نہیں آیا:

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

یہ استغنا اور آزادہ روی، ان کی خوددار فطرت کا عکس ہے جس میں تصنّع کا کوئی دخل نہیں۔ انسان تصنّع اس وقت کرتا ہے، جب اسے کوئی توقع یا غرض ہو، صلے کی یا ستائش کی۔ ان دونوں موقعوں پر صلہ و ستائش تو درکنار، بجا طور پر نقصان یقینی تھا۔

"غدر" میں ان کا حال بہت پتلا ہو گیا تھا۔ آمدنی کے تمام راستے بند اور خرچ بدستور۔ اس کے باوجود انھوں نے نہایت حوصلہ مندی سے کام لیا۔ ان کے اس زمانے کے بعض خطوط سے حسنِ طلب کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن یہ سب "اضطراری" حرکات ہیں۔ نہ وہ اس کے "عادی" تھے، نہ اس میں "لذت" محسوس کرتے تھے۔ اور ان گنتی کے چند مقامات پر بھی انھوں نے "حد سے تجاوز" نہیں کیا، بلکہ یونہی سا اشارہ کیا ہے۔ ایسے اعمال قابلِ گرفت نہیں ہوا کرتے اور نہ ان سے عام نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جونہی رام پور سے مستقل وظیفہ مقرر ہو گیا، اور اس کے تھوڑی مدت بعد پنشن بھی جاری ہو گئی، تو وہ پھر اصلی روش پر آ گئے۔

احسان مندی

ایک اعلیٰ کردار کی خصوصیت یہ بھی ہوا کرتی ہے کہ وہ دوسروں کا احسان کبھی نہیں بھولتا، خواہ بات کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ "غدر" کے ایام میں میرزا کے بعض ہندو دوستوں نے ان سے بہت ہمدردی کا اظہار کیا اور حتی الوسع ان کی خدمت کرتے رہے۔ میرزا نے دستنبو میں ان اصحاب کا خاص طور پر ذکر کیا، اور لکھا کہ اگرچہ یہ بات معمولی نظر آتی ہے، اور میں اسے آسانی سے نظر انداز کر سکتا تھا، لیکن احسانمندی

کا تقاضا یہ ہے کہ میں ان صاحبوں کا شکریہ ادا کر دوں۔

جوئے کے مقدمے میں جب ان پر ابتلا آئی تو ان دنوں شیفتہ ان سے بہت دلسوزی اور غمخواری سے پیش آئے تھے۔ میرزا نے اپنے مشہور ترکیب بند "اسیریہ" میں ان کی اس خدمت کا پُرجوش اعتراف کیا ہے۔ غدر کے بعد شیفتہ بھی ماخوذ ہو کر سات برس کے لیے جیل خانے بھیج دیے گئے تھے۔ خوش قسمتی سے اپیل میں بری ہو گئے۔ چوں کہ ان کی جاگیر بھی ضبط ہو گئی تھی، اس لیے وہ رہائی کے بعد چند دن میرٹھ میں ایک دوست کے ہاں مقیم رہے تھے۔ جونہی میرزا نے ان کی رہائی کا سنا، فوراً ان کی ملاقات کو میرٹھ گئے اور چار دن وہاں ٹھہرے۔ اُن دنوں دلّی میں آمد و رفت پر جا بجا پابندیاں عائد تھیں۔ اس کے علاوہ کسی "مشکوک" شخص سے راہ و رسم رکھنا کس قدر خطرناک ہو سکتا تھا، اس سے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں لیکن میرزا نے ان باتوں کی پروا نہ کی اور میرٹھ چلے گئے۔ یہ اُسی احسان کا احساس تھا، جو دس گیارہ برس پہلے شیفتہ نے ان سے کیا تھا۔

اسی جذبے کا ایک اور پہلو ملاحظہ ہو۔ جن دنوں سلطان عالم واجد علی شاہ تختِ اودھ پر جلوہ فرما تھے، میرزا نے دو مرتبہ اُن سے خلعت حاصل کیا اور دونوں دفعہ حضرت مجتہد العصر لکھنؤ کے توسط سے۔ اس کے بعد جب شاہِ اودھ معزول ہو کر کلکتے تشریف لے گئے، تو میرزا نے پھر ایک قصیدہ کہا۔ اگرچہ اب قبلہ مجتہد العصر کے توسط کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ ممدوح کلکتے میں تھا اور متوسط لکھنؤ میں، لیکن اس کے باوجود میرزا کے جذبۂ شکر گزاری نے یہ گوارا نہ کیا کہ قصیدہ براہِ راست یا کسی اور واسطے سے نذر گزرانیں۔ اس لیے انھوں نے قصیدہ حسبِ سابق حضرت مجتہد العصر کی خدمت میں لکھنؤ روانہ کر دیا کہ وہ اسے کلکتے بھجوا دیں[۵]۔

انھوں نے ان موقعوں پر جو طرزِ عمل اختیار کیا، وہ اس کے لیے مجبور نہیں تھے۔ اگر وہ خاموش رہتے، تو کوئی شخص ان پر اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن جب کسی بیرونی اثر

---

۵ اردوئے معلّٰی: ۴۲۵؛ خطوطِ غالب (۱): ۲۲۲ (یوسف میرزا)

یا دباؤ کے بغیر، انھوں نے ایسا کیا، تو ماننا پڑیگا کہ یہ واقعی ان کے قلب اور ضمیر کی آواز تھی جس نے انھیں یہ رویّہ اختیار کرنے پر آمادہ کیا تھا۔

مذہب

میرزا کے مذہب کا مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے، جن پر بہت کچھ لکھا گیا ہے حال آں کہ ان کے عقائد سے متعلق کسی قسم کا شبہہ ہو ہی نہیں سکتا۔ دراصل اس بارے میں اختلاف اس سے پیدا ہوا کہ حکیم محمود خان اور نواب ضیاء الدّین احمد خان نے میرزا کی تجہیز و تکفین، اہلِ تشیع کے طریقے پر نہیں ہونے دی۔ اس سے بعض لوگوں نے فرض کر لیا کہ ان دونوں صاحبوں سے اور خاص کر نواب ضیاء الدّین احمد خان سے زیادہ کون ان کے معتقدات سے واقف ہو سکتا تھا۔ اور جب انھوں نے تمام رسوم اہلِ سنّت کے عقیدے کے مطابق ادا کیں، تو یقیناً انھیں معلوم ہو گا کہ میرزا دراصل اسی مسلک کے پیرو تھے اور شیعی نہیں تھے۔ حال آں کہ یہ سراسر مغالطہ ہے۔

جہاں تک اقرار باللسان کا تعلق ہے، وہ ساری عمر کھلے بندوں اپنے شیعی ہونے کا اعلان کرتے رہے اور اس میں ان کے مخاطب سُنّی شیعی دونوں فرقوں سے تعلق رکھنے والے بزرگ تھے۔ فرماتے ہیں:

> میں موحّدِ خالص اور مومنِ کامل ہوں۔ زبان سے لاالٰہ الااللہ کہتا ہوں اور دل میں لاموجود الّا اللہ، لامؤثر فی الوجود الّا اللہ، سمجھے ہوئے ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں مفترض الطاعت تھے۔ محمّد علیہ السّلام پر نبوت ختم ہوئی، یہ خاتم المرسلین اور رحمۃً للعالمین ہیں مقطعِ نبوت کا مطلعِ امامت، اور امامت نہ اجماعی، بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السّلام ہے۔ ثم حسن ثم حسین، اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السّلام۔ ع
>
> برین زیستم ہم برین بگزرم (بنام نواب علاء الدّین احمد خان؛ سُنّی)

"غالب، اثنا عشری حیدری" (بنام غلام حسنین قدر بلگرامی؛ شیعی)

بندۂ علی ابن ابی طالب، اسد اللہ المتخلص بغالب (بنام محمد حسین ناخدائے شیرازی: شیعی)

عطیۂ حضرت بتوسطِ جناب سیف الحق پہنچا اور میں نے اس کو بے تکلف عطیۂ مرتضوی سمجھا۔ علی مرتضیٰ علیہ التحیۃ والثنا آپ کا دادا اور میرا آقا۔ خدا کا احسان ہے کہ میں احسان مند بھی ہوا، تو اپنے خداوند کے پوتے کا۔ (بنام نواب میر غلام بابا خان بہادر: سُنّی)

میں علی کا غلام اور اولادِ علی کا خانہ زاد۔ (بنام حکیم سید احمد حسین مودودی: سُنّی)

صاحب بندہ! اثنا عشری ہوں۔ ہر مطلب کے خاتمہ پر ۱۲ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو۔ ہم تم ایک آقا کے غلام ہیں۔ (بنام میرزا حاتم علی مہر: شیعی)

جانتے ہو کہ علی کا بندہ ہوں۔ اس کی قسم جھوٹ کبھی نہیں کھاتا۔ (بنام یوسف میرزا: شیعی)

خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام یہی ہے مذہبِ حق، والسلام والاکرام
علی علی کیا کر اور فارغ البال رہا کر۔ (مجروح: سُنّی)

امامت من اللہ کا ثبوت انھوں نے ایک قصیدے میں یوں دینے کی کوشش کی ہے:

حقا کہ لفظِ احمدؐ و لطفے کہ تحت اوست گنجیست شایگان و طلسمیست استوار
اما پئے کشایشِ ایں معنوی طلسم نطرت شگرف قاعدۂ کرد اختیار
باید نخست میم ز احمدؐ فرا گرفت کاں میم اسم ذات نبی راست پردہ دار

ہر گہ بر ئمین معرفتِ ذاتِ احمدی	میم از میانہ رفت و احد گست آشکار
بے پردہ بنگر از الف، اللہ جلوہ گر	وز حا و دال بشمر و دریاب ہشت و چار

اور اس عقیدے پر وہ بہت ابتدا سے قائم تھے۔ مثنوی ابرِ گہر بار غالباً ۱۸۴۵ء میں مکمل ہو چکی تھی، یہی بات اس کے منقبت کے باب میں بھی لکھتے ہیں:

علی راست بعد از نبی جاے اُو	ہماں حکم کل دارد اجزائے اُو
ہمانا پس از خاتم المرسلین	بود تا بمہدی علی جانشین
نژادِ علی با محمدؐ یکے است	محمدؐ ہماں تا محمدؐ یکے است
در احمد الف نام ایزد بود	ز میم آشکارا محمدؐ بود
الف میم را چوں شوی خواستار	نماند ز احمدؐ بجز ہشت و چار

اور آگے چل کر حضرت علیؓ سے اپنی دیرینہ نیازمندی کا اظہار یوں کیا ہے:

کہ تا کینہ از مہر بشناختم	بکس غیرِ حیدر نہ پرداختم
جوانی بریں در، بسر کردہ ام	شبے در خیالش سحر کردہ ام

یعنی "میں نے جب سے ہوش سنبھالا اور کینے اور محبت کے درمیان فرق کرنا سیکھا اسی دن سے حضرت علی کے سوائے کسی دوسرے سے سروکار نہیں رکھا؛ اُسی کے در پر اپنی جوانی کے ایام بسر کر دیے اور اُسی کی یاد میں راتیں گزار دیں" - اور انھوں نے اس میں کوئی مبالغہ نہیں کیا، ان کے ابتدائی زمانے کے کلام میں بھی جو ان کے نو دریافت دستخطی دیوان میں شامل ہے، اس طرح کے کئی شعر موجود ہیں:

خیالِ شربتِ عیسیٰ گدازِ ترجبینی ہے	اسدؔ اہوں مست دریا بخشیِ ساقیِ کوثر کا
اسدؔ کے واسطے رنگ بروئے کار ہویدا	غبار آوارہ و سرگشتہ ہے، یا بوتراب، اس کا
اسدِ خستہ گرفتارِ دو عالم اوہام	مشکل آساں کن یک خلق، تغافل تا چند!

ہزار آفت و یک جانِ مستمندِ اسد — خدا کے واسطے، اے شاہِ بیکساں! فریاد

اسد! از دُودِ آتش ابرِ دریا بار ہو پیدا — اگر ناگاہ ہو حیدر پرستوں سے دوچار آتش

اسد! قدرت سے حیدر کی پڑی ہو گر ورسلکے — شرارِ سنگِ بت سے در بنائے اعتقاد آتش

غالب! ہے رتبۂ فہم تصور سے کچھ پرے — ہے عجزِ بندگی، جو علی کو خدا کہوں

شمع ہوں، تو بزم میں جا پاؤں غالب کی طرح — بے محل، اے مجلس آرائے نجف! جلتا ہوں میں

اسد! کیوں نہ ہو امیدِ لطفِ بندہ نوازی — علیِ ولی، اسد اللہ! جانشینِ نبی ہے!

کثرتِ اندوہ سے حیران و مضطر ہے اسد — یا علی! وقتِ عنایات و دمِ تائید ہے

اسد! گر دانۂ دُرِ نجف تعویذِ بازو ہو — غریقِ بحر جوں تمثال در آئینہ رہتا ہے

اسد! جہاں کہ علی بر سرِ نوازش ہو — کشادِ عقدۂ دشوار کار آسان ہے

اے اسد! مایوس مت ہو، از درِ شاہِ نجف — صاحبِ دلہا، وکیل حضرتِ اللہ ہے

ہو جہاں اورنگ آرا جانشینِ مصطفےٰ — واں، اسد! تختِ سلیماں نقشِ پائے مور ہے

بلکہ اس نسخے کا آغاز ہی "یا علی المرتضیٰ علی اولادہ الصّلوٰۃ والسّلام" اور "یا حسنؑ" اور "یا حسینؑ" سے ہوتا ہے۔ یہ بیانات پڑھنے کے بعد ناممکن ہے کہ کوئی شخص انھیں

شیعیانِ علی کے سوائے کسی دوسرے گروہ میں شمار کرسکے۔ یہ تمام کلام ۱۸۱۶ء سے پہلے کا ہے، جب کہ ان کی عمر ۱۹ برس سے بھی کم کی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اس زمانے میں بھی حضرت علیؓ اور شیعیت میں کتنا گہرا اعتقاد رکھتے تھے۔ یہ ہی نہیں، وہ بعض اوقات ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں، جو انھیں غلو اور اغراق کی حد میں لے آتی ہیں، مثلاً ایک قطعہ میں کہتے ہیں:

تا بود جار عید در عالم   بر تو، یارب، اِنجستہ باد و بجیر

عیدِ شوّال و عید ذی الحجہ   عیدِ بابا شجاع و عیدِ غدیر[1]

لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ بالعموم ان کی شیعیت صرف اسی حد تک ہے کہ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو تمام دوسرے صحابہ پر ترجیح دیتے ہیں، مثلاً ایک جگہ انھوں نے باقی صحابۂ رسول کو ستاروں سے اور حضرت علیؓ کو چاند سے تشبیہ دی ہے۔ لکھتے ہیں:

شرطست کہ بہرِ ضبطِ آداب و رسوم   خیزد بعد از نبی، امامِ معصوم

زاجماع چہ گوئی، بہ علیؓ باز گرائے   مہ جائے نشینِ مہر باشد، نہ نجوم

بلکہ انھوں نے ایک جگہ حضرت علیؓ اور پہلے تین خلفا میں تفاوت کا ایک عجیب و غریب نظریہ پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ تینوں حضرات محض خلیفہ تھے، لیکن امام صرف حضرت علیؓ تھے؛ خلافت دنیوی اور مادی امور سے متعلق ہے، اور امامت دینی اور

---

[1] یہاں چوتھے مصرعے میں جن دو عیدوں کا ذکر ہے، یہ شیعی حضرات سے مخصوص ہیں۔ "بابا شجاع" اس ایرانی غلام کا شیعی لقب ہے جس نے خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کو قتل کیا تھا، اس کا نام فیروز اور کنیت ابو لؤلؤ تھی۔ اُسے اس جرم کی پاداش میں قتل کیا گیا تھا۔ جس دن اس کی موت ہوئی ہے، شیعی حضرات اسے بطور عید مناتے ہیں۔

"عیدِ غدیر" ۱۸ ذی الحجہ کو ہوتی ہے۔ بقول شیعی حضرات اس دن حضرت رسولِ کریم صلعم نے خُم نامی ایک تالاب (غدیر) کے قریب ایک خطبے میں حضرت علیؓ کو اپنا جانشین اور خلیفہ مقرر فرمایا تھا۔

روحانی امور سے؛ اور اسی لیے یہ من جانب اللہ ہے[1]۔ یہ امتیاز بالکل بے بنیاد بلکہ غلط ہے؛ یہ شیعی عقیدہ بھی نہیں، لہٰذا اس پر بحث غیر ضروری ہے۔ لیکن اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے شیعی عقائد میں کس حد تک پختہ تھے۔

ہم ان کی شیعیت کی مختصر لفظوں میں یوں بھی تعبیر کر سکتے ہیں، کہ اس کا امتیازی نشان تبرّا نہیں، بلکہ تولّا ہے، یعنی وہ عموماً دوسرے صحابہ پر تبرّا نہیں کرتے، بلکہ حضرت علیؓ سے اپنے تولّا اور محبّت کا شدّت سے اظہار کرتے ہیں۔

اس فیصلے میں ایک اور بات بھی ہماری تائید کرتی ہے۔ شیعیت کو اگرچہ کلّیہ کی حیثیت سے تو بیشک نہیں، لیکن بالعموم تصوّف سے ایک قسم کا بَیر ضرور رہا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں شیخ اور بیعت کا تصوّر سرے سے مفقود ہے۔ بقول سیّد علی بلگرامی شیعہ حضرات کو حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ سے اس لیے کد ہے کہ اس سے ان کی آدھی سلطنت چھن گئی۔ اگر ان حضراتِ صوفیہ کی تعلیم نہ ہوتی تو آج سب مسلمان شیعہ مسلک کے پیرو ہوتے[2]۔ خیر، یہ تو لطیفہ ہے، لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ شیعی، صوفی نہیں ہو سکتا۔ غالب کے دوست مفتی میر محمد عباس شوستری تو تصوف سے برأت کا اظہار کرتے ہوئے اپنی مثنوی "مَنّ و سلویٰ" میں اس حد تک چلے گئے ہیں:

ایں کلامِ صوفیانِ شوم نیست مثنوی مولویِ رُوم نیست

اہلِ نظر سے مخفی نہیں کہ جب ایران میں سولھویں صدی عیسوی میں صفوی خاندان برسرِ اقتدار آیا اور شیعیت ملک اور حکومت کا مذہب قرار پائی، تو ایران سے تصوّف کی شاعری بھی ختم ہو گئی۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد اِلّا ماشاءَ اللہ وہاں سے کوئی قابلِ ذکر صوفی شاعر پیدا نہیں ہوا۔ اس کے مقابلے میں میرزا اپنے تصوّف کا بھی اسی شدّ و مد سے اعلان کرتے ہیں، جتنا شیعیت کا:

ہیچو من شاعر و صوفی و نجومی و حکیم نیست در دہر قلم مدّعی نکتہ گواست

۱۔ معارف (مئی ۱۹۶۰ء): ۳۸۸-۳۸۹

۲۔ چند ہم عصر: ۱۰۲

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالب! تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

میں صوفی ہوں، ہمہ اُوست کا دم بھرتا ہوں ۔ (بنام سرفراز حسین)

صبر و تسلیم و توکل و رضا شیوہ صوفیہ کا ہے ۔ مجھ سے زیادہ اس کو کون سمجھیگا۔

(بنام مجروح)

یہاں اس سے بحث نہیں کہ ان کا تصوّف محض قال ہے اور اس کا حال سے کوئی تعلق نہیں! یا یہ بیدل کے غائر مطالعے اور اس کی نقل میں شاعری کرنے کا نتیجہ ہے! غور کرنے کی بات یہ ہے کہ وہ شیعیت کے تمام مسلّمہ تصورات کے برخلاف تصوّف میں دلچسپی لیتے اور اس کا برملا اعلان کرتے ہیں ۔ بلکہ ان کا یہ ادّعا صرف قول ہی کی حد تک نہیں، وہ حضرت مولانا فخر الدّین رح کے پوتے مولانا نصیر الدین رح عرف میاں کالے سے بیعت بھی تھے ؎ کون کٹّر شیعی، کسی غیر شیعی سنّی صوفی کے ہاتھ پر بیعت کرلیگا؟

پس مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ خدا کی وحدانیت پر کامل یقین رکھتے ہیں، اور نجات کے لیے نبوت پر ایمان کو واجب سمجھتے ہیں ۔ نبوت کے بعد امامتِ مرتضوی کے قائل ہیں اور اسی طرح بارہ اماموں پر اعتقاد رکھتے ہیں اور امامت کے من اللہ ہونے کے معتقد ہیں ۔ وہ تمام صحابہ کا ادب کرتے ہیں ۔ لیکن حضرت علی کو نہ صرف سب صحابہ پر ترجیح اور تفضیلت دیتے ہیں، بلکہ انھیں امام من اللہ مانتے ہیں ۔ یہی

؎ میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں :

سنو، میر نصیر الدین اولاد میں سے ہیں، شاہ محمد اعظم صاحب کے ؛ وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے، اور میں مرید ہوں اس خاندان کا (اردوے معلّیٰ : ۲۸ ؛ خطوطِ غالب (۱) : ۲۹۵)

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مولانا فخر الدین رح اور ان کے صاحبزادے مولانا غلام قطب الدّین رح دونوں کا آگے پیچھے ۱۷۸۵ء میں یعنی غالب کی ولادت سے بارہ تیرہ برس پہلے انتقال ہوا ۔ ظاہر ہے کہ وہ مولانا غلام قطب الدّین رح کے صاحبزادے میاں کالے صاحب ہی کے مرید ہوسکتے ہیں ۔

اثنا عشری عقیدہ ہے۔[۱]

یہاں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ کونسا خارجی اثر تھا جس کے تحت انھوں نے شیعیت اختیار کی کیوں کہ ان کے والدین اور ان کی ننھیال کے لوگ جہاں ان کی پرورش ہوئی سب سُنّی طریقے کے پابند تھے۔ آبا کے اہلِ سنّت والجماعت ہونے کا اقرار خود انھوں نے بھی کیا ہے۔ ایک جگہ حضرت علی علیہ السّلام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں[۲]:

فرجام کار بہ نجفِ اشرف برسم و مزارِ آں راکہ از کیشِ آبایم بدر آورد بیخود بخود کشید، بنگرم؛ مستانہ جان دہم و سر بہ بالینِ فنا نہم۔

۱۔ یہاں غالباً ایک دلچسپ خبر کا تذکرہ نامناسب نہیں ہوگا۔ میرزا کی وفات کے بعد آگرے کے ماہانہ رسالے "ذخیرۂ بال گوبند" کے مارچ ۱۸۶۹ء کے شمارے میں ان سے متعلق ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس میں یہ عبارت بھی تھی:

ایک عرصہ ہوا جب یہ نامی شاعر زیورِ اسلام اتار کر حلیۂ فریمیسن سے آراستہ ہوا تھا۔ ہر چند اس کے احباب نے حال اس مذہبِ نو اختیار کا اور کیفیت فریمیسن ہؤس کی دھوکا دے دے کر بھی دریافت کی، پر اس نے ایک کلمہ بھی اپنی زبان سے نہ نکالا۔ یہی کہے گیا کہ کچھ نہ پوچھو۔ (احوالِ غالب: ۲۱) یہی بات ان کے ایک شاگرد حکیم محمد اشفاق حسین زکی نے بھی کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ: "اخیر میں وہ فرامسن ہو گئے تھے۔" (زمانہ (کانپور) جنوری ۱۹۴۹ء: ۹) آیا میرزا فریمیسنی حلقے میں شامل ہوئے یا نہیں، اس سے متعلق تو یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، اور اگر وہ انگریز دوستوں کے خوش کرنے کو اس جماعت کے رکن بن گئے ہوں، تو تعجب کا مقام بھی نہیں۔ لیکن "زیورِ اسلام" اتارنے کی بات تو ظاہر ہے کہ غلط ہے۔ قطع نظر اس سے کہ ان کی کئی اپنی تحریریں اس کی تردید میں پیش کی جا سکتی ہیں، فریمیسنیوں میں شامل ہونے کے لیے آبائی مذہب ترک کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

۲۔ متفرقاتِ غالب: ۱۰۱۔ مولانا حالی بھی لکھتے ہیں کہ "جہاں تک ہم کو معلوم ہے میرزا کے والد سُنّی المذہب تھے۔" (یادگارِ غالب: ۲۰۳) مولانا محمد حسین آزاد نے بھی یہی لکھا ہے۔ (آبِ حیات: ۶۴۲) نیز نگار (رام پور) فروری ۱۹۶۳ء ص ۱۰

میرا خیال ہے کہ اس میں ملّا عبدالصمد کی صحبت کو بہت دخل رہا ہو گا۔ اہلِ ایران کی بھاری اکثریت شیعی مسلک کی پیرو ہے۔ یہ بہت حد تک یقین سے کہا جا سکتا ہے، کہ ملّا عبدالصمد بھی اپنے ماحول کے اقتضا سے اسی عقیدے کے ماننے والے ہونگے۔ میرزا نے تیرہ چودہ برس کی عمر میں اُن سے تعلیم حاصل کی، اور یہ وہ زمانہ ہے جب انسان کی طبیعت بہت جلد بیرونی اثر قبول کر لیتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے تعلقات نواب حسام الدین حیدر خان کے خاندان سے نہایت ابتدائی زمانے سے تھے، اور ان کے صاحبزادے ناظر حسین میرزا ان کے ہمجولی تھے۔ نواب علاءالدین احمد خان نے اس سلسلے میں بخشی محمود رضا خان کا بھی نام لیا ہے[۵]۔ یہ دونوں خاندان بھی کٹر شیعی تھے۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ ان اثرات نے مجموعی طور پر مل کر میرزا کو بھی شیعیت کی طرف مائل کر دیا ہو۔

اگرچہ کسی شاعر کی غزلوں سے اُس کے مذہبی معتقدات پر بحث کرنا، درست طریقہ نہیں، لیکن بعض اوقات شاعر اس پردے میں اپنے تجربات بیان کر جاتا ہے۔ غالب کی ایک غزل میں بھی ایک شعر ایسا ہے، جو ان کی آپ بیتی معلوم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

با من میاویز، اے پدر! فرزندِ آزر را نگر،
ہر کس کہ شد صاحب نظر، دینِ بزرگاں خوش نکرد

اگر یہ قیاس درست ہو، تو ہم اس سے یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ اُن کی تبدیلیِ مسلک پر گھر میں ان کی مخالفت ہوئی تھی۔ پدر میں ممکن ہے کہ ان کا اشارہ اپنے نانا میرزا غلام حسین خان کمیدان کی طرف ہو۔

آپ نے اوپر میرزا غالب کی زندگی کا ایک ہلکا سا خاکا دیکھا ہے۔ آج جب کہ ان کی وفات پر اتنا لمبا عرصہ گذر چکا ہے، ہمارے لیے ممکن نہیں کہ اس خاکے میں مزید رنگ و روغن بھر سکیں۔ بیشک، یہ حالات بہت مختصر ہیں، لیکن اس سے زیادہ مل بھی نہیں

۵۔ نگار (رام پور)۔ فروری ۱۹۶۳ء: ۱۰

سکتے ۔ جن لوگوں نے انھیں اپنی آنکھوں دیکھا تھا، وہ اللہ کو پیارے ہو چکے۔ انیسویں صدی میں ہمارے تذکرہ نویسوں کی جو روش تھی، اس کے پیش نظر ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کسی شاعر کے حالات میں تفصیل سے کام لیتے، امید موہوم سے زیادہ نہیں۔ وہ تو خوش قسمتی سمجھیے کہ میرزا کے اپنے فارسی اور اردو خط چھپے ہوئے موجود ہیں، جو ایک طرح سے مصنف کی خود نوشت سوانح عمری ہے، ورنہ اتنا بھی ممکن نہ تھا۔

آپ نے ان صفحوں میں ایک بولتی چالتی شخصیت کی تصویر ملاحظہ فرمائی۔ وہ ہمارے ہی جیسے گوشت پوست کے انسان تھے۔ ان میں جہاں انسانی کردار کی بلندیاں ملتی ہیں، وہیں بشری کمزوریوں کی پستیاں بھی موجود ہیں۔ وہ اپنی قوم کی بیشتر خصوصیات کے حامل ہیں میرزا قوم کے ترک تھے۔ ترک دوستوں سے وفاپرستی، عیش و عشرت سے دلچسپی، مذہب سے اوپری عقیدت، لیکن دراصل آزادہ روی، دشمنی اور مخالفت میں ضد اور انجام سے بے پروائی کے لیے مشہور ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ان میں سے ہر ایک صفت میرزا کی فطرت کا جُز رہی ہے۔ وہ دوست نواز ایسے ہیں کہ اپنے منہ کا نوالا دوست کے حوالے کر دیں اور خود فاقے سے رہنے میں دریغ نہ کریں۔ ہم نے کئی مثالیں ہدیۂ ناظرین کی ہیں، اور ان میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ عیش پرستی پر مزید لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ یہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ترکوں کے مذہب سے متعلق کتنی ہی غلط فہمیاں ہیں، جو عوام میں پھیلی ہوئی ہیں۔ مگر اس سلسلے میں ایک بات یاد رہے، کہ وہ اسلام پر ایمان لے آئے، تو اس لیے نہیں کہ انھوں نے اسے اپنے مذہب سے بہتر پایا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ ان کا اپنا مذہب کوئی تھا ہی نہیں؛ اور ان کی فطرت اس وقت ایک مذہب کی طلبگار تھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اسلام ان کے سامنے آ گیا۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے اس کے بعد اسلام کی خدمت بھی کی اور اسلام کو ان کے ذریعے سے مادی تقویت اور دنیوی رعب بھی حاصل ہوا، لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان کا اسلام ہمیشہ بہت حد تک سطحی رہا اور ان کے اعتقاد میں کبھی گہرائی اور رضیت نہیں پیدا ہوئی اور وہ عام طور پر آزاد منش رہے۔ کیا میرزا غالب کا اسلام اس سے کچھ مختلف ہے؟

وفا پرستی، ترکی تاریخ کا درخشاں باب ہے۔ دور کیوں جائیں، صرف آخری دونوں عالم گیر جنگوں ہی کو لے لیجیے۔ انھوں نے جسے حلیف بنایا، اس سے آخر تک نباہی۔ اس میں ان پر مشکلیں بھی پڑیں بعض اوقات چاروں طرف سے خطرے کے بادل امنڈ امنڈ کر آئے اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ ابھی پھٹ پڑینگے اور ترکوں کو ایک ہی ریلے میں خس وخاشاک کی طرح بہالے جائینگے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے قدم نہ ڈگمگائے اور وہ اپنی جگہ پر چٹان کی طرح قائم رہے۔

میرزا کی سوانح عمری دیکھیں، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انھوں نے امین الدین احمد خان اور ضیاء الدین احمد خان دونوں بھائیوں کے پہلو بہ پہلو ان کے حریف نواب شمس الدین احمد خان کا مقابلہ کیا اور انجام سے بے پروا ہو کر۔ پھر غلط یا صحیح، انھوں نے ہندستان کے فارسی نویسوں کے خلاف آواز اٹھائی اور یوں گویا ہندستان بھر کے قدامت پرستوں اور لکیر پیٹنے والوں کی دشمنی مول لے لی۔ اس میں انھیں کیا کچھ سننا اور جھیلنا پڑا۔ لیکن کیا انھوں نے ڈر کے اس سے ہاتھ کھینچ لیا؟ کیا اس مخالفت سے ان کے کلام کی گرمی "مدھم پڑ گئی" یا ان کے "قلم کی آتش افشانی" میں کمی آگئی؟ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، ان کے اعتراضوں کی شدت بڑھتی گئی اور وہ مرتے دم تک اسی عقیدے پر قائم رہے ہیں۔

البتہ ان میں ایک صفت ایسی تھی جو ترکوں میں نہیں پائی جاتی۔ ترکوں میں ایجاد اور اختراع کا مادہ سرے سے نہیں۔ آپ کوئی ایسی مثال پیش نہیں کرسکتے، جہاں کسی ترک نے کسی میدان میں کوئی نئی دریافت کی ہو۔ میرزا اس کلیہ سے مستثنیٰ تھے۔ ان کے آبا واجداد سو پشت سے سپہگری کرتے آئے تھے۔ انھوں نے اس کے خلاف شاعری اور علم وادب کا پیشہ اختیار کیا۔ نظم ونثر کا جو سرمایہ اُن سے پہلے موجود تھا، وہ آج بھی ہمارے سامنے ہے۔ اگر وہ اسی راہ پر چلے جاتے، جو ان کے پیشرو پامال کرچکے تھے، تو اس میں وہ کون سا امتیاز حاصل کرسکتے تھے! لیکن انھوں نے اسے بالکل چھوڑ دیا اور اپنے لیے ایک نئی راہ بنانے کی کوشش کی، اس میں انھیں قدرتاً وہی دقتیں پیش آئیں، جو

ہر فن کے پہلے رہنما اور محقق کو پیش آیا کرتی ہیں۔

لوگ میرزا کی زبان اور اسلوبِ بیان پر اعتراض کرتے ہیں۔ اگرچہ بسا اوقات ان میں سے بیشتر خود معترض کی کم علمی پر مبنی ہوتے ہیں، تاہم اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ان میں سے بعض واقعی درست ہیں۔ لیکن اس میں میرزا کا کیا قصور! انھوں نے اُردُو کی محدود وسعت میں وہ خیالات ادا کرنے کی کوشش کی، جو اُن سے پہلے ہمارے ہاں موجود نہیں تھے۔ نتیجہ غیر متوقع نہیں تھا۔ اگر آپ کسی بڑے تن و توش کے آدمی کو تنگ کپڑے پہنانے لگیں، تو لازماً کہیں سے کپڑا مسک جائیگا اور کہیں سے اس کے ٹانکے کھل جائینگے۔ غالب جو خیالات پیش کر رہے تھے، ان کے لیے ہماری زبان میں الفاظ یا ترکیبیں موجود ہی نہیں تھیں۔ بس انھوں نے کچھ فارسی سے مستعار لیا، کچھ خود گڑھا اور اہلِ نظر کے سامنے حاضر کر دیا۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کبھی اتنی جرأت بھی نہ کر سکتا۔ لیکن تہوّر اور شجاعت بھی ترکوں کا مایۂ ناز نشان ہے؛ میرزا کیوں ڈرتے۔ ان میں ایک مصلح کی روح تھی؛ انھیں اپنے راہِ راست پر ہونے کا یقین تھا۔ لوگوں نے کیا کچھ نہ کہا! جب مشاعرے کی بھری محفل میں ان کا مذاق اڑایا گیا اور اُن کے کلام کی مہمل نقلیں اتاری گئیں، تو خلوت کی مجلسوں میں کیا کچھ نہ ہوتا ہوگا! لیکن میرزا نے اس مخالفت اور تمسخر کی ذرّہ برابر پروا نہ کی اور جو راہ اپنے لیے پہلے دن تجویز کر لی تھی، اس سے اِدھر اُدھر نہ ہوئے۔ زمانہ سب سے بڑا قاضی ہے؛ اس کا فیصلہ ہمارے سامنے ہے۔ آج ہمیں یہ معلوم کرنے میں کہ کون غلطی پر تھا اور کون حق پر کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

ہم یہ مانتے ہیں کہ ان کے ابتدائی کلام میں آورد اور تصنع کی بھرمار ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ کہیں کہیں اُن سے محاورے میں بھی لغزش ہو گئی ہے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، ان کی زبان میں حلاوت پیدا ہوتی گئی اور ان کے بیان میں آمد اور بےساختگی کا پہلو غالب ہوتا گیا۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ وہ اتنی کامیابی بھی حاصل کر سکے۔ ان کے سامنے کوئی مثال نہیں تھی، جس کی وہ نقل کر سکتے تھے۔ انھوں نے جو کچھ کیا، اپنے

بل بوتے پر کیا۔ ہم ان کے کلام کے عیوب سے انکار نہیں کرتے، لیکن ہمیں اصرار ہے کہ ان کے مقابلے میں ان کی خوبیوں اور دور رس نتائج کا پلہ کہیں بھاری ہے۔

ہماری شاعری میں انیسویں صدی کے آخر میں جو اصلاحی تحریک شروع ہوئی، اس کے سب سے پہلے علم بردار آزاد اور حالی تھے؛ اور یہ دونوں براہِ راست میرزا سے متأثر ہوئے۔ حالی تو میرزا کے شاگرد بھی تھے۔ اقبال نے مشرق اور مغرب کے علمی اور ادبی خزانوں سے استفادہ کیا اور اس پر اپنی ژرف نگاہی اور غور و فکر سے بہت کچھ اضافہ کر کے ہماری زبان کے دامن کو مالا مال کر دیا۔ لیکن کیا اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ اقبال، غالب کے معنوی فرزند ہیں! اگر غالب نے اردو شاعری کو نئی شاہراہ پر نہ ڈال دیا ہوتا اور آزاد اور حالی نے اس پر سنگِ میل نہ قائم کیے ہوتے، تو اقبال، اقبال نہ ہوتے؛ اور اگر ہوتے بھی تو کم از کم اتنی دور دراز کی مسافت طے کر کے وہ ہمارے ادب کو منزلِ مقصود کے اتنا قریب نہ پہنچا سکے ہوتے کہ آج ہمیں سوادِ منزل سامنے نظر آ رہا ہے۔

کسی زندگی کی عظمت صرف اسی بات پر منحصر نہیں کہ اس میں فتوحات اور کارنامے ہوں، یا اس میں غیر معمولی ایثار و قربانی کے واقعات ہوں۔ بیشک یہ بھی ایک معیار ہے۔ لیکن اس کا دوسرا رُخ بھی ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ آپ نے دنیا کے اطمینان اور راحت و مسرت میں کیا اضافہ کیا۔ آپ کے چہرے پر کھیلنے والی مسکراہٹ جو آپ کے آس پاس رہنے والوں کو خوش و خرم بناتی رہی؛ آپ کی وہ لطف آمیز گفتگو جو آپ نے کسی سوالی اور بھک منگے سے کی۔ حال آں کہ آپ نے اس کے پھیلے ہوتے ہاتھ پر ایک کھوٹی کوڑی بھی نہیں رکھی تھی؛ آپ کی وہ معمولی معمولی نوازشیں اور مہربانیاں، جن سے آپ نے بنی نوعِ انسان کو خوش وقت کیا۔ غرض کہ آپ کے وہ چھوٹے چھوٹے کام جن سے آپ کے ملنے والے ہمیشہ دوچار ہوتے رہے، آپ کی زندگی کو شاندار اور عظیم الشان بنانے کے لیے کافی ہیں۔ آپ اس معیار سے دیکھیں، تو آپ کو میرزا کی زندگی بہت

کامیاب اور بہت شاندار معلوم ہوگی۔ اور ان کا یہ فیضان آج بھی جاری ہے؛ اور جب تک اُردو اور فارسی زبانیں بولی اور سمجھی جائینگی، یہ جاری رہیگا۔ ایسے لوگ ہر روز نہیں پیدا ہوتے۔ خود میرزا نے ایک شعر میں یہی مضمون بیان کیا ہے:

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ
چوں من از دُودۂ آزر نفَساں برخیزد

کتابیات

غالب کی تصنیفات

کلیاتِ غالب (نظم فارسی)	نولکشور، لکھنؤ (۱۹۲۴ء)
سبدِ چین (مرتبہ مالک رام)	جید برقی پریس دہلی (۱۹۳۸ء)
کلیاتِ نثرِ غالب (فارسی)	نولکشور پریس، کانپور (۱۸۷۵ء)
متفرقاتِ غالب (مرتبہ سید مسعود حسن رضوی)	ہندوستان پریس، رام پور (۱۹۴۷ء)
مآثرِ غالب (مرتبہ قاضی عبدالودود)	(بشمول علی گڑھ میگزین) مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ (۱۹۴۹ء)
درفشِ کاویانی	اکمل المطابع دہلی (۱۸۶۵ء)
نامہ ہائے فارسی غالب (مرتبہ اکبر علی ترمذی)	اعلیٰ پرنٹنگ پریس، دلی (۱۹۶۹ء)
تیغِ تیز	اکمل المطابع دہلی (۱۸۶۷ء)
لطائفِ غیبی	" " (۱۸۶۴ء)
سوالاتِ عبدالکریم	" " (۱۸۶۴ء)
اردوئے معلّیٰ	مطبع کریمی، لاہور (۱۹۲۲ء)
عودِ ہندی	نولکشور پریس لکھنؤ (۱۹۲۵ء)
مکاتیبِ غالب (مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی)	ناظم پریس، رام پور (۱۹۴۹ء)
نادراتِ غالب (مرتبہ آفاق حسین آفاق)	مشہور پریس، کراچی (۱۹۴۹ء)

کتاب	مطبع
ادبی خطوطِ غالب (مرتبہ مرزا محمد عسکری)	انوار المطابع لکھنؤ (۱۹۳۳ء)
خطوطِ غالب (مرتبہ مہیش پرشاد) (مالک رام)	سرفراز قومی پریس، لکھنؤ (۱۹۶۲ء)
انتخابِ غالب (مرتبہ عبدالرزاق)	دین محمد پریس، لاہور (۱۹۴۳ء)
باغِ دو در (مرتبہ وزیر الحسن عابدی)	پنجابی ادبی اکیڈمی پریس، لاہور (۱۹۷۰ء)

دوسرے مصنفوں کی کتابیں

کتاب	مطبع
آبِ حیات، محمد حسین آزاد	سرفراز پریس لکھنؤ (۱۹۵۴ء)
۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ از عبداللطیف (مرتبہ خلیق احمد نظامی)	الجمعیۃ پریس، (۱۹۵۸ء)
احوالِ غالب (مرتبہ مختار الدین احمد)	دہلی پرنٹنگ ورکس، دہلی (۱۹۵۳ء)
انتخابِ یادگار، امیر مینائیؒ	تاج المطابع، رام پور (۱۲۹۷ء)
تاریخِ اودھ (۵) محمد نجم الغنی	نول کشور، لکھنؤ (۱۹۲۰ء)
تاریخِ صحافتِ اردو، امداد صابری	فاروقی پریس دہلی (۱۹۵۳ء)
تذکرۂ کاملانِ رام پور۔ احمد علی خان شوق	ہمدرد پریس، دہلی (۱۹۲۹ء)
تقویت الایمان، محمد اسمٰعیل شہید رحؒ	مطبع مصطفائیؒ، دہلی (۱۲۹۶ھ)
تلامذۂ غالب، مالک رام	کوہ نور پرنٹنگ پریس، دہلی (۱۹۵۸ء)
چراغِ دہلی، میرزا حیرت	کرزن پریس، دہلی (۱۹۰۶ء)
چند ہم عصر، عبدالحق	سرفراز قومی پریس، لکھنؤ (۱۹۵۷ء)
حیاتِ جاوید، حالی	لطیفی پریس، دہلی (۱۹۳۹ء)
حیاتِ غالب، محمد اکرام	فیروز سنز، لاہور
خاش و خماش، حبیب اللہ خان ذکا	مطبع اخبار آصفی حیدر آباد (۱۳۰۳ھ)
خدنگِ غدر، از معین الدین حسن	جمال پرنٹنگ پریس، دلّی (۱۹۷۲ء)
دہلی کا آخری سانس، مرتبہ حسن نظامی	دلّی پرنٹنگ ورکس، دہلی (۱۹۲۵ء)

دیوانِ ذوق، مرتبہ آزاد — علمی پرنٹنگ ورکس، دہلی (۱۹۳۳ء)

زندگانیِ بے نظیر، عبد الغفور شہباز — نول کشور، لکھنؤ (۱۹۰۰ء)

سیر سیاح، میاں داد خان سیاح — " " (۱۸۷۲ء)

شرح اردو دیوانِ غالب، علی حیدر نظم طباطبائیؔ — انوار بک ڈپو، لکھنؤ (۱۹۵۴ء)

شرح دیوانِ غالب، حسرت موہانی

طبقات الشعراء ہند، مولوی کریم الدین — مطبع العلوم، دہلی (۱۸۴۸ء)

عیار الشعراء، خوب چند ذکا (قلمی) — مخطوطہ انڈیا آفس، لنڈن

غالب، غلام رسول مہر — عالمگیر الیکٹرک پریس، لاہور (۱۹۴۶ء)

غدر کا نتیجہ، غلام حسن خان محو (مرتبہ حسن نظامی) — محبوب المطابع، دہلی (۱۹۲۶ء)

غدر کی صبح و شام (مرتبہ حسن نظامی) — ہمدرد پریس، دہلی (۱۹۲۶ء)

فسانۂ غالب، مالک رام — لبرٹی آرٹ پریس، دلی (۱۹۷۵ء)

کلامِ عاصی، گھنشیام لال عاصی — دیال پرنٹنگ پریس، دہلی (۱۹۴۰ء)

گلستانِ بے خزاں، قطب الدین باطن — نولکشور، لکھنؤ (۱۲۹۱ھ)

لال قلعہ کی ایک جھلک، ناصر نذیر فراق — امپریل پرنٹنگ پریس، دہلی۔ (طبع چہارم)

مرحوم دہلی کالج، عبد الحق — مفیدِ عام پریس، لاہور (۱۹۴۵ء)

مرقع الور، محمد مخدوم تھانوی — مطبع آگرہ اخبار، آگرہ (۱۸۷۶ء)

مکتوباتِ آزاد، محمد حسین آزاد (مرتبہ محمد طاہر) (۱۹۲۳ء)

نامۂ خسرواں، مرزا جلال الدین — مطبع روزنامہ شفق، حیدر آباد (۱۲۹۷ھ)

نقشِ آزاد، ابو الکلام آزاد — علمی پرنٹنگ پریس، لاہور (۱۹۵۹ء)

واقعاتِ دار الحکومتِ دہلی، بشیر الدین احمد — شمسی مشین پریس، کلکتہ (۱۹۱۹ء)

ہفت آسمان، آغا احمد علی — بیپٹسٹ مشن پریس کلکتہ (۱۸۷۳ء)

یادگارِ غالب، حالی (مرتبہ مالک رام) — لبرٹی آرٹ پریس، دلی (۱۹۷۱ء)

تاریخ مدرسۂ عالیہ، مولانا عبدالستّار ینگ پریس، ڈھاکہ (۱۹۵۹ء)

— History of Persia : Sir Percy Sykes,
Macmillan, London, 1951

— Rambles and Recollections of an Indian Official :
Lt. Col. Sir W.H. Sleeman,
Oxford University Press 1915

— The Indian Criminal : H.A. Adam,
John Milne, London. 1909

— Twilight of the Mughals : Percival Spear
Cambridge University Press. 1951

موقت الشیوع رسائل

آج کل، دہلی

اردو: دلّی، کراچی

اردو ادب، علی گڑھ

اکمل الاخبار، دہلی

الہلال، کلکتہ

اورینٹل کالج میگزین، لاہور

تحریر (سہ ماہی)، دلّی

دہلی اردو اخبار، دہلی

زمانہ، کان پور

سلطان الاخبار، کلکتہ

صادق الاخبار، دہلی

صحیفہ، لاہور

علی گڑھ میگزین، علی گڑھ

فاران، کراچی

نگار: لکھنؤ، رام پور

نوائے ادب، بمبئی

معارف، اعظم گڑھ

ہندستانی، الٰہ آباد

جامِ جہاں نما، کلکتہ

اشاریہ

(اس کے ساتھ فہرستِ مضامین کو بھی مدِ نظر رکھیے)

کسی ہندسے کے نیچے خط کا مطلب یہ ہے کہ یہ نام اس صفحے پر ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے۔

آ

الف

غ

ف

ن

و

ہ

ی

نئی اور اہم مطبوعات

کتاب		مصنف	قیمت
رموزِ غالب		ڈاکٹر گیان چند	۱۸/۵۰
میر انیس سے تعارف		صالحہ عابد حسین	۴/-
اقبال اور مغربی مفکرین		جگن ناتھ آزاد	۱۰/۵۰
جدید اردو ادب		ڈاکٹر محمد حسن	۱۵/-
فکر و ریاض		علی جواد زیدی	۱۲/-
کچھ نثر میں بھی		آنند نرائن ملّا	۱۶/-
بازگشت		کبیر احمد جائسی	۱۱/-
عربوں میں تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقا		محمود الحسن	۱۵/-
مشاہیر کے خطوط	مرتبہ:	عبداللطیف اعظمی	۱۲/۵۰
اردو کیسے لکھیں		رشید حسن خاں	۴/-
نیا اردو نصاب (اول)	مرتبہ:	محمد ذاکر	۳/-
نیا اردو نصاب (دوم)	مرتبہ:	قیصر زیدی، محمد ذاکر	۳/-
پچھلے پہر		جاں نثار اختر	۷/-
بیاضِ مریم		سکندر علی وجد	۱۲/-
مسالک و منازل		ضیاء احمد بدایونی	۲۲/-
مغلیہ ہندوستان میں زرعی تعلقات		سید نور الحسن	۴/-
سماجی تبدیلیاں ازمنۂ وسطیٰ کے ہندوستان میں		رام شرن شرما	۲/-
قدیم دلی کالج		مالک رام	۴/۵۰
انتخابِ حالی	مرتبہ:	سفارش حسین رضوی	۶/۵۰
یادوں کے سائے		عتیق صدیقی	۱۸/-
تلاشِ میر		نثار احمد فاروقی	۱۱/-
ہوا کے دوش پر		غلام ربانی تاباں	۵/۵۰
جدید ترکی ادب کے ارکانِ ثلاثہ		ضیاء الحسن فاروقی	۴/-
مذہب اور جدید ذہن		ڈاکٹر مشیر الحق	۷/۵۰
غالب اور شاہانِ تیموریہ		ڈاکٹر خلیق انجم	۹/۵۰
نگارشات		پروفیسر محمد مجیب	۱۶/-
جانے والوں کی یاد آتی ہے		صالحہ عابد حسین	۱۸/-
مسرت سے بصیرت تک		آل احمد سرور	۱۲/۵۰
وہ صورتیں الٰہی		مالک رام	۱۰/-
دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر		مہر محمد خاں شہاب مالیرکوٹلوی	۴/-
نظر اور نظریے		آل احمد سرور	۱۲/۵۰
ہمارے ذاکر صاحب		رشید احمد صدیقی	۹/-
طنزیات و مضحکات		رشید احمد صدیقی	۱۰/۵۰

برقی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، دہلی ۶